قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2025 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

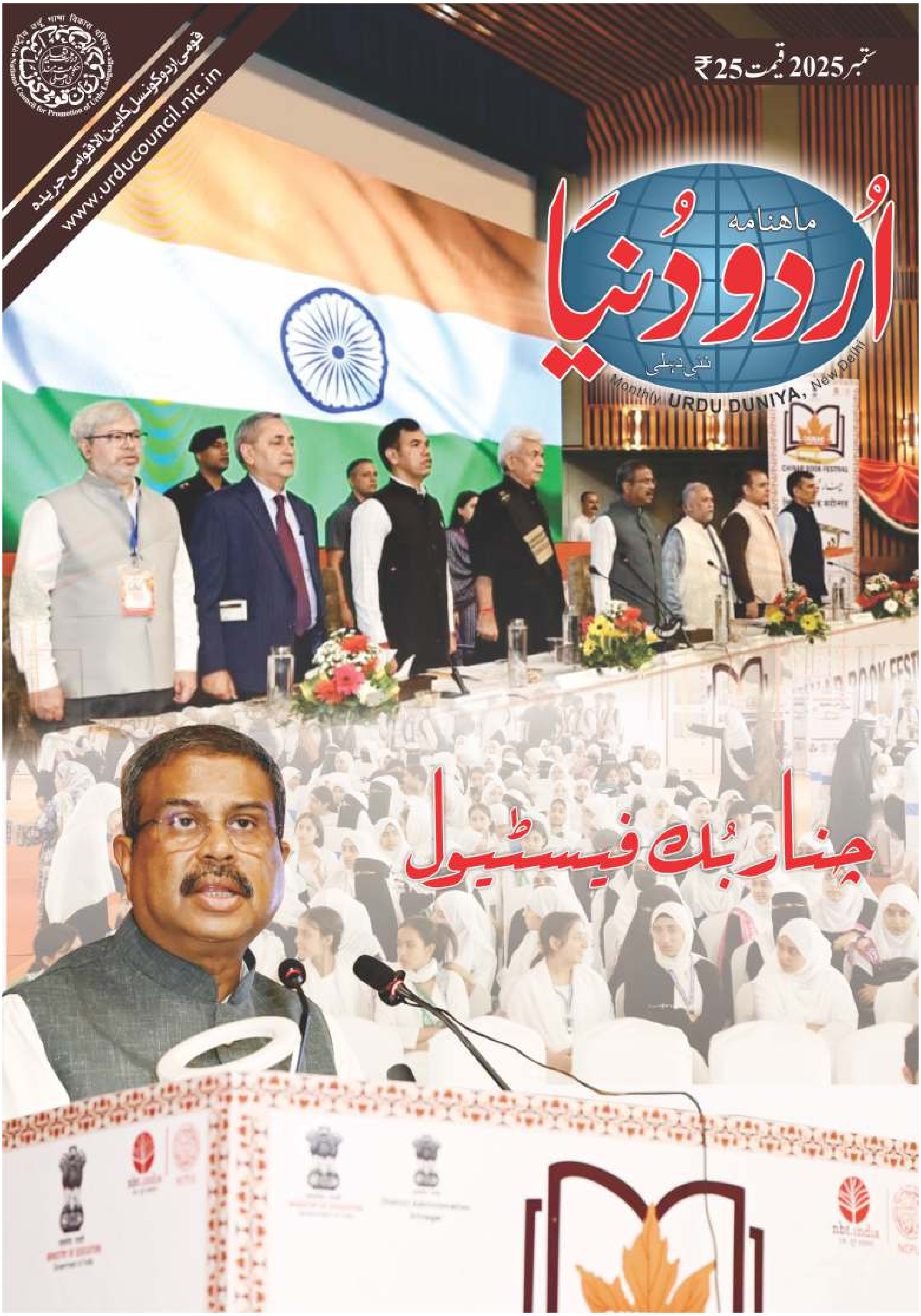

چنار بک فیسٹیول

چنار بُک فیسٹیول کی تصویری جھلکیاں

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:9، ستمبر 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : شاداب شمیم، فیضان الحق

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

سالاسار امیجنگ سسٹمس

A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

- چنار بک فیسٹیول — شاداب شمیم 7

وکست بھارت

- وکست بھارت: وژن اور مشن — عارفہ بشریٰ 21

زبان و تعلیم

- زبان کی اقسام — معین الدین 23
- قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 کے اہم نکات — آفاق ندیم خان 26

ادب: زاویے اور جہات

- غالب اور فریاد کی لَے — محمد ذاکر حسین 30

- اردو افسانے کے بدلتے رجحانات — محمد محمود عالم 34
- کلاسیکی اور جدید غزل میں اقدار کی معنوی تبدیلی — عرفان علی بشر 37
- امراؤ جان ادا اور مشترکہ تہذیبی عناصر — ساجد ذکی فہمی 40

تاریخ

- طبقۂ اولیٰ ملوک فارس — مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی، مرتب: محمد صہیب 44

جہانِ کتب

- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سفر سو برسوں کا — اسعد فیصل فاروقی 47

یاد رفتگاں

- انیس رفیع اور اس کے بعد کا اجالا — ظہیر انور 52
- آہ! انیس رفیع — محمد حامد علی خاں 55
- راشد طراز کی شعری کائنات — سلیم انصاری 57

مہ و انجم

- محمد انصار اللہ کی ادبی خدمات — صبا نسیم 59
- پروفیسر انور ظہیر انصاری کا ادبی سفر — محمد زبیر 62

لسانیات

- لسانیات کے فوائد — ڈیوڈ کرسٹل، مترجم: نصیر احمد خاں 65

طب

- قدیم تہذیبوں میں طبی اخلاقیات کا تصور — حکیم فخر عالم 69

صحافت

- تصویری صحافت حقیقت کی خاموش زبان — عبدالرزاق 71

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ 74

خبرنامہ

- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 87

ہماری بات

کشمیر کی وادی ہمیشہ سے علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں کے برف پوش پہاڑ، جھرنے، ڈل جھیل اور چنار کے سنہرے پتے نہ صرف فطرت کی خوبصورتی کی علامت ہیں بلکہ فکری حُسن اور تخلیقی روشنی کے بھی گواہ ہیں۔ کشمیر صرف اپنی قدرتی خوبصورتی کے لیے ہی دنیا بھر میں مشہور نہیں ہے بلکہ علمی روایت اور تخلیقی فضا کی وجہ سے بھی اس کا ایک اہم مقام ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں صدیوں سے صوفیا کے کلام اور شاعری کی خوشبو گھلے ملے ہیں۔ اردو، فارسی، کشمیری، ہندی اور سنسکرت بولنے اور سمجھنے والے لوگ یہاں ہمیشہ رہے ہیں۔ ادب و ثقافت کا فروغ اور تحفظ کشمیر کی ایک قدیم روایت رہی ہے۔ یہاں اکثر علمی، ادبی اور ثقافتی تقریبات ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے علمی اور ادبی ماحول میں چنار بک فیسٹیول 2025 کا دوسرا ایڈیشن صرف ایک کتاب میلہ نہیں بلکہ لٹریری اور کلچرل ڈسکورس کا ایک اہم مرکز و محور بھی ہے۔

قومی اردو کونسل اور نیشنل بک ٹرسٹ کے اشتراک سے اس چنار کتاب میلے کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں متنوع موضوعات پر مذاکرے، مشاعرے، کتابوں کی رونمائی، نئی نسل میں ادبی و تخلیقی مہارتوں کی نشو و نما کے لیے سہ روزہ تربیتی ورکشاپ اور کونسل کے ذریعہ قائم کردہ کمپیوٹر سنٹر کے اساتذہ کے لیے فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگرام جیسی اہم تقریبات منعقد ہوئیں۔ تصوف کی معنویت، مذہب و ثقافت اور جدیدیت، مصنفین سے ملاقات، ادبی جمالیات میں کشمیر کا حصہ، ڈیجیٹل دنیا میں کتاب کلچر کا فروغ، کشمیر کی صوفیانہ روایت، اردو پر سنسکرت، فارسی اور کشمیری کے اثرات، اردو اور فارسی ادب میں صنفی مساوات کی وکالت، اردو میں ای پبلشنگ وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر ماہرین نے اپنے خیالات پیش کیے۔ ان علمی و ادبی مذاکروں نے سامعین کو خاص طور پر متاثر کیا۔ ماہرین کے خیالات اپنے موضوعات پر نہایت گراں قدر ہیں اور ان سے کئی اہم نکات پر روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی اس سے فکر و احساس کی نئی دنیا آباد ہوتی نظر آتی ہے۔

2025 کا بک فیسٹیول اپنی وسعت، تنوع اور رنگا رنگی کے سبب ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، اس فیسٹیول میں ملک کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے ادبا، محققین، ناقدین، شعرا، مترجمین، اسکالرز جمع ہوئے، ان حضرات کی موجودگی نے فیسٹیول کو یادگار اور کامیاب بنادیا۔

چنار بک فیسٹیول 2025 میں ملک بھر سے آئے ہوئے تقریباً دو سو ناشرین اور پبلشرز نے شرکت کی۔ ادب، تاریخ، سوانح، ترجمہ، بچوں کا ادب اور جدید موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کو قارئین کی خاص توجہ حاصل رہی۔ اس بار خاص طور پر نوجوان نسل کی شرکت نمایاں رہی۔ ورکشاپس اور پینل ڈسکشن وغیرہ کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ نوجوان صرف سامع نہ رہیں بلکہ وہ اس پروگرام میں فعال شریک بنیں۔ اس فیسٹیول کا مقصد کتاب اور قاری کے درمیان رشتے کو مضبوط کرنا اور زبان و ثقافت کو فروغ دینا تھا۔

چنار بک فیسٹیول 2025 میں شائقین و ناظرین کی تعداد نے یہ پیغام دیا کہ کتاب آج بھی ہمارے ذہنی، فکری تحرک کا بنیادی حوالہ ہے اور ہمارے خوابوں اور بہتر سماج کی تشکیل کے سارے سلسلے کتابوں ہی سے جڑے ہیں۔ کشمیر کے قارئین اور خاص طور پر اسکولی طلبہ و طالبات جس ذوق و شوق سے اس چنار کتاب میلے میں شریک ہوئے اور اپنے ادبی اور علمی ذوق کا ثبوت دیا وہ اس بات پر دال ہے کہ وادی کشمیر میں اردو ادب و ثقافت کے تئیں غیر معمولی جوش اور جذبہ پایا جاتا ہے۔

شمس اقبال

ربط و التفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نہیں ہوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ھے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ھے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ھے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اهمیت کے حامل ہوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (اداره)

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی وادبی مرقع تو ہے ہی، تاہم خاص موقعے پر اس رسالے کی شکل وصورت نہایت ہی دیدہ زیب ہوتی ہے۔ اگست 2025 کا شمارہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سرورق کا باہری واندرونی صفحہ یوم آزادی اور عالمی یوم یوگ کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ مزید گورنر بہار جناب عارف محمد خان کے ساتھ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر شمس اقبال صاحب کی گفتگو و ملاقات کا منظر خوب ہے۔

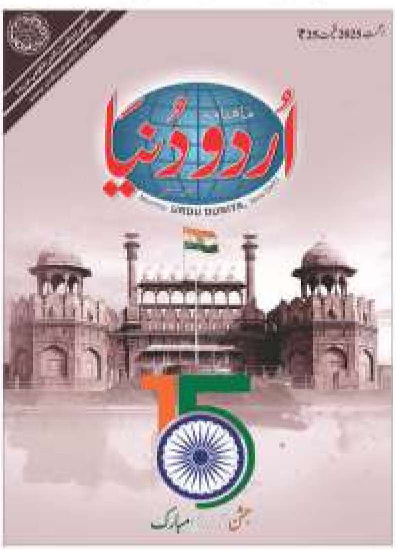

مشمولات کی بات کی جائے تو تمام گوشہ ہائے علم و ادب کو مس کرتی ہوئی تحریریں تشنگیِ ادب وعلم کو قدرے سیراب کرتی ہیں۔ طریقۂ تدریس پر مشتاق احمد کا مضمون 'تصوراتی خاکہ سازی' ایک فنی نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ 'جدید شاعری اور فرد' کے موضوع پر وحید اختر کا مضمون ماخوذ از 'کلیات مضامین وحید اختر' چشم کشا ہے جو جدید شاعری کے نکات اور فرد کی نفسیات سے واقف کراتا ہے۔ رئیس انور کا مضمون 'ادبی حقائق کی ترتیب و تدوین کا مسئلہ' کی تحریر سے جامعاتی طلبا مستفید ہوسکتے ہیں۔ ہم ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے تدوین کے مسائل سے روبرو ہونے کا موقع ہے کہ عرصۂ تدوین میں قدم رکھنے والے کو کس ریاضت ودماغ سوزی کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

'یادِ رفتگاں' نفسیات، اصناف ادب، فنونِ لطیفہ، عالمی ادب، تراجم، شخصیات، اقلیم سخن، صحافت، تبصرے اور خبرنامہ کے ذیل میں آنے والے تمام مضامین نہایت وقیع ہیں جو بحیثیت مجموعی تمام ادبی جہات کو محیط ہیں، جن سے خاطر خواہ روشنی کا دریچہ وا ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اس طرح ہم عالمی ادب وادیب سے آشنا ہوتے ہیں۔ عالمی ادبی فضا ونفسیات سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہمیں اردو دنیا کا ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ہر شمارہ ایک نئی روشنی لاتا ہے۔ بسا اوقات قدیم وجدید ادب کا سنگم کی حیثیت رکھنے والا شمارہ تجدید و رفتگاں کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور ہمارے عظیم تخلیق کاروں وان کی تحریروں سے ملاقات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

فردوس بانو فلاحی: گلمرگ اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ماہنامہ 'اردوو دنیا' جولائی 2025 کا شمارہ موسم بہار کی تمام تر سرسبز وشاداب رعنائیوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا، سرورق دیدہ زیب اور پرمغز ہے۔ اداریہ قابل داد ہے کہ کچھ اس انداز سے علاقائی ادب کی توضیح وتشریح کی گئی ہے کہ معلومات کے تراجم کا اور لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں کا ایک دلکش جزیرہ سا ادب کے بحرِ ذخار میں ابھر آیا ہے۔ اس شمارے کے تمام تر موضوعات جدید ذہنی افکار کا عکس ہیں جن میں منطقی دلیلوں کے ساتھ موضوعات کا حق ادا کیا گیا ہے، ورنہ تو ادب کے اس سمندر سے سیپیاں چن لانا کارِ مشکل ہے۔ دلی مبارکباد کہ آپ ہر ماہ جدید تر افکار اور دلکش اسلوب نگارش سے آراستہ مضامین سے اردو دنیا کا قد دیگر اردو رسالوں سے اونچا کر رہے ہیں!

رضوانہ پروین ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی جمشید پور، جھارکھنڈ

ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی 25 شمارے کے تقریباً سبھی مضامین معلومات سے بھرپور اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ مضامین میں طبع انسانی اور آغازِ تعلیم، تقابلی ادب کے اساسی تصورات اور پریم چند کی افسانہ نگاری، خاص طور پر پسند آئے۔ اس شمارے میں واثق الخیر کا ایک 'مضمون قمر جہاں کے افسانوں میں عورت کا متنوع کردار'، (ص 33) ریاست بہار کی مشہور افسانہ نگار مرحومہ قمر جہاں صاحبہ کو ایک بہترین خراج عقیدت ہے، البتہ اس مضمون کے ساتھ جو تصویر شائع کی گئی ہے اس کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ان کی تصویر نہیں ہے بلکہ ان کی ہم نام ناگپور (مہاراشٹر) کی مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر قمر جہاں کی ہے۔

نام کی یکسانیت کے سبب شاید یہ مغالطہ ہوا ہے۔ اسی بہانے سے چند باتیں ناگپور کی اس ادیبہ کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر قمر جہاں مہاراشٹر کے شہر ناگپور کی ایک مشہور افسانہ نگار تھیں، ان کے شریکِ حیات ڈاکٹر عباس علی بھی ان ہی کی طرح ناگپور کی اہم ادبی شخصیات میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ اولڈ مارس کالج میں صدر شعبۂ عربی تھے۔ ڈاکٹر قمر جہاں، ایل اے ڈی گرلز ڈگری کالج، ناگپور میں صدر شعبہ اردو اور فارسی تھیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'دھوپ چھاؤں' (2005) اور 'زندگی تیرے لیے' (2012) شائع ہوئے تھے وہ 25 دسمبر 2013 میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔

ڈاکٹر قمر جہاں کے افسانوں میں آس پاس بکھری زندگی کی تصویریں نمایاں ہیں۔ ان کے کردار مٹی کی مہک لیے ہوئے ہیں۔ سماجی مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں میں فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول قاضی مشتاق مصنفہ کی کہانیاں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک ایسی افسانہ نگار سانسیں لے رہی ہے جو معاشرہ کی برائیوں سے بے حد مضطرب ہے اور معاشرے کو بدلنے کی خواہش مند ہے۔ انھوں نے سماج سے جڑے ہوئے انسانوں کے مسائل کو بڑی ایمانداری کے ساتھ اپنی کہانیوں میں ڈھالا ہے۔ (پیش لفظ، دھوپ چھاؤں)۔

آپ کے اداریے میں علاقائی ادب کے تعارف اور اس پر تحقیقی کام کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ قابلِ غور اور قابلِ تحسین ہیں۔ ہمارے اکثر فنکار مناسب توجہ اور تعارف مہیا نہ ہونے کے سبب گمنامی کے اندھیرے میں کھو جاتے ہیں۔ یہ بے توجہی علاقائی ادب کی ترویج و بقا کے لیے بہت نقصاندہ ہے۔

محمد اسد اللہ: 30 گلستان کالونی، نزد پانڈے لے آؤٹ، ناگپور، مہاراشٹر، موبائل: 9579591149

ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی 2025 کا شمارہ نظر نواز ہوا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ یہ نہ صرف قومی کونسل کا معتبر اور باوقار رسالہ ہے بلکہ ملک بھر میں اسے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور قارئین اس کی اشاعت کے پہلے سے ہی منتظر رہتے ہیں کہ جلد از جلد شمارہ ان کے ہاتھوں میں آئے انھیں اس سے مستفید ہونے کا موقع ملے۔ گزشتہ شماروں کی مانند یہ شمارہ بھی علمی، ادبی اور تنقیدی زاویے سے ہماری فکر و نظر کو وسعت بخشنے والا ہے۔ زبان و تعلیم سے متعلق ڈی ایس گورڈن کا مضمون 'طبع انسانی اور آغازِ تعلیم' بہت ہی عمدہ مضمون ہے جس کا ترجمہ خلیل الرحمٰن سیفی پریمی نے کیا ہے۔ اس میں مضمون نگار نے 'تعلیم کیا ہے؟' کے ذیلی عنوان کے تحت ایک اہم سوال قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے رسمی اور غیر رسمی تعلیم کا بھی جائزہ لیا ہے۔ احمد حسین

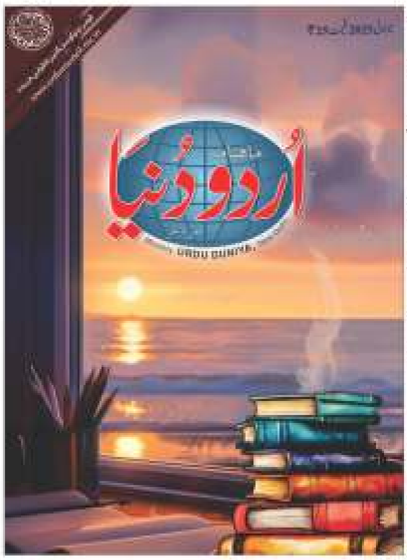

صاحب کا مضمون 'دورِ جدید کے آئینے میں اساتذہ کا کردار' بھی شاندار مضمون ہے۔ عصر حاضر میں جس قدر تعلیم کی جانب توجہ دی جاری ہے اسے دیکھتے ہوئے اساتذہ کا کردار بہت اہم ہو جاتا ہے۔ اساتذہ کا کردار نہ صرف بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے تک محدود ہے بلکہ ایک ذمہ دار شہری بنانا اور بہتر معاشرے کی تشکیل کرنا بھی ان کی ذمہ داری میں شامل ہے جسے قطعاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مضمون میں وہ لکھتے ہیں: ''تعلیمی ترقی میں اساتذہ کا کردار کسی بھی معاشرے کی بنیاد اور اس کی کامیابی کا اہم ذریعہ ہے۔ اساتذہ وہ ستون ہیں جو طلبہ کی علمی، فکری اور عملی نشوونما میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ جدید دور میں تعلیمی ترقی کا مطلب صرف نصاب کی تدریس نہیں بلکہ طلبہ میں نقد و تحلیق کی صلاحیتوں اور مسائل کو حل کرنے کی اہلیت بھی پیدا کرنا ہے۔''

تقابلی ادب کا رجحان ہر دن بڑھتا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد نیازی صاحب کا مضمون 'تقابلی ادب کے اساسی تصورات' اس شمارے کی قدر و منزلت میں اضافہ کرتا ہے جس میں انھوں نے علمی، تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے موضوع پر بحث کی ہے۔ تقابلی مطالعے کے توسط سے عالمی ادب کے مابین ربط پیدا ہوتا ہے۔ محمد یونس ڈار نے جدید اردو غزل میں تنہائی کے درد و کرب کا جائزہ مختلف شاعروں کے حوالے سے لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: 'میکانکی سماج اور مشینی معاشرے کی پیداوار سے انسان کی زندگی جہاں آسائش اور سہولت سے بسر ہونے لگی اور زندگی کے معیار، غور و فکر کے اسلوب اور تخیل کی وسعت میں تبدیلی واقع ہوئی، وہیں وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو کر وجودی ہو گیا۔ وہ اپنی فکر کو افادی پہلو کے مدنظر رکھنے لگا جس سے اس کے اندر لالچ کا مادہ بڑھ گیا۔' اردو غزل میں ہر قسم کے موضوعات کو جگہ دی جاتی رہی ہے چاہے وہ سماجی ہوں، معاشی ہوں یا سائنسی۔ انجینئر محمد عادل نے اپنے مضمون 'اردو غزل میں بٹر فلائی افکیٹ' میں ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو شاعری پر بٹر فلائی افکیٹ کا کس قدر اثر ہے۔ ادب زاویے اور جہات، یادِ رفتگاں، جہانِ دانش، تاریخ، شخصیات، سلسلہ صحافت، معاشیات، سائنس، نیا آسمان نئے ستارے کے بھی مضامین اپنے اپنے طور پر اہم اور معلوماتی ہیں لہٰذا 'اردو دنیا' کے مدیر اور بھی اسٹاف قابل مبارکباد ہیں جو اس موقر رسالے کی اشاعت میں تن من سے لگے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے جس سے اردو قارئین کے علم و فکر میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔

مفتی محمد صادق: ناظم مدرسہ ضیاء الاسلام، محلہ ٹنڈولہ ٹانڈہ بادلی ضلع رامپور، یوپی

شاداب شمیم

چنار بُک فیسٹیول

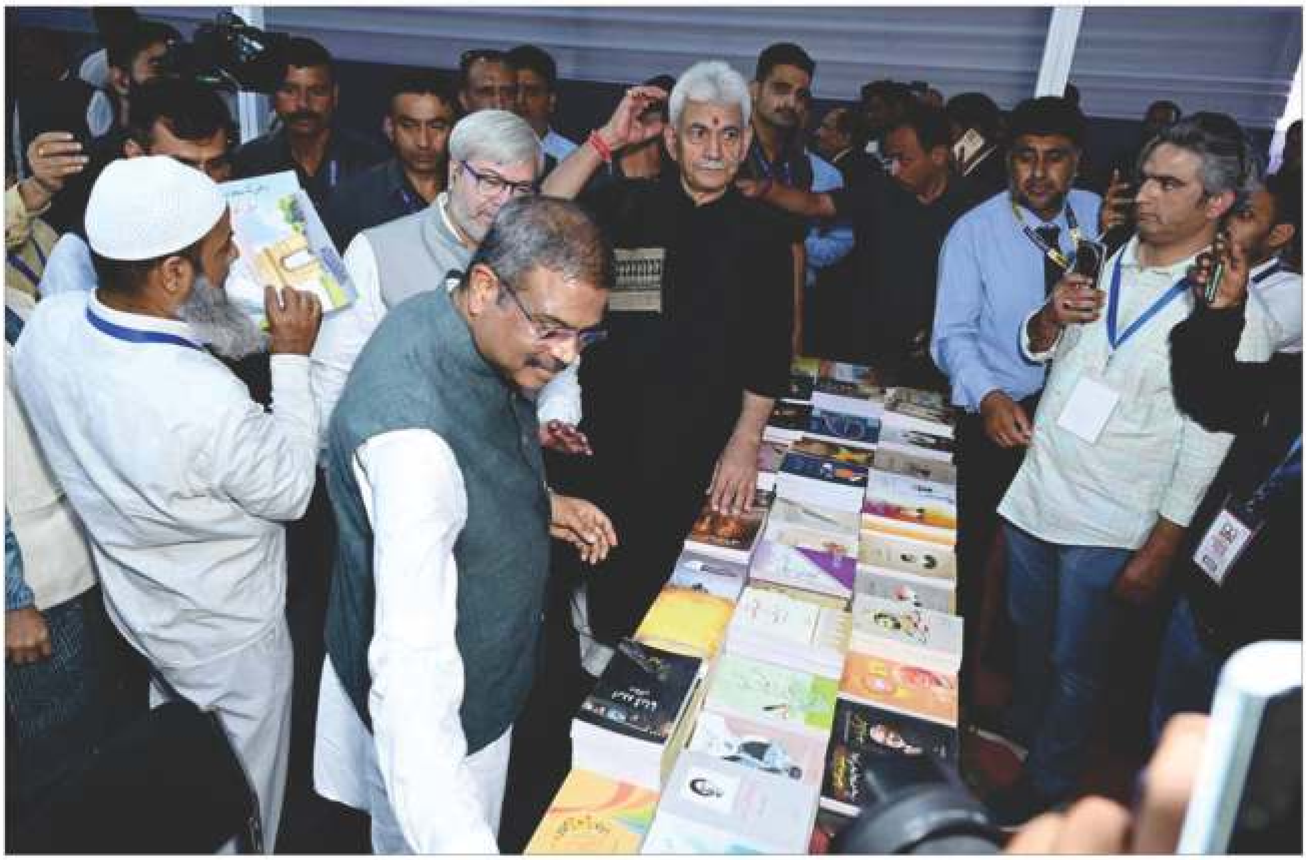

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو دنیا میں علمی و ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور مطالعہ کے کلچر کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کیاہے ۔اس مقصد سے کونسل کے ذریعے ہر سال ملک کے مختلف شہروں میں کتاب میلے کا انعقاد کیا جاتاہے ۔اس سال 2 اگست سے 10 اگست تک سرینگر میں منعقد ہونے والا چنار بک فیسٹیول اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے یادگار اور تاریخ ساز تھا۔اس بک فیسٹیول میں قومی اردو کونسل سمیت ہندوستان بھر سے اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی، کشمیری، گوجری وغیرہ کے تقریباً دو سو پبلشرز نے شرکت کی اور کمرشیلی بھی یہ بک فیسٹیول نہایت کامیاب رہا ۔ یہ بک فیسٹیول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے اشتراک سے منعقد ہوا تھااور چنار بک فیسٹیول کا یہ دوسرا ایڈیشن تھا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے اشتراک سے سری نگر کے ایس کے آئی سی سی میں 'چنار بک فیسٹیول' کے دوسرے ایڈیشن کا 2 تا 10 اگست 2025 کو انعقاد عمل میں آیا۔ چنار بک فیسٹیول 2025 میں جہاں اردو سمیت مختلف زبانوں کی کتابوں کی ریکارڈ فروخت ہوئی وہیں مختلف ادبی موضوعات پر مذاکرے، مشاعرے اور ثقافتی پروگرام، بچوں کی ادبی و تخلیقی نشوونما کے لیے سہ روزہ تربیتی ورکشاپ، ساتھ ہی قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام چلنے والے کمپیوٹر سینٹرز کے اساتذہ کے لیے سہ روزہ فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کا بھی انعقاد کیا گیا۔ان پروگراموں میں سامعین وناظرین کی کثیر تعداد شریک ہوئی۔ کشمیر سمیت ملک کے مختلف حصوں سے ادبا، محققین وناقدین وغیرہ کی موجودگی نے بھی اس فیسٹیول کو یادگار بنادیا۔ خاص طور پر اسکولی طلبہ وطالبات نے جس ذوق وشوق سے اس فیسٹیول میں شرکت کی اور اس کے مختلف پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس سے اندازہ ہوا کہ خطۂ جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے تئیں خصوصاً نئی نسل میں غیر معمولی جذبہ وجنون پایا جاتا ہے اور اس خطے میں اردو زبان کا مستقبل نہایت روشن وتابناک ہے۔

پریس کانفرنس

میلے سے ایک دن قبل یکم اگست کو ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس سے این بی ٹی کے ڈائرکٹر جناب یوراج ملک، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال، چنار بک فیسٹیول کے چیف کنوینر ڈاکٹر امت وانچو اور محکمۂ اطلاعات ونشریات، جموں وکشمیر کے ڈائرکٹر جناب نتیش رجوریا نے خطاب کیا اور کہا کہ یہ ایک تاریخ ساز بک فیسٹیول ہے جو خطۂ جموں وکشمیر میں علمی، ادبی و ثقافتی بیداری کی لہر پیدا کرے گا۔ انھوں نے اس کتاب میلے میں ملک بھر کے اہم پبلشرز کی شمولیت کے ساتھ ساتھ اس دوران منعقد ہونے والے رنگارنگ ادبی وثقافتی پروگراموں کی تفصیلات پر بھی روشنی ڈالی۔

افتتاحی پروگرام (2 اگست 2025)

2 اگست کو ایس کے آئی سی سی سرینگر کے آڈیٹوریم میں اس بک فیسٹیول کا افتتاح عمل میں آیا۔ میلے کا افتتاح وزیر تعلیم حکومت ہند عزت مآب جناب دھرمیندر پردھان، لیفٹیننٹ گورنر آف کشمیر جناب منوج سنہا، ڈیویژنل کمشنر آف کشمیر وجے کمار ودھوری اور آئی سی ایچ آر کے چیئرمین پروفیسر رگھویندر تنور اور دیگر اہم شخصیات کے ذریعے ہوا۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزیر تعلیم دھرمیندر پردھان نے کہا کہ آج کی تقریب میں جس جوش وخروش کے ساتھ کشمیری عوام خاص طور پر نوجوان شریک ہوئے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے کشمیر کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری تہذیب اور یہاں کے ساہتیہ کو بڑھاوا دینے کی ضرورت ہے تاکہ دوسری جگہوں کے لوگ بھی یہاں کی تہذیب وثقافت سے خاطر خواہ واقف ہوسکیں۔ وزیر تعلیم نے نئی تعلیمی پالیسی (NEP2020) کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مادری زبان اور علاقائی ادب کو فروغ دینا حکومت کی ترجیحات میں شامل ہے۔ نوجوانوں کو خاص طور پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ٹیکنالوجی گرچہ ہمارے لیے مفید ہے لیکن اس کا استعمال ضرورت کے مطابق ہی کرنا چاہیے اور نوجوانوں کو کتب بینی اور مطالعہ کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے اس لیے کہ مطالعہ نہ صرف علم میں اضافے کا باعث ہوتا ہے بلکہ شخصیت سازی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کشمیر کے لیفٹیننٹ گورنر منوج سنہا نے اپنے خطاب میں وادی کشمیر کی قدیم تہذیب، علمی ورثے اور ادبی روایات کو اجاگر کیا، انھوں نے کہا کہ کشمیر صدیوں سے علم وادب اور تصوف وثقافت کا مرکز رہا ہے اور آج بھی یہاں کے دانشور اور مصنفین اپنی تخلیقات سے دنیا میں روشنی پھیلا رہے ہیں۔ انھوں نے کشمیر میں بک فیسٹیول کے انعقاد کو خوش آئند قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے ادبی میلوں کے ذریعے نوجوانوں میں مطالعے کا ذوق پیدا کیا جاسکتا ہے۔ نئی نسل اس دوران منعقد ہونے والے مختلف قسم کے ثقافتی پروگراموں میں شریک ہوکر اپنی ادبی، سماجی اور ثقافتی معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ آئی سی ایچ آر کے چیئرمین پروفیسر رگھویندر تنور نے کہا کہ کشمیر کی علمی روایت، زبان وادب، فلسفے اور سماجی

علوم کی زرخیز تاریخ رہی ہے اور یہاں کے دانشوروں نے ہمیشہ تحقیق وتخلیق کے میدان میں قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔انھوں نے چنار بک فیسٹیول کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ جلد ہی یہ فیسٹیول بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت قائم کرلے گا۔این بی ٹی کے چیئر مین پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ چنار بک فیسٹیول صرف کتابوں کی فراہمی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں مختلف النوع ثقافتی پروگرامز بھی شامل ہیں جو شرکا کے لیے علم،تخلیق اور تفریح کا حسین امتزاج پیش کریں گے۔انھوں نے مزید کہا کہ نیشنل بک ٹرسٹ کا مقصد کتابوں کے ذریعے قومی یکجہتی،فکری بیداری اور تخلیقی شعور کو فروغ دینا ہے اور چنار بک فیسٹیول اسی مشن کا ایک اہم حصہ ہے۔شکریے کی رسم ادا کرتے ہوئے این بی ٹی کے ڈائرکٹر یوراج ملک نے کہا کہ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ ہم مسلسل دوسری بار اس علمی وادبی فیسٹیول کا اہتمام کررہے ہیں۔انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہر آدمی پڑھے اور ہر ہاتھ میں کتاب ہو۔یہی ہمارا خواب ہے اور اسی مشن کے تحت ہم لوگ کام کر رہے ہیں۔ اس افتتاحی تقریب میں مہمانان کے ہاتھوں کتاب 'جموں کشمیر اور لداخ' کے کشمیری ایڈیشن کا اجرا بھی عمل میں آیا۔اس کتاب میں کشمیر کی تاریخ کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

قومی کونسل کے زیر اہتمام سہ روزہ سی اے پی اے ایم ڈی ٹی پی فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگرام (جموں کشمیر، لداخ، ہماچل پردیش اور پنجاب) کا بھی 2 اگست کو آغاز ہوا۔اس پروگرام میں استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جب ہم فیکلٹی ممبران کے ساتھ بیٹھ رہے ہیں یہ ہمارے لیے بڑی خوشی کا لمحہ ہے۔انھوں نے فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام اساتذہ کی پیشہ ورانہ مہارت میں اضافہ کرتے ہیں اور انھیں جدید تدریسی تکنیکوں سے روشناس کراتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کی تعلیم صرف فنی شعبے تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ ہر میدان میں کامیابی کی کنجی بن چکی ہے۔ان کے علاوہ سچن چاندلا (جوائنٹ ڈائرکٹر، نائیلٹ، چنڈی گڑھ)، ڈاکٹر مشتاق احمد لون (رکن گورننگ کونسل ممبر، این سی پی یو ایل) اور پروفیسر عارفہ بشری (رکن گورننگ کونسل، این سی پی یو ایل) نے بھی متعلقہ موضوع پر اہم گفتگو کی۔اس پروگرام کی نظامت نصرت جہاں (آر اے، این سی یو ایل) کی اور شکریے کی رسم اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، این سی پی یو ایل) نے ادا کی۔

افتتاحی تقریب کے بعد آتھر کارنر میں خسرو فاؤنڈیشن اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک مذاکرہ بعنوان 'تصوف کی معنویت (امیر خسرو سے شیخ العالم تک)' منعقد ہوا، جس کی نظامت ڈاکٹر حفیظ الرحمن نے کی اور پروفیسر اقبال حسنین (سابق وائس چانسلر کالیکٹ یونیورسٹی)، پروفیسر جی این خاکی (ڈائرکٹر انٹرنیشنل

سینٹر فار اسپریچول اسٹڈیز) اور جناب شانتو مکھرجی (ڈائرکٹر خسرو فاؤنڈیشن) نے موضوع سے متعلق بڑی اہم گفتگو کی اور اس بات پر زور دیا کہ آج کے دور میں صوفیانہ افکار کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ نفرت اور عدم برداشت کا مقابلہ کیا جاسکے۔اس مذاکرے میں 'عقیدے کی دراریں' از پروفیسر اقبال حسنین کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

دوسرا دن (3 اگست 2025)

فیسٹیول کے دوسرے دن خسرو فاؤنڈیشن نئی دہلی کے زیراہتمام ایک مذاکرہ بعنوان 'مذہب، ثقافت اور جدیدیت' منعقد ہوا۔ مذاکرے میں پروفیسر جاوید احمد ڈار (شعبہ پولیٹیکل سائنس، کشمیر یونیورسٹی) نے مذہب، ثقافت اور جدیدیت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ جدیدیت کو اپنانے کا مطلب اپنی مذہبی یا ثقافتی اقدار سے دستبرداری نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے اصل چیلنج یہ ہے کہ ہم ان اقدار کو جدید تقاضوں سے کیسے ہم آہنگ کرسکتے ہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں جدیدیت کو سمجھنے کے لیے مغربی کلچر کے حدود سے باہر نکل کر سوچنا ہوگا کیونکہ حقیقی ماڈرنزم صرف سطحی تبدیلیوں سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے فکری و عملی سطح پر گہری تبدیلیاں درکار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر پشکر مشرا (ڈائرکٹر رضا لائبریری، رام پور) نے مذہبی اور ثقافتی اقدار کو عصری تناظر میں سمجھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جدید دور میں ہمیں اپنی روایات واقدار کا ازسرنو جائزہ لینا چاہیے تاکہ ہم ایک ترقی یافتہ معاشرہ تشکیل دے سکیں اور اس ترقی میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی شمولیت اور ان کی بااختیاری کو بھی یقینی بنانا ضروری ہے۔ نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (کنوینر خسرو فاؤنڈیشن) نے موضوع کا تعارف پیش کیا اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت پر اظہار خیال کیا۔اس پروگرام میں دو کتابوں 'تلواروں کے سائے میں' (مصنف، ایم جے اکبر، مترجم جلیس اختر نصیری) اور 'اسلام، آمریت اور پسماندگی' (مصنف، احمد کورو، مترجم سبزار احمد) کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

تیسرا (4 اگست 2025)

بک فیسٹیول کے تیسرے دن آتھر کارنر میں دو پروگرام 'میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات' قومی اردو کونسل کے زیراہتمام اور 'ادبی جمالیات میں کشمیر کا حصہ' قومی اردو کونسل اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے منعقد ہوئے۔ میرا تخلیقی سفر پروگرام میں ممتاز شاعرہ وادیبہ ڈاکٹر نصرت مہدی (ڈائرکٹر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی) اور نامور نقاد اور فکشن نگار پرفیسر غضنفر نے شرکت کی اور اپنے تخلیقی تجربات سے سامعین کو روشناس کیا۔ پروفیسر غضنفر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہر زمانے کے کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں اور ہر ادیب وشاعر پر لازم ہے کہ وہ ادب تخلیق کرتے وقت اس وقت کے تقاضوں اور ضروریات کو ضرور مدنظر رکھے۔ انھوں نے نوجوانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ ادب ریاضت مانگتا ہے، محنت اور مشقت چاہتا ہے اس لیے جلد بازی سے بچتے ہوئے اپنے تخلیقی سفر میں ریاضت کا عمل جاری رکھیں اور مقصدیت کو مدنظر رکھتے ہوئے زبان واسلوب

کے ساتھ ساتھ مواد پر بھی محنت کریں جبھی آپ ایک اچھے ادیب بن سکتے ہیں اور آپ کی تحریر میں گہرائی کے ساتھ ساتھ گیرائی بھی آئے گی۔ ڈاکٹر نصرت مہدی نے اپنے طویل ادبی سفر کے مختلف مراحل کو سلسلے وار طریقے سے بیان کیا اور کہا کہ مشاہدہ، ذاتی تجربہ اور مطالعہ یہ تینوں چیزیں کسی بھی اچھی تخلیق کے لیے لازم اور ضروری ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جمالیاتی شعور ایک ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے ادیب ایک عام سی چیز کو بھی فنی پیرائے میں پیش کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور کسی بھی صنف میں نمایاں تخلیق پیش کرسکتا ہے۔ اپنی انتظامی ذمے داریوں کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ سے بعض اوقات تخلیقی خیالات ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور پھر کافی غور کرنے کے بعد بھی وہ ذہن میں نہیں آتے لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ ہم نئے اور غیر معروف شعرا اور ادبا کو تلاش کرپاتے ہیں اور ان کی تخلیقات سے قارئین کو روبرو کراتے ہیں۔ اس پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے سید محمد تحسین منور نے کی موضوع کا جامع تعارف پیش کیا۔

دوسرا پروگرام 'ادبی جمالیات میں کشمیر کا حصہ' کے عنوان سے تھا۔ اس میں ڈاکٹر ستیش ول (ممتاز ادیب، شاعر و مترجم)، پروفیسر ستیہ بھاما رازدان (سابق صدر شعبہ سنسکرت ولسانیات، کشمیر یونیورسٹی) اور ڈاکٹر عرفان عارف (صدر شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج، ریاسی جموں) نے کشمیر کی ادبی روایت، جمالیاتی اقدار اور اردو ادب میں جمالیاتی تنقید پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ستیش ول نے کشمیری شاعری کی روایات اور اس میں موجود جمالیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کئی اہم نکات کا ذکر کیا اور صوفی شاعروں کا بطور خاص حوالہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر کا استعمال اردو ادب میں ایک استعارہ کے طور پر ہوتا ہے، شاعروں اور ادیبوں نے یہاں کی فطرت، صوفیانہ روایت اور یہاں کی تہذیب کو اپنی تخلیقات میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے ادبی جمالیات کے مفہوم کو نہ صرف واضح کیا بلکہ اس میں کشمیری تہذیب، ثقافت اور روحانیت کے رنگوں کی آمیزش کو بھی مدلل انداز میں اجاگر کیا۔ پروفیسر ستیہ بھاما رازدان نے کہا کہ ادبی جمالیات فلسفہ کی ہی ایک شاخ ہے۔ انھوں نے رس کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے سنسکرت کی روایت کو کشمیری روایت سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، ان کے مطابق ریتی سدھانت میں جمالیات کی جو باریکی پائی جاتی ہے وہی کشمیری ادب میں بھی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عرفان عارف نے ادبی جمالیات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم تمام اصناف کے فنی اور دیگر لوازمات پر غور کرنے کے بعد ہی جمالیات کا تعین کرسکتے ہیں، فن میں خوبیاں تلاش کرنے کا نام ہی اصل میں جمالیات ہے۔ اس پروگرام کی نظامت سلیم سالک نے کی۔

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام سہ روزہ سی اے بی اے ایم ڈی ٹی پی فیکلٹی ڈیولپمنٹ پروگرام (جموں وکشمیر، لداخ، ہماچل پردیش اور پنجاب) کا اختتامی پروگرام ایس کے آئی سی سی کے آڈیٹوریم میں ہوا۔ اس میں

ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک، این سی پی یو ایل) سونیا رانی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، نائلٹ)، سچن چاندلا (جوائنٹ ڈائرکٹر، نائلٹ) اور اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر، این سی پی یو ایل) وغیرہ نے خطاب کیا اور فیکلٹی حضرات سے کہا کہ آپ لوگوں نے جو کچھ سیکھا ہے اسے بچوں کو ضرور سکھائیں تاکہ وہ مستقبل میں کچھ بہتر کر سکیں۔ اس پروگرام کی نظامت نصرت جہاں (آر اے، این سی پی یو ایل) نے کی۔

چوتھا دن (5 اگست 2025)

چنار بک فیسٹیول کے چوتھے دن قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'ڈیجیٹل دنیا میں کتاب کلچر کا فروغ' اور قومی اردو کونسل و شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے 'کشمیر کی صوفیانہ روایت' کے عنوان سے مذاکرے ہوئے۔ ڈیجیٹل دنیا میں کتاب کلچر کا فروغ میں پروفیسر شافع قدوائی (ممتاز اردو و انگریزی اسکالر) اور پروفیسر محمد مبین (وائس چانسلر کلسٹر یونیورسٹی) نے شرکت کی، پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ کتاب کی حیثیت ایک استاد کی ہے جو ہمیں نہ صرف علم عطا کرتی ہے بلکہ سوچنے، غور کرنے اور سوال کرنے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب پڑھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر بار ایک نیا تجربہ، نئی سوچ اور نیا مفہوم پیدا ہوتا ہے، کاغذ کی خوشبو، ورق پلٹنے کی آواز اور ذہنی یکسوئی جو ایک کتاب پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ ای بک میں ناپید ہے لیکن موجودہ وقت میں ڈیجیٹل دنیا اور ای کتاب کی بھی اپنی اہمیت ہے کہ اسے کہیں بھی چلتے پھرتے، سفر کرتے اور کسی بھی وقت پڑھا جا سکتا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا فوکس پڑھنے پر ہو نہ کہ کسی اور غیر ضروری چیزوں پر۔ پروفیسر محمد مبین نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مطالعہ کے بغیر علم میں نہ گہرائی آسکتی ہے اور نہ ہی گیرائی، آج کل طلبہ محنت و مشقت کے بجائے اے آئی کا زیادہ استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا بہت نقصان ہو رہا ہے اس سے بچنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ جو چیزیں بغیر محنت کے آتی ہیں ان کی افادیت کی مدت کم ہوتی ہے، اس لیے مطالعے کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنانا چاہیے۔ انھوں نے طلبہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ دیگر اچھی اور معیاری کتابوں کا بھی مطالعہ کریں تاکہ آپ کے علم میں وسعت پیدا ہو اور آپ مختلف موضوعات پر بہتر انداز میں سوچ سکیں۔ اس مذاکرے کی نظامت پروفیسر سیدہ افشانہ (نوڈل آفیسر سی پی سی ایس، کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔

دوسرا پروگرام 'کشمیر کی صوفیانہ روایت' کے عنوان سے ہوا جس میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر (ڈاکٹر) بشیر بشر (سابق ڈائرکٹر مرکز نور، کشمیر یونیورسٹی) نے صوفی ازم اور کشمیر کی صوفیانہ روایت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ کشمیر میں رشی روایت اور صوفی روایت بہت قدیم ہے۔ انھوں نے شیخ العالم، لل دید اور دیگر صوفیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان ہستیوں نے کشمیری سماج کو روحانی بصیرت، اخلاقی تعلیم وغیرہ کا جو درس دیا تھا وہ آج بھی قابل تقلید اور لائق عمل ہے۔ ڈاکٹر غلام نبی حلیم (معروف شاعر و مترجم) نے کہا کہ

کشمیر کی روح میں تصوف بسا ہوا ہے اور کشمیری صوفی ازم کا ایک ہی مقصد ہے، وہ ہے بھائی چارہ، یکسانیت اور انسان کو ایک دوسرے کے دکھ درد، خوشی اور غم میں شریک ہونا۔ انھوں نے کہا کہ صوفیانہ وراثت کو برقرار رکھنا اور اس کی تعلیمات کو نئی نسل تک پہنچانا ہماری ذمے داری ہے۔ اس مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر سجاد حسین وانی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ لسانیات، کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔ ان مذاکروں میں کثیر تعداد میں سامعین شریک ہوئے۔

پانچواں دن (6 اگست 2025)

بک فیسٹیول کے پانچویں دن قومی اردو کونسل اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے دو اہم ادبی مذاکرے 'ثقافتی مکالمہ: اردو تراجم کی روشنی میں' اور 'لسانی روابط: اردو پر سنسکرت، فارسی اور کشمیری کے اثرات' کے عنوان سے آٹھر کارنر میں منعقد ہوئے جبکہ ایک اور مذاکرہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور خسرو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 'اردو اور فارسی ادب میں صنفی مساوات کی وکالت' کے عنوان سے ہوا۔ 'ثقافتی مکالمہ: اردو تراجم کی روشنی میں' میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر محمد زماں آزردہ (سابق صدر شعبہ اردو و ڈین اسکول آف آرٹس، لینگویجز و لٹریچر، کشمیر یونیورسٹی) نے ترجمے کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ترجمے میں بنیادی طور پر دو زبانیں شامل ہوتی ہیں اور ہر زبان اپنے ساتھ ایک مخصوص ثقافت، اسلوب اور طرز فکر لے کر آتی ہے، اس لیے کسی بھی ترجمے کے دوران صرف لفظی ترجمہ کافی نہیں بلکہ اس لفظ کے پس منظر کو سمجھنا اور جاننا ضروری ہوتا ہے جس سے یہ لفظ وجود میں آیا ہے، تبھی ترجمہ بہتر اور اچھا ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ علمی نثر کا ترجمہ ادبی نثر کے مقابلے میں آسان ہوتا ہے اس لیے کہ علمی نثر میں عام طور پر تکنیکی اصطلاحات کا چیلنج درپیش ہوتا ہے مگر ادبی ترجمہ ایک پیچیدہ عمل ہے کہ اس میں صرف ایک زبان سے دوسری زبان میں مواد کو ہی منتقل نہیں کیا جاتا بلکہ ایک زبان کی تہذیب و ثقافت بھی دوسری زبان میں منتقل کی جاتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شاد رمضان (سابق صدر شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی) نے کہا کہ ہر زبان کا ایک محاوراتی نظام ہوتا ہے، اگر مترجم اس سے واقف نہ ہو تو وہ کبھی بھی موثر اور بامعنی ترجمہ نہیں کرسکتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کشمیر میں ترجمے کی روایت بہت پرانی ہے، کشمیری زبان میں لکھی گئی کتابوں اور تحریروں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں صدیوں سے ہوتا آرہا ہے، یہ تراجم نہ صرف علم و ادب کے تبادلے کا ذریعہ بنے بلکہ انھوں نے مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے درمیان پل کا کام بھی کیا ہے۔ پروفیسر شمس کمال انجم (ڈین و صدر، اسکول آف اسلامک اسٹڈیز، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی) نے گفتگو کرتے ہوئے عربی زبان سے اردو میں جو تراجم ہوئے ہیں ان پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ امرؤ القیس اور متنبی وغیرہ کا ترجمہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوا ہے جس کی وجہ سے عربی زبان کی خوب صورتی اور اس کے ادب سے دنیا بھر کے لوگ واقف ہوئے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ترجمے کا عمل نہ ہوتا اور مترجم نہ ہوتے تو ہم بہت سی علمی، فکری اور

ادبی چیزوں سے ناواقف رہ جاتے۔ اس مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر محمد الطاف آہنگر (ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن، کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔

دوسرا مذاکرہ 'لسانی روابط: اردو پر سنسکرت، فارسی اور کشمیری کے اثرات' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد ملک (سابق صدر شعبہ اردو وڈین اسکول آف آرٹس، لینگو یجز و لٹریچر، کشمیر یونیورسٹی) نے کہا کہ جب کسی علاقے یا خطے میں دو یا دو سے زائد زبانیں ایک دوسرے کے ربط میں آتی ہیں تو ان کے الفاظ، اسلوب وغیرہ میں لازمی طور پر تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان پر بہت سی زبانوں کے اثرات ہیں لیکن سنسکرت اور فارسی کے اثرات زیادہ ہیں۔ پروفیسر اعجاز محمد شیخ (ماہر لسانیات وصدر شعبہ اردو وڈین اسکول آف آرٹس، لینگویجز ولٹریچر، کشمیر یونیورسٹی) نے کہا کہ اردو زبان پر دیگر زبانوں کے علاوہ کشمیری زبان کے اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، کشمیری زبان کے مخصوص الفاظ اور لہجے وغیرہ اردو کی بول چال اور ادب میں شامل ہو چکے ہیں اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ کشمیر کے لوگ اردو بولتے، لکھتے، پڑھتے ہیں اور یہاں کے اخباروں کی زبان بھی اردو ہی ہے۔ ڈاکٹر جہانگیر اقبال (صدر شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی) نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو برصغیر کی صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب وثقافت ہے اور کشمیر میں اردو کا مستقبل روشن اور درخشندہ ہے اس لیے کہ تقریباً ہر گھر میں بچے کشمیری کے بجائے اردو بولتے ہیں۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر صائمہ جان نے کی۔

تیسرا مذاکرہ بعنوان 'اردو اور فارسی ادب میں صنفی مساوات کی وکالت' تھا۔ اس مذاکرے میں ڈاکٹر سید مبین زہرا (ایسوی ایٹ پروفیسر، دہلی یونیورسٹی) اور معروف ادیبہ وشاعرہ نسرین حمزہ علی نے موضوع سے متعلق اہم گفتگو کی اور کہا کہ اردو اور فارسی ادب میں خواتین کے مسائل، حقوق اور مساوات کے حوالے سے اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ نے کھل کر اپنی بات رکھی ہے اور مساوات، صنفی تفریق اور سماجی رویوں پر کھل کر لکھا ہے۔ اس مذاکرے کی نظامت جناب نذیر گنائی نے کی۔ مذاکرے کے آخر میں نسرین حمزہ کی کتاب 'راکھ میں دبی چنگاری' اور طہٰ نسیم کی کتاب 'ترنگا آنچل' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمن (کنوینر، خسرو فاؤنڈیشن) نے شکریے کی رسم ادا کی۔ ان پروگراموں میں طلبہ، اساتذہ اور اردو زبان وادب سے محبت رکھنے والوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

چھٹا دن (7 اگست 2025)

چنار بک فیسٹیول 2025 کے چھٹے دن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے سہ روزہ تربیتی ورکشاپ بعنوان 'نئی نسل میں ادبی وتخلیقی مہارتوں کی نشوونما' کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس موقعے پر استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ قومی اردو کونسل کی اولین ترجیحات میں شامل ہے کہ نئی نسل کو وہ تمام مواقع فراہم کیے جائیں جن کے ذریعے وہ اپنے خوابوں کو تعبیر عطا کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ اس

رپورٹ

ورکشاپ کا مقصد نوجوانوں میں چھپی ہوئی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنا اور انھیں ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا ہے جہاں وہ اپنی صلاحیتوں اور خیالات کا آزادانہ اظہار کرسکیں۔ ہم نے اس موقعے پر یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ کہنہ مشق تخلیق کار نوجوانوں سے براہ راست بات کریں اور انھیں صیقل کریں تاکہ نئے لکھنے والے بہتر طریقے سے اپنی تخلیقات پیش کرسکیں۔ ڈائرکٹر قومی کونسل نے کہا کہ کشمیر میں مجھے اردو زبان کا مستقبل روشن نظر آرہا ہے، یہاں کے طلبہ جس ذوق وشوق اور سنجیدگی سے اردو زبان پڑھ اور سیکھ رہے ہیں وہ نہایت خوش آئند اور قابل تحسین ہے۔ تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر اعجاز محمد شیخ (صدر شعبہ اردو وڈین اسکول آف آرٹس کشمیر یونیورسٹی) نے تخلیق، تخیل اور فکشن کے باہمی رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کسی بھی ادبی تحریر کو موثر بنانے کے لیے تخیل کی بلند پروازی بہت ضروری ہے، ان کی گفتگو کا محور تخلیق اور تخلیقیت تھا، انھوں نے کہانی کے ارتقائی سفر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کہانی کہنے اور سننے کی جو روایت ہماری تہذیب کا حصہ رہی ہے اسے نئی نسل تک پہنچانا ازحد ضروری ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سید درخشاں اندرابی (چیئرپرسن جموں اینڈ کشمیر وقف بورڈ) نے کہا کہ ایسے ورکشاپس اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ناگزیر ہیں اور اس طرح کے پروگرام مسلسل ہونے چاہئیں تبھی نئی نسل اردو زبان سے قریب ہوگی اور نئے لکھنے والے پیدا ہوں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج کی نوجوان نسل خوش قسمت ہے کہ اسے ایسا سازگار ماحول مل رہا ہے جس میں وہ اپنے تخلیقی جوہر اور پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھار سکتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے اساتذہ اور تخلیق کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، انھیں قبول کریں اور ان کی رہنمائی کریں اس لیے کہ یہی لوگ مستقبل میں بہتر قلمکار بن کر ابھریں گے اور اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کریں گے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے جناب فیاض دلبر (مشہور آرٹسٹ، شاعر اور فکشن نگار) نے اس ورکشاپس کی افادیت اور اہمیت پر گفتگو کی اور کہا کہ اس قسم کے ورکشاپس میں شرکا صرف سامع یا ناظر نہیں ہوتے بلکہ وہ خود اس عمل کا حصہ ہوتے ہیں، اس میں مکالمہ، مشق اور تخلیق کا براہ راست تجربہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی وہ تخلیق میں حصہ لیتے ہیں، سیکھتے ہیں، سوال کرتے ہیں اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو نئی سمت دیتے ہیں۔ نظامت ڈاکٹر نصرت نبی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج، گاندربل) اور شکریے کی رسم ڈاکٹر کوثر رسول (اسسٹنٹ پروفیسر، کشمیر یونیورسٹی) نے ادا کیے۔ افتتاحی پروگرام کے بعد اس ورکشاپ کے دو سیشن بھی ہوئے۔ پہلے سیشن میں مشہور ناقد وفکشن نگار پروفیسر غضنفر نے شرکا سے کہانی لکھنے کے طریقے اور تخلیقیت کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں ان پر تفصیلی گفتگو کی، اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر فلک فیروز (اسسٹنٹ پروفیسر، جی ڈی سی) نے کی۔ دوسرے سیشن میں ڈاکٹر ریاض توحیدی نے فکشن کی باریکیوں کے سلسلے میں گفتگو کی اور کہا کہ مشق اور محنت سے ہی آپ ایک اچھے تخلیق کار بن سکتے

ہیں۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر شاہ فیصل نے کی۔

قومی اردو کونسل اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے دو مذاکرے بھی ہوئے۔ پہلا مذاکرہ 'جدید تکنیکی وسائل اور اردو صحافت: امکانات اور چیلنجز' کے عنوان سے تھا۔ اس مذاکرے میں ڈاکٹر طارق عبداللہ (پروڈیوسر، ایجوکیشنل ملٹی میڈیا، ریسرچ سینٹر، کے یو)، ڈاکٹر راشد مقبول (میڈیا ٹریز واسسٹنٹ پروفیسر ملٹی میڈیا ریسرچ سینٹر) اور ڈاکٹر روبیلا حسن (ڈین وایسوی ایٹ پروفیسر، شعبہ صحافت، اسلامک یونیورسٹی) نے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر طارق عبداللہ نے کہا کہ جب تک اردو زبان انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ منسلک رہے گی اس کی معنویت اور افادیت میں کمی واقع نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر راشد مقبول نے جدید ٹیکنالوجی کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ ٹیکنالوجی نے اردو صحافت کے منظرنامے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کشمیر میں اردو اخبارات کے لے آؤٹ، فونٹس اور طباعتی معیار کے حوالے سے کئی نئے تجربات کیے گئے ہیں جو قابل تحسین ہیں۔

ڈاکٹر روبیلا حسن نے کہا کہ جدید تکنیکی وسائل نے خبر رسانی کو فوری اور موثر بنا دیا ہے۔ انھوں نے اے آئی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی ترویج و ترقی میں اے آئی کلیدی رول ادا کرسکتی ہے۔ نظامت ڈاکٹر ناظم نذیر (ایڈیٹر، روزنامہ تعمیل ارشاد، سرینگر) نے کی۔ دوسرا مذاکرہ 'کشمیر میں لسانی تنوع اور ادبی تخلیق' کے عنوان سے تھا۔ اس میں پروفیسر شفیق شفیع شوق (سابق صدر شعبہ کشمیری وسابق ڈین اسکول آف آرٹس، لینگویجز ولٹریچر، کشمیر یونیورسٹی) اور پروفیسر نذیر آزاد (مشہور اسکالر وتنقید نگار) نے اظہار خیال کیا۔ مذاکرے میں گفتگو کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ کشمیر محض جغرافیائی اور قدرتی لحاظ سے ثروت مند خطہ نہیں ہے، بلکہ لسانی سطح پر بھی ایک ہم آہنگ اور تاریخی ورثے کا حامل خطہ ہے۔ زبان کے قومی منظرنامے میں بھی کشمیری زبان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جو محض ابلاغ کا ذریعہ نہیں بلکہ تخلیقی اظہار کی ایک زرخیز زمین بھی ہے۔ مذاکرے میں اس بات پر زور دیا گیا کہ کشمیری زبان کو جدید تکنیکی وسائل سے بھی ہم آہنگ کیا جانا چاہیے تاکہ اس کی رسائی نسل نو تک بآسانی ہو اور اس میں تخلیقی امکانات کو بروئے کار لایا جاسکے۔ اس مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر مشتاق احمد وانی (سابق فیکلٹی ممبر شعبہ اردو، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی) نے کی۔

ساتواں دن (8 اگست 2025)

چنار بک فیسٹیول کے ساتویں دن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے دو مذاکرے 'نئی تعلیمی پالیسی 2020 میں لسانی تنوع: اردو اور کشمیری میں امکانات' اور 'اردو ادب اور ثقافتی مکالمے میں کشمیری خواتین' کے عنوان سے منعقد ہوئے۔ پہلے مذاکرے میں پروفیسر شریف الدین پیرزادہ (سابق صدر شعبہ ریاضیات و ڈین اکیڈمک افیئرز، کشمیر یونیورسٹی)، پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد صدیقی (چیف کوآرڈینیٹر، این ای پی، کشمیر یونیورسٹی) اور ماجد زماں (کنٹرولر آف اگزامنیشن، کشمیر یونیورسٹی)

نے گفتگو کرتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی کے تناظر میں علاقائی اور مادری زبانوں کی تدریس، ان کے فروغ اور مستقبل کے امکانات و مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروفیسر شریف الدین پیرزادہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی 2020 ملک کے تعلیمی ڈھانچے میں ایک ٹرانسفارمیشن یعنی ہمہ گیر تبدیلی کا پیش خیمہ ہے اگر اس کو طلبہ نے صحیح طریقے سے فالو کرلیا تو یقیناً کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس پالیسی میں مادری اور علاقائی زبانوں کو ابتدائی تعلیم کا ذریعہ بنانے کا فیصلہ ایک مثبت قدم ہے جو اردو اور کشمیری زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں اردو اور کشمیری زبانوں کے لیے بے پناہ امکانات موجود ہیں۔ پروفیسر مشتاق احمد صدیقی نے کہا کہ نئی تعلیمی پالیسی کا خاطر خواہ نتیجہ اسی وقت نکل سکتا ہے جب اسے اسکولس، کالجز اور یونیورسٹیز میں مکمل طور پر نافذ کیا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس پالیسی میں جس طرح کی تجاویز پیش کی گئی ہیں اگر انھیں عملی طور پر اپنایا گیا تو ہمارے تعلیمی معیار میں یقیناً بہتری آئے گی۔ ماجد زماں نے کہا کہ نیو ایجوکیشن پالیسی میں کثیر لسانی تعلیم اور مادری زبان میں ابتدائی تعلیم پر زور دینا ایک اہم قدم ہے، کیوں کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے نہ صرف یہ کہ پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کی رفتار بڑھتی ہے بلکہ اس سے ثقافتی ورثہ بھی محفوظ رہتا ہے۔ اس مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر مشتاق حیدر (استاد شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔

آج کا دوسرا مذاکرہ 'اردو ادب اور ثقافتی مکالمے میں کشمیری خواتین' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ اس میں اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ایاز رسول نازکی (سابق رجسٹرار، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری) نے کہا کہ کشمیر کی ادبی روایت میں روحانیت کی نمائندہ لل دید اور رومانیت کی نمائندہ حبہ خاتون کی مثالیں دونوں سمتوں کی تخلیقی جہات کو واضح کرتی ہیں، بعد میں رخسانہ جبیں اور دیگر شاعرات نے اس روایت کو جاری رکھا تاہم درمیان میں ایک طویل خلا نظر آتا ہے۔ محترمہ رخسانہ جبیں (سابق ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو، سرینگر) نے کہا کہ عابدہ احمد اور شملہ مفتی نے نسائی ادب کو بنیاد فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کشمیری خواتین کے ادب میں موضوعات کا ایک متنوع سلسلہ ملتا ہے تاہم سماجی جبر اور معاشرتی رویے خواتین کو پوری طرح ابھرنے سے روکتے ہیں۔ ڈاکٹر نگہت سعید قریشی (ممتاز شاعرہ و فکشن نگار) نے کہا کہ شاعری کا تعلق فوری اور جذباتی اظہار سے ہے اس لیے کشمیر میں زیادہ تر خواتین شاعری کی طرف مائل رہی ہیں۔ انھوں نے نسائیت اور تانیثیت کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ نسائیت ایک سماجی اور نو ثقافتی تصور ہے جبکہ تانیثیت ایک فکری و سماجی تحریک ہے۔ اس مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر کوثر رسول (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔

قومی اردو کونسل اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے جاری سہ روزہ تربیتی ورکشاپ بعنوان 'نئی نسل میں ادبی و تخلیقی مہارتوں کی نشوونما' کے تین

سیشنز بہت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئے۔ پہلے سیشن کا عنوان 'کہانی میں مکالمہ اور توضیحی عناصر' تھا، اس کی اسپیکر ڈاکٹر کوثر رسول (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی) تھیں، انھوں نے منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کے حوالے سے بڑی اہم گفتگو کی۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر اویس احمد بھٹ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی) نے۔ دوسرے سیشن کا عنوان 'کہانی کی ساخت اور راختتام: اپنا بیانیہ کیسے تشکیل دیں' تھا۔ اس کے اسپیکر جناب شکیل الرحمٰن (مشہور شاعر، ناقد) تھے۔ انھوں نے کہانی کی ساخت اور اختتام کے حوالے سے بڑی مفید گفتگو کی۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر اقبال لون (اسسٹنٹ ایڈیٹر، شیرازہ، کلچرل اکیڈمی، جموں وکشمیر) نے کی۔ کا تیسرا اور آخری سیشن 'تخلیقی تحریر کی رہنمائی: آپ کہانی کیسے لکھیں' تھا۔ اس سیشن کے میڈیور مشہور فکشن نگار جناب دیپک بدکی، مشہور شاعر وفکشن نگار جناب مشتاق مہدی اور معروف ادیب وڈراما نویس جناب غلام نبی شاہد تھے۔ ان حضرات نے کہانی کیسے وجود میں آتی ہے اور تخلیقی تحریر کی کیا کیا خصوصیات ہیں ان پر گفتگو کی۔ اس سیشن کی نظامت نوجوان شاعر و فکشن نگار ڈاکٹر محمد یوسف وانی نے کی۔ ورکشاپ کے ان سیشنز میں شرکا نے دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اخیر میں اسپیکر و میڈیور حضرات سے سوالات بھی کیے جن کا مقررین نے تسلی بخش جواب دیا۔

آٹھواں دن (9 اگست 2025)

9 اگست کو سہ روزہ تربیتی ورکشاپ بعنوان 'نئی نسل میں ادبی وتخلیقی مہارتوں کی نشوونما' کا اختتام عمل میں آیا۔ اس اختتامی سیشن میں استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ اس ورکشاپ کا مقصد نوجوانوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنا اور ان کے تخلیقی سفر کو پرواز عطا کرنا تھا۔ انھوں نے نوجوانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں اس پر اعتماد کے ساتھ عمل کیجیے کیونکہ آپ کی سوچ اور آپ کا نقطۂ نظر تازہ اور بہتر ہے۔ انھوں نے شرکا سے کہا کہ آپ میں بے پناہ پوٹینشل موجود ہے اور آپ کے درمیان سے ہی کل بڑے لکھنے والے کہانی کار اور تخلیق کار پیدا ہوں گے۔ مہمان خصوصی پروفیسر محمد مبین (وائس چانسلر، کلسٹر یونیورسٹی) نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اچھی تخلیق کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے جب تک آپ اچھے قاری نہیں بنیں گے تب تک آپ اچھے تخلیق کار اور کہانی نویس نہیں بن سکتے۔ انھوں نے کہا کہ مطالعہ نہ صرف زبان وبیان میں مہارت پیدا کرتا ہے بلکہ تخیل کو بھی جلا بخشتا ہے اور نئے خیالات کو بھی جنم دیتا ہے۔ مہمان اعزازی وحشی سعید (ممتاز فکشن نگار و ناقد) کا تحریر کردہ پیغام سلیم سالک (نوجوان ادیب اور ایڈیٹر، کلچرل اکیڈمی، جموں وکشمیر) نے پیش کیا۔ انھوں نے پیغام میں اس ورکشاپ کی تعریف کی اور کہا کہ اس طرح کا ورکشاپ مسلسل ہونا چاہیے تاکہ نوجوانوں کو سیکھنے اور آگے بڑھنے کے مواقع ملتے رہیں۔ ڈاکٹر کوثر رسول (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس ورکشاپ میں شرکا نے بڑے

ذوق وشوق سے سیشنز میں حصہ لیا اور کہنہ مشق فکشن رائٹرز سے بھرپور استفادہ کیا۔ مجھے پوری امید ہے کہ نوجوان نے جو کچھ سیکھا ہے اس کی روشنی میں وہ اچھی اور بہترین کہانیاں لکھیں گے۔ اظہار تشکر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر، اکیڈمک، این سی پی یو ایل) اور نظامت ڈاکٹر راشد مقبول (اسسٹنٹ پروفیسر، میڈیا ایجوکیشن ریسرچ سینٹر، کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔

اختتامی اجلاس سے قبل ورکشاپ کی تین نشستیں ہوئیں۔ پہلی نشست 'اسٹوری سرکلز' میں شرکا کے ذریعے کہانیوں کی گروپ پیشکش ہوئی۔ اس سیشن میں میئورس ڈاکٹر نذیر مشتاق (مشہور کہانی کار و میڈیکل ڈاکٹر، ممتاز انگریزی فکشن نگار) ڈاکٹر مشتاق برق، مشہور فکشن نگار و ادیب جناب راجا یوسف اور معروف کہانی کار جناب ناصر ضمیر شریک ہوئے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر محمد ذاکر (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔ دوسرا سیشن 'افسانے کی بیانیہ تکنیک اور ادبی اسالیب: تخلیقی اظہار، ساخت اور اسلوب نگارش کی عملی رہنمائی' کے حوالے سے ہوا۔ اس سیشن کے اسپیکرس ڈاکٹر مشتاق حیدر (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی) اور پروفیسر منیجا خان (صدر شعبہ انگریزی، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر) تھے۔ نظامت کے فرائض سلیم سالک نے انجام دیے۔

تیسرا سیشن 'معاصر اردو فکشن نگاری میں نوجوان تخلیق کاروں کا کردار' کے عنوان سے تھا۔ اس کے پینلسٹس مشہور ادیب ڈاکٹر عیاش عارف، ڈاکٹر نذیر مشتاق (مشہور کہانی کار و میڈیکل ڈاکٹر) اور مشہور ادیب و ناقد جناب شوکت شفیع تھے۔ مذکورہ سیشن کی نظامت مشہور ادیب و اسکالر جناب راشد عزیز نے کی۔

قومی اردو کونسل اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے آتھر کارنر میں ایک مذاکرہ 'اردو میں ای پبلشنگ' کے عنوان سے بھی منعقد ہوا۔ اس مذاکرے میں ڈاکٹر اعجاز اشرف (ریجنل ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، سرینگر)، جناب جاوید ماٹجی (معروف صحافی و جنرل سکریٹری جموں و کشمیر اردو کونسل) اور ڈاکٹر ادریس احمد (ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی) نے اظہار خیال کرتے ہوئے اردو زبان میں ای پبلشنگ کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور اس کے مثبت و منفی اثرات اور اچھے اور برے پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اعجاز اشرف نے کہا کہ ای بک کی حیثیت محض فرسٹ ایڈ کی ہے، ان کے مطابق جو لطف اور احساس کتاب کی ورق گردانی میں ہے وہ ای بک سے حاصل نہیں ہوسکتا اس لیے مطالعے کے لیے کتب خانوں کا رخ کریں اور دل لگا کر مطالعہ کریں۔ جناب جاوید ماٹجی نے کہا کہ اگر تلاش کے باوجود مطلوبہ کتاب یا مواد دستیاب نہ ہو تبھی آپ ای بک کی طرف رجوع کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ٹیکنالوجی کی سہولت کا فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ کتب بینی کی عادت کو زندہ رکھنا از حد ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلیں کتاب سے اپنا تعلق برقرار رکھ سکیں۔ ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنا ضروری ہے اور ضرورت کے مطابق ای بک کا استعمال ضرور کرنا چاہیے لیکن لائبریریوں کا رخ

کرنا اور کتاب کا مطالعہ کرنا نہ صرف ذہنی ارتقا کا باعث بنتا ہے بلکہ تحقیق اور مطالعے کی گہرائی کو بھی بڑھاتا ہے۔ نظامت ڈاکٹر فیضان الحق (پروجیکٹ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل) نے کی۔

نواں دن (10 اگست 2025)

چنار بک فیسٹیول 2025 کے آخری دن قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس میں وادی کشمیر کے نمایندہ شعرا نے خوبصورت کلام پیش کیے۔ مشاعرے میں غزل و نظم کے ذریعے انسانی اقدار، سماجی مسائل اور فطری مناظر کے موضوعات کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت کشمیر کے مشہور شاعر رفیق راز نے کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشاعرے میں شریک تمام شعرا نے عمدہ اور معیاری کلام پیش کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایسے مشاعرے اور ادبی اجتماعات نہ صرف یہ کہ شعر و ادب کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ اہل ذوق کو باہمی میل جول اور اظہار خیال کے مواقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ نو دنوں تک جاری رہنے والا ادبی و ثقافتی میلہ کامیابی کے ساتھ آج اختتام کو پہنچا۔ انھوں نے کہا کہ جس معیار کے ڈسکورس اور ڈائلاگ کی مجھے امید تھی اسکالرز نے اس سے بڑھ کر علمی، ادبی اور فکری گفتگو کی جس سے سامعین کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے کہا کہ اس فیسٹیول میں نوجوانوں نے جس ذوق و شوق اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا وہ قابل تعریف ہے اور اس کو کامیاب بنانے میں ان کا اہم کردار ہے۔ مشاعرے کی نظامت پرویز مانوس نے کی۔ مشاعرے میں پیش کیے گئے شعرا کے اشعار درج ذیل ہیں:

قطرۂ اشک ہے دوزخ کو بجھا سکتا ہے
ایسی طاقت ہے کہاں اور کسی پانی میں

(رفیق راز)

عشق تھا آخری امید مگر
عشق کر کے بھی کیا ملا ہے مجھے

(شفق سوپوری)

میں زندگی کا زخم ہوں
جب بھی کریدو نظم جنتی ہوں

(شبنم عشائی)

محبت ہم پس دیوار کرتے ہیں
مگر نفرت سربازار کرتے ہیں

(اشرف عادل)

وہ اکثر خواب میں آ کر مرے ہمراہ چلتا ہے
مجھے اب نیند میں چلنے کی بیماری نہ ہو جائے

(شبینہ آرا)

زندگی یہ قید ہے عابد کے زنجیر جیسی
ہے ٹیس یہاں ننھے اصغر کے تیر جیسی

(کفایت فہیم)

بوسیدہ ہمارے ہیں ضمیروں کے مکانات
کرتے ہیں اثر سنگ ملامت بھی بہت کم

(ستیش ول)

نظروں کے آگے آیا جو چہرہ جناب کا
دیدار ہم نے کر لیا تازہ گلاب کا

(بشیر چراغ)

کس قدر ہیں پیچیدہ مسئلے محبت کے
بند کیے ہیں اب دل نے داخلے محبت کے

(پرویز مانوس)

مشاعرے میں سامعین کی کثیر تعداد موجود تھی جو ہر شعر پر داد و تحسین سے نوازتی رہی اور مشاعرے کے اختتام پر تالیوں کی گونج اور واہ واہ کی آواز دیر تک جاری رہی۔

■

Md. Shadab Shamim
D-35, Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Mob.:9643885605
ashadabrampuri@gmail.com

وکست بھارت وژن اور مشن

عارفہ بشریٰ

ہندوستان صرف ایک جغرافیائی قطعۂ ارضی کا نام نہیں، ایک منفرد تاریخ اور قابل فخر تہذیب کا نام ہے۔ کم وبیش پانچ ہزار برسوں پر پھیلی ہندوستان کی تاریخ عروج وزوال کی ان گنت داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح اندرونی اور بیرونی دھرموں اور عقیدوں اور رسوم و رواج کے میل جول سے اس دھرتی پر جو ساجھی گنگا جمنی تہذیب وجود میں آئی ہے وہی اس ملک کی اصل پہچان ہے۔ اس پہچان کو قائم رکھنے اور اسے ایک امید، ایک قوت بنانے کے لیے وزیر اعظم نریندر مودی کی قیادت میں جو اقدامات کیے جا رہے ہیں وہ اس ملک کا حال سدھارنے اور مستقبل سنوارنے کی ضمانت ہیں۔ 'وکست بھارت اسی کا ایک حصہ ہے۔'

ہندوستان کے عزت مآب وزیر اعظم شری نریندر مودی جی نے 11 دسمبر 2023 کو ایک ویڈیو کانفرنس کے ذریعے پورے ملک، خصوصاً نوجوانوں کو 'وکست بھارت 2047' سے متعارف کروایا۔ یہ وزیر اعظم نریندر مودی کا وہ عظیم الشان منصوبہ (Dream Project) ہے جس پر ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر ممکن ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ہندوستان کی آزادی کے 100 سالہ جشن کے موقع پر ہندوستان ایک ترقی یافتہ ملک کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ لیکن اس منزل کو حاصل کرنے کے لیے ہم تمام دیس باسیوں کو دن رات انتھک محنت ومشقت کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں نہ صرف اپنے معاشی اور معاشرتی حالات کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہوگا، بلکہ تعلیمی اور تہذیبی منظرنامے کو بھی مثالی بنانا ہوگا۔ اس کے لیے ہم سب کو اجتماعی طور پر تو جدوجہد کرنی ہوگی لیکن انفرادی حیثیت سے بھی اپنے فکر وعمل کے بڑے حصے کو ملک وقوم کی ترقی اور فلاح وبہبودی کے لیے وقف کرنا ہوگا۔ اس مہم کو کامیابی وکامرانی سے ہم کنار کرنے کے لیے ملک کے ہر طبقے کا سرگرم عمل ہونا ضروری ہے۔ ہم اپنے معاشرہ کے کسی بھی فرقہ یا طبقہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں کے اساتذہ، اسکالرس اور 'تعلیمی نظام' (Education System) سے وابستہ دیگر افراد کو بھی کلیدی کردار ادا کرنا ضروری ہے۔

وزیر اعظم نے وکست بھارت کے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے پانچ نکات کی نشاندہی کی اور کہا کہ ملک کے سبھی ذی شعور ہندوستانیوں کو سنجیدگی اور ہوش وخرد کے ساتھ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ وزیر اعظم کے وکست بھارت کے منصوبے کے پانچ نکات درج ذیل ہیں۔

1. غریبی کا خاتمہ :

وکست بھارت کا پہلا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنی ہوں گی اس کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری تمام اداروں کو محنت کرنی ہوگی۔ وزیر اعظم نے کہا کہ غریبی کا ازالہ کرنے کا مقصد حاصل کرنے کے لیے سرکار نجی سطح پر بھی لوگوں کی مدد کرے گی۔ اس کے لیے سرکار نے مختلف طرح کی کئی اسکیمیں تیار کی ہیں، جن سے کوئی بھی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ہماری حکومت کی دلی خواہش بھی ہے اور مقصد بھی کہ ہمارے ملک کے کسی بھی شخص کو بھوکا نہیں سونا چاہیے۔

2. کسانوں کی فلاح و بہبود :

وکست بھارت 2047 کا دوسرا اہم مقصد کسانوں / کاشت کاروں کی فلاح و بہبودی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت نے کئی طرح کی اسکیمیں جاری کی ہیں جن سے ہندوستان کے کسان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک خاص اسکیم 'پردھان منتری فصل بیمہ یوجنا' ہے۔ اس اسکیم کی وجہ سے کسانوں کو کسی بھی وجہ سے اپنی فصل کی بربادی کی صورت میں زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑتا ہے۔ کسانوں کو جو نقصان ہوتا ہے اس کی بھرپائی سرکار کرتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اناج، میوہ جات اور دوسری طرح کی غذائی اجناس کے تحفظ کے لیے کسانوں کو سرکار معقول رقم فراہم کرتی ہے۔ اس اسکیم کی وجہ سے کسانوں کی پریشانی کم ہوئی ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی نے پورے ملک کے کسانوں سے کہا ہے کہ وہ وکست بھارت کی اس اسکیم سے فائدہ اٹھائیں۔

3. خواتین کو با اختیار بنانا:

ہندوستان کی تقریباً نصف آبادی خواتین (عورتوں) پر مشتمل ہے۔ اس لیے 'وکست بھارت' کی اسکیم کے تحت خواتین کو خودمختار اور با اختیار بنانے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اس غرض سے سرکاری اداروں میں عورتوں کی 33 فیصد نمائندگی کو لازمی بنایا گیا ہے۔ عورتوں کی بہتری، خود کفیلی اور معیاری زندگی کے لیے لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ 'بیٹی پڑھاؤ، بیٹی بچاؤ' کی پالیسی کو سرکار نے اپنے وکست بھارت کے وژن اور مشن کے مرکزی مقصد میں رکھا ہے۔ بہت ساری

اسکیمیں ایسی ہیں جن سے عورتیں مختلف طرح کی پیداواری اور تجارتی سرگرمیوں میں حصہ لے کر اپنی معاشی حالت بہتر بنا سکتی ہیں۔ ایک عرصہ سے ہندوستان میں ہر فرقہ اور طبقہ کی عورتوں کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ موجودہ مرکزی حکومت عورتوں کو ہر طرح کے استحصال سے نجات دلانے کے لیے کئی طرح کے مشن پر کام کر رہی ہے۔ لڑکیوں کی شادی اور زچگی کے موقعوں پر سرکاری جانب سے مالی مدد کی اسکیم پر پوری سنجیدگی سے عمل ہو رہا ہے۔ ملک کے کروڑوں خاندانوں کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔ پنچایت سے لے کر پارلیمنٹ تک عورتوں کو اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا بھرپور موقع دیا جا رہا ہے۔ 'کھیلو انڈیا' پروگرام کے تحت بھی لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی بہتر کارنامے انجام دینے کی پوری آزادی ہے۔ حکومت کے 'جل جیون مشن' اور 'سوچھ بھارت مشن' کے تحت بھی کم پڑھی لکھی اور ناخواندہ عورتوں کو روزگار مل رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو حکومت عورتوں کو تعلیم یافتہ، خود کفیل اور بااختیار بنا کر ایک ترقی یافتہ ہندوستان کی تشکیل کے مشن پر کام کر رہی ہے۔

4. تعلیم اور تعلیمی نظام :

تعلیم کی حیثیت کسی بھی سماج، ملک اور معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کی ضمانت ہوتی ہے۔ عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیاں ہر ملک وقوم کو سب سے پہلے اپنے 'تعلیمی نظام' (Education System) کو عصری، سماجی، معاشی اور سائنسی و تکنیکی تقاضوں کے مطابق نئے سانچے میں ڈھالنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ ہندوستان میں زمانہ قدیم سے کئی طرح کے تعلیمی نظام رائج رہے ہیں لیکن مغربی ملکوں کے صنعتی انقلاب، نشاۃ الثانیہ، فرانس، روس کے انقلابات (Renaissance) اور دو عظیم جنگوں کی تباہ کاریوں کی وجہ سے ایک نئے صنعتی دور کی شروعات اور ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک وقوم کی تشکیل جدید کے جتنے بھی قدم اٹھائے گئے ان سب کے مرکز میں جدید ترین تعلیم پر ہی سب سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ آج اگر ہندوستان چاند تاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے تو یہ ہمارے غیر معمولی تعلیم یافتہ سائنس دانوں اور تکنیکی ماہرین کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔

آج کی تاریخ تک آ کر علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں تعلیم وتدریس، تحقیق اور تربیت کی سہولتوں کی وجہ سے ہندوستان میں ایک بار پھر 'نالندہ' اور 'تکشلا'

وزیر اعظم شری نریندر مودی کی قیادت میں 'وکست بھارت' کے وژن اور مشن کے تحت عوام کی بھلائی کے لیے جو قدم اٹھائے گئے ہیں ان کی بدولت ہندوستان 'وکاس' کی ڈگر پر بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور اگر ملک کا ہر شہری پوری سنجیدگی خلوص اور ایمانداری کے ساتھ وکست بھارت کے وژن اور مشن کے ساتھ جڑ جائے تو ہمارے اس عظیم ملک کو 'وشو گرو' بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

کی تعلیمی روایات زندہ ہو رہی ہیں۔ لیکن کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیان کے لیے کے مطابق وزیر اعظم شری نریندر مودی کے 'وژن' اور 'مشن' کے تحت ہمارے 'تعلیمی نظام' میں ایسی انقلابی تبدیلیاں لائی گئی ہیں، جس کا فائدہ ملک کے ہر علاقہ، فرقہ اور زبان کے لوگوں کو یکساں طور پر پہنچ رہا ہے۔ پورے ملک میں 'نیا تعلیمی نظام 2020' (NEP 2020) نافذ کر کے 'وکست بھارت 2047' کے عظیم وژن اور مشن کے تحت ملک کو جدید تعلیم کے نئے امکانات سے روشناس کروایا گیا ہے۔ اس نئی تعلیمی پالیسی کے سبب تعلیمی اداروں کے انفرااسٹرکچر، وسیلوں اور سہولتوں میں ترمیم واضافہ کیا گیا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ اس کا فائدہ طلبا و طالبات ہی نہیں اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کو بھی پہنچ رہا ہے۔ نصابی تعلیم کے علاوہ درس وتدریس کے معیار کو بھی بلند اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے حکومت ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ دراصل ہماری حکومت نے اس وژن کو گرہ سے باندھ لیا ہے کہ کسی بھی ملک وقوم کی تقدیر بدلنے میں تعلیم اور تعلیمی نظام کا ہی کلیدی کردار ہوتا ہے۔ لیکن اس وژن اور مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پر خلوص عمل اور محنت ومشقت کی بھی انتہائی ضرورت ہے۔ اس کے لیے پرائمری سطح سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی اداروں (Higher Education & Research Centres) کے اساتذہ اور دیگر تکنیکی اور انتظامی امور سے وابستہ افراد کو بھی بڑی ذمہ داری کے ساتھ سخت محنت کرنی ہوگی۔ کیونکہ وکست بھارت کا وژن اور مشن طلبا اور طالبات کی ذہنی نشو ونما کے علاوہ ان کے مستقبل کی شاندار تعمیر کا بھی ایک لائحہ عمل ہے۔ اس حوالے سے اردو زبان کا کردار اور رول اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

5. صحت عامہ اور اقتصادی تحفظ :

ملک ومعاشرہ کوئی بھی کیوں نہ ہو اس کی ترقی اور خوشحالی کا انحصار عام لوگوں کی صحت اور تندرستی پر ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے وزیر اعظم کی رہنمائی میں وکست بھارت کے وژن اور مشن کے تحت جو منصوبے پورے ملک میں نافذ کیے جا رہے ہیں ان میں صحت سے متعلق سہولتوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ صحت پروگرام کے تحت ملک بھر میں اسپتالوں اور 'سواستھ کیندروں' کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ جہاں ضرورت مندوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ حکومت نے 'پردھان منتری آیوشمان یوجنا' جیسی اسکیم متعارف کروا کر غریب عوام، مزدوروں اور کسانوں کو ہر سال پانچ لاکھ تک کے مفت علاج کی سہولت فراہم کی ہے۔ اس 'منصوبہ صحت' سے ملک کے کروڑوں غریب لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے، جان لیوا بیماریوں کے علاج کے لیے اور عورتوں کو زچگی کے وقت کی سہولتیں مہیا کرانے کے لیے ہر شہر اور قصبے میں جگہ جگہ انتظامات کروائے گئے ہیں۔ صحت کے حوالے سے اس طرح کے انتظامات کی وجہ سے اسپتالوں اور سواستھ کیندروں میں روزگار کے امکانات بھی پیدا ہوئے ہیں۔

بحیثیت مجموعی وزیر اعظم شری نریندر مودی کی قیادت میں 'وکست بھارت' کے وژن اور مشن کے تحت عوام کی بھلائی کے لیے جو قدم اٹھائے گئے ہیں ان کی بدولت ہندوستان 'وکاس' کی ڈگر پر بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور اگر ملک کا ہر شہری پوری سنجیدگی خلوص اور ایمانداری کے ساتھ وکست بھارت کے وژن اور مشن کے ساتھ جڑ جائے تو ہمارے اس عظیم ملک کو 'وشو گرو' بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

■

Prof. (Dr.) Arifa Bushra
Department of Urdu
University of Kashmir
Hazratbal Srinagar-190006 (J&K)
Mob.: 9469018998
bushraarifa6@gmail.com

معین الدین

زبان کی اقسام

عام ملحوظات

زبان، انسان کی صلاحیت نطق کا نام ہے، ابتدائے آفرینش سے ہی انسان نے زبان کو اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کی ترسیل اور اپنی سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کی تسکین کا ذریعہ بنایا ہے۔ زبان در اصل سماجی اور معاشی ضرورتوں ہی کی ایجاد ہے۔ زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھی ضروریات کے پیش نظر زبان کی عہد بہ عہد ترقی ہوتی رہتی ہے لیکن ترسیل خیالات کے لیے انسان نے محض زبان ہی کا سہارا نہیں لیا بلکہ اشاروں سے بھی تبادلۂ خیال کا کام لیا ہے۔

زبان کیسے وجود میں آئی اس کا صحیح صحیح سراغ لگانا مشکل ہے لیکن یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ ابتدائی انسان نے اپنی سماجی اور معاشی ضروریات اور جذباتی کیفیت کے اظہار کے لیے کچھ آوازیں نکالی ہوں گی اور جسمانی اشاروں کی مدد سے انسان کا مفہوم سمجھ لیا ہو گا۔ آگے چل کر مختلف آوازوں اور اشاروں کے معنی متعین ہو گئے ہوں گے، اس طرح تبادلۂ خیالات کے دوران زبان وجود میں آگئی ہو گی اور بعد میں بول چال کی زبان نے تحریری شکل اختیار کر لی ہو گی۔ لہٰذا زبان کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. اشاروں کی زبان
2. آوازوں کی زبان
3. علامتوں کی زبان

اشاروں کی زبان

اشاروں کے ذریعے ترسیل خیالات، مطالعے کا ایک دلچسپ موضوع ہے، اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کا گفتگو یا تحریر سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس میں فرد ہاتھ آنکھ یا سر کے اشاروں سے اپنے خیالات، محسوسات اور جذبات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ اشاروں کے مفہوم میں کبھی ممالک اور کبھی قوموں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے اس لیے وسیع پیمانے پر اس کا استعمال دشوار ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اشاروں کی زبان آواز کی زبان (تقریر) اور علامات کی زبان (تحریر) سے کم سے کم دس لاکھ برس قدیم ہے۔ عالم گیر سطح پر اس کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اشارات کی زبان کا ذخیرہ بھی بہت وسیع ہے۔ اس کی عام طور پر تین قسمیں بتائی جاتی ہیں:

(1) وہ اشارے جنھیں آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ان اشاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان میں چہرہ، ہاتھ، سر اور انگلیوں کی جنبش شامل ہے۔

(2) اشاروں کی دوسری قسم وہ ہے جن کو کان سے سنا جاسکتا ہے جیسے چٹکی بجانا، سیٹی بجانا وغیرہ۔

(3) وہ اشارے جن میں اظہار مطلب لمس کے ذریعے کیا جاتا ہے جیسے کہنی مارنا، ہاتھ دبانا وغیرہ لیکن ان کا استعمال بہت محدود ہے۔

اشارات کی زبان کو تقریر میں بطور ایک امدادی وسیلہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس اعتبار سے اشارات کی زبان کو آواز کی زبان پر فوقیت حاصل ہے کہ ایک ہی اشارے سے پورا مفہوم ادا ہو جاتا ہے جبکہ زبان کے ذریعے اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے پورا جملہ بولنا پڑتا ہے۔

اگر مختلف ممالک میں اشارات کی زبان کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں اس کا استعمال بہت عام رہا ہے۔ قدیم یونان میں سر جھکا کر اشارہ کرنے سے 'ہاں' کا مفہوم ادا کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں آج بھی نیچے کی طرف سر جھکانے سے 'ہاں' کا اور دائیں بائیں سر ہلانے سے 'نہیں' کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ امریکہ میں 'خدا حافظ' کہنے کے لیے ہتھیلی کو نیچے کی جانب جھکا دیتے ہیں اور یوروپ میں ہتھیلی اوپر کر کے انگلیوں کو آگے پیچھے جنبش دے کر 'قریب' آنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ جاپان اور کوریا میں تقریباً دو سو ایسے اشارات رائج ہیں جن سے محبت کے مختلف پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ غرض ہر ملک میں اشارات کا ایک اپنا نظام ہے۔

ذو لسانی اور کثیر لسانی ماحول میں اشارات کی زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب

فرانسیسی ہوابازوں کو انگریزی زبان سکھائی جارہی تھی تو اشارات کی زبان بہت مفید ثابت ہوئی۔ بین الاقوامی اسکاؤٹ تحریک نے اشارات کا ایک اچھا خاصا نظام مرتب کرلیا ہے۔ ان اشارات کو وہ اپنی تقریبات میں استعمال کرتے ہیں اور تبادلہ خیال کا ذریعہ بناتے ہیں۔ انٹرنیشنل سول ایے ویشن نے پانچوں انگلیوں کی جنبش پر مبنی اشارات کا ایک نظام مرتب کیا ہے جو مختلف لسانی گروہوں کے مابین استعمال ہوتے ہیں۔ شمالی امریکہ میں سرخ ہندی (ریڈ انڈین) قبائل کے پاس اشارات کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔ جب مختلف زبان بولنے والے گروہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو آپس میں اشاروں سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اشاروں کا استعمال اب بھی بہت عام ہے۔ بازار منڈی سے لے کر شعروادب اور رقص و سرود کی محفلوں تک اس کا استعمال ہوتا ہے۔ انگلی کو دانت تلے دبا لینا، تعجب کا اظہار ہے، گردن جھکا لینا شرم کی علامت ہے، انگوٹھا دکھانا یا ٹھینگا دکھانا انکار ہے، کان پکڑنے سے بھی انکار یا توبہ کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ دوسروں کے سامنے چٹکی بجانا اظہار بغاوت ہے۔ اسی طرح محبت کے اظہار کے لیے بھی مختلف قسم کے اشارات ملتے ہیں۔ لیکن زیادہ منظم طریقے سے اشاروں کا استعمال ہمارے کلاسیکی ڈراموں میں ملتا ہے۔ ہندوستانی رقص و موسیقی میں ان اشارات کی باقاعدہ اصناف بندی کی گئی ہے۔ 'بھرت ناٹیم' میں سر کے تیرہ اور آنکھوں کے چھبیس اشارے ہیں۔ گردن کے سات، ہاتھ کے پینتیس اور جسم کے ایک سو چار اشارے ہیں۔ ان کی ترکیب اور توازن سے رقاص پوری کہانی سنا سکتا ہے۔ ہندوستانی رقص کا سب سے نمایاں پہلو 'مدرا' ہے یعنی ہاتھ کے اشارے۔ ہاتھ کے دل کش اشاروں سے مختلف قسم کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

غرض اشاروں کی زبان کی ایک انوکھی افادیت اور دلکشی ہے لیکن اس کا حلقۂ عمل بہت محدود ہے۔ اشارات بالعموم اور ہاتھ کے اشارات بالخصوص تقریر کی جگہ نہیں لے سکتے۔ ہاتھ کے اشارات میں چونکہ ہاتھ کا استعمال ہوتا ہے اس لیے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں اور تقریر میں ہاتھ آزاد ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ اشارات کو سمجھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اشخاص کے درمیان کوئی چیز حائل ہو تو اشارات ترسیل کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ اس کے برعکس آواز کی زبان یعنی تقریر اظہار خیال کا مکمل اور بہترین ذریعہ ہے۔ اس لیے اشارات کی زبان اس کی ہمسری نہیں کرسکتی۔ اشارات کی زبان کا کمزور ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے مجرد تصورات نہیں پیش کیے جاسکتے۔ ایک اشارہ کئی تصورات کا حامل نہیں ہوسکتا اور نہ اشارات تحلیلی و تخلیقی فکر میں معاون ہو سکتے ہیں۔ اشارات کی زبان میں تنوع کی گنجائش بہت کم ہے، جبکہ آواز کی زبان میں ہر لحہ جملے کے سیاق وسباق میں الفاظ کے معنی بدلتے رہتے ہیں۔

> ماہرین کا خیال ہے کہ اشاروں کی زبان آواز کی زبان (تقریر) اور علامات کی زبان (تحریر) سے کم سے کم دس لاکھ برس قدیم ہے۔ عالم گیر سطح پر اس کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اشارات کی زبان کا ذخیرہ بھی بہت وسیع ہے۔

آوازوں کی زبان

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اشاروں کی زبان ہر چند کہ بعض مخصوص صورت حال میں اب بھی استعمال ہوتی ہے لیکن یہ گفتگو یا تحریر کی جگہ نہیں لے سکتی۔ زبان سیکھنا اکتسابی عمل ہے۔ اس پاس کے جن لوگوں سے بچے کا سابقہ پڑتا ہے، وہ عام طور پر زبان کا استعمال کرتے ہیں، اشارات کا نہیں اور چونکہ بچہ گردو پیش کے لوگوں سے ہی زبان سیکھتا ہے، اس لیے وہ انھیں آوازوں کی نقل کرتا ہے جو ماں باپ اور بھائی بہنوں سے سنتا ہے اور انھیں آوازوں کے توسط سے وہ اشخاص اور اشیاء کو پہچاننا شروع کرتا ہے۔ اس طرح وہ زبان سیکھنے کا آغاز کرتا ہے۔ وہ آوازیں سنتا ہے، نقل کرتا ہے اور اس طرح سننے اور بولنے کی ابتدائی تربیت حاصل کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ تقریر کی دیگر مہارتوں پر بھی قدرت حاصل کر لیتا ہے اور اس کے اندر اس بات کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ مجرد تصورات کو بیان کر سکے اور فجائی آوازوں کے ذریعے رنج، خوشی، حیرت، محبت، نفرت جیسی کیفیات کا بھی اظہار کر سکے۔ مثلاً قہقہہ، گریہ وزاری وغیرہ۔ فجائی آوازوں کے علاوہ بچہ صوتی آوازوں سے بھی آشنائی حاصل کرتا ہے جیسے ہوا چلنے کی آواز سن سن، گھڑی کی آواز ٹک ٹک، گھڑی کی آواز ٹک ٹک یا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز کھٹ کھٹ۔ فجائی اور صوتی آوازیں بھی لفظ کے دائرے میں آتی ہیں لیکن تیسری قسم کی آواز لفظ یا بول سے مختلف ہوتی ہے۔ لفظ یا بول کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کون سا لفظ کیونکر وجود میں آیا۔

علامتوں کی زبان (تحریر)

جب کسی آواز یا لفظ کو علامت کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ تحریر کی شکل اختیار کر لیتی ہے، لیکن تحریر میں لفظ بے جان اور جامد رہتے ہیں اور اس وقت تک بے حس رہتے ہیں جب تک بولنے والا ان میں روح نہ پھونکے۔ تحریر میں لفظ کی صورت بدلتی نہیں، لیکن جب وہی لفظ بول چال میں استعمال ہوتا ہے، تو کبھی موقع محل کے لحاظ سے اس کی صورت بدل جاتی ہے اور کبھی لب و لہجے کی تبدیلی سے اس کے مفہوم میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔

بولی اور زبان

کسی زبان کی ذیلی شاخ کو بولی کہتے ہیں۔ ایک بڑے لسانی گروہ میں جو کسی بڑے علاقے میں آباد ہو، کچھ مقامی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے ایک زبان بولنے والے مختلف بولیوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ یہ اختلافات اس صورت میں کم ہوجاتے ہیں، جب اس زبان کے بولنے والوں کو باہم میل جول کے زیادہ مواقع ملتے ہوں لیکن اگر کسی علاقے کے رہنے والوں کو نقل وحرکت کے مواقع کم میسر آئیں تو باہمی ربط کے مواقع بھی کم دستیاب ہوں گے اور اس طرح اس علاقے میں بولیوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ بولی عام طور پر ایک بے ڈھب کی زبان ہوتی

ہے، جو نسبتاً چھوٹے علاقے کے عوام میں رائج ہوتی ہے۔ اس کی نہ تو کوئی تنظیم ہوتی ہے اور نہ ہی ضابطے اور اصول مقرر ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی کوئی گرامر بھی مرتب نہیں ہو پاتی۔ بولی میں تبدیلی بہت جلدی جلدی ہوتی رہتی ہے، جب کہ زبان میں تبدیلی بڑی مشکل سے آتی ہے اور بہت دیر میں اس تبدیلی کا اثر ظاہر ہو پاتا ہے لیکن بولی زبان کے مقابلے میں زیادہ ارتقا پذیر ہوتی ہے اس لیے کہ یہ زندگی کی بدلتی ہوئی ضروریات کے ساتھ بلا تکلف تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

بولی اور زبان کی ابتدا اور نشوونما سے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ رینال اور میکس مولر کے خیال کے مطابق زبان کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مختلف بولیاں جو متعدد ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھیں، ایک شکل میں مجتمع ہوگئیں یعنی اس کا ارتقائی عمل انتشار سے اتحاد کی جانب ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرے ماہر لسانیات وہٹنے کا خیال ہے کہ زبان پہلے وجود میں آئی اور رفتہ رفتہ بولیوں میں بٹ گئی۔ اس طرح اس کا ارتقائی عمل اتحاد سے انتشار کی جانب ہے۔

مادری زبان

مادری زبان اس زبان کو کہتے ہیں جو بچے کے گھر خاندان اور ماحول میں بولی جاتی ہو۔ یہ بچے کی پہلی زبان ہوتی ہے۔ اسی کے ذریعے بچہ گرد و پیش کی دُنیا سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ خارجی ماحول سے روشناس ہوتا ہے اور اپنے جذبات محسوسات اور خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

تعلیمی اعتبار سے مادری زبان اس زبان کو کہتے ہیں، جس میں بچے کو رسمی تعلیم دی جائے۔ تقریباً تمام ماہرین تعلیم اس بات سے متفق ہیں کہ بچے کی تعلیم کا بہترین ذریعہ اس کی مادری زبان ہے۔ اگر مادری زبان کے ذریعے تعلیم دی جائے تو تعلیم موثر ہوگی اور بچے کی شخصیت متوازن طریقے پر نشوونما پائے گی۔

مادری زبان میں تعلیم کا مطالبہ

مادری زبان میں تعلیم دینے کی اہمیت سے متعلق گزشتہ تین دہوں میں کافی بحث ہو چکی ہے اور اس بات کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ مادری زبان کے ذریعے بہتر تعلیم ہوتی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم دینے کا مطالبہ اس وقت زیادہ زور پکڑتا ہے، جب سماج میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور تعلیم کو سماجی تبدیلی اور شخصیت سازی کا

> زبان اور خیال کا تعلق، جسم اور روح کا ہے، ایک کا دوسرے پر انحصار ہے۔ ایک کی ترقی سے دوسرے کی ترقی ہوتی ہے، اور ایک کے انحطاط سے دوسرے کا انحطاط ہوتا ہے۔

ایک موثر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے نیز لوگوں میں تہذیبی تشخص کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر تعلیم کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو آسانی سے اس بات کا پتہ چل سکتا ہے کہ دور وسطیٰ کے یوروپ میں لاطینی زبان کے ذریعے تعلیم دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں بھی انیسویں صدی تک سنسکرت یا فارسی ذریعہ تعلیم رہی۔ ان تمام ادوار میں تعلیم ایک مخصوص طبقے تک محدود تھی۔ اس لیے مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا مسئلہ نہیں پیدا ہوا۔ لیکن جب آزاد ہندوستان میں تعلیم کو عام، مفت، لازمی اور سیکولر بنانے کا منصوبہ بنایا گیا تو تعلیم بذریعہ مادری زبان نے ایک مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمہ گیر تعلیم کے امکانات اسی وقت روشن ہوں گے، جب تعلیم کی سہولتیں عوام کو میسر آنے لگیں۔ عوام الناس کو خواندہ بنانے کے لیے مقامی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا ان تمام قوموں نے جنھیں ابھی حال میں آزادی حاصل ہوئی ہے اور جنھوں نے جمہوری نظام اپنایا ہے، ذریعہ تعلیم کے مسئلے کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

مادری زبان کے ذریعے تعلیم دینے کے حق میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، ان کا تعلق ذہنی، جذباتی نفسیاتی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں سے علیحدہ علیحدہ بھی ہے اور ملا جلا بھی ہے۔ یہاں محض ان پہلوؤں سے بحث کی جائے گی جن کا تعلق خصوصی طور پر درس و تدریس سے ہے۔

جدید تعلیم میں نفسیات کو ایک خصوصی مرتبہ حاصل ہے۔ چنانچہ زبان کی تعلیم میں بھی نفسیات کو ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔ زبان آوازوں کا ایک نظام ہے جو بچے کے دماغ کو متحرک کرتا رہتا ہے۔ اس کے وسیلے سے وہ خود بخود اظہار تفہیم کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح اس کو جو تسکین حاصل ہوتی ہے، وہ ذہنی، جذباتی اور سماجی نشوونما کی ضمانت کرتی ہے۔ یہ منصب مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں ادا کر سکتی۔ زبان اور خیال کا تعلق، جسم اور روح کا ہے، ایک کا دوسرے پر انحصار ہے۔ ایک کی ترقی سے دوسرے کی ترقی ہوتی ہے، اور ایک کے انحطاط سے دوسرے کا انحطاط ہوتا ہے۔

سماجی اعتبار سے مادری زبان کا مقام اور بھی بلند ہے کیونکہ مادری زبان کے ذریعے ہی بچہ اپنی تہذیب و معاشرت سے مطابقت اور رابطہ پیدا کرتا ہے۔ ایک مشترک وسیلۂ اظہار یعنی تقریر یا گفتگو گروہ کے افراد کے درمیان وسیلے کا کام کرتا ہے۔ اس کے بغیر سماجی روابط تقریباً ناممکن ہیں۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے مادری زبان کی امتیازی اہمیت ہے، اس لیے کہ مادری زبان سے آموزش میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔ مدرسے کے اندر مادری زبان کی حیثیت محض ایک مضمون کی نہیں ہوتی بلکہ مادری زبان دیگر مضامین کی تعلیم کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ کمرۂ جماعت ہو یا معمل، ورک شاپ ہو یا کتب خانہ یا کھیل کا میدان ہر جگہ مادری زبان کی ہی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

پس مادری زبان نہ صرف تعلیم کا ایک موثر ذریعہ ہے، بلکہ مادری زبان کے ذریعے اگر تعلیم نہ دی جائے تو اظہار ذات کی صلاحیت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اس کے سبب تحصیل علم میں رکاوٹ ہوتی ہے اور شخصیت میں توازن پیدا نہیں ہو پاتا۔

لہٰذا درس و تدریس کا کام کرنے والوں کو اس بات سے شعوری طور پر باخبر ہونا چاہیے کہ بچوں کی نشوونما میں اور موثر تعلیم کے حصول میں مادری زبان کیا رول ادا کرتی ہے نیز دیگر مضامین سے اس کا کیا تعلق ہے اور آموزش میں یہ کس طرح معاون ہو سکتی ہے۔

■

ماخذ: اردو زبان کی تدریس، **مصنف:** معین الدین، **پانچویں طباعت:** 2011، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

آفاق ندیم خان

زبان اور خواندگی کی تدریس سے متعلق

قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 کے اہم نکات

آزادی کے بعد سے ہندوستان میں تعلیمی اصلاحات کا ایک طویل سفر جاری ہے، جس کی حالیہ کڑی قومی تعلیمی پالیسی 2020 ہے۔ اس پالیسی کے مطابق، ہر بچے میں ابتدائی سطح پر زبان، خواندگی اور عددی مہارتوں کا فروغ نہ صرف تعلیمی ترقی کا پہلا زینہ ہے، بلکہ مستقبل کی تعلیم کا بنیادی ستون بھی ہے۔ تعلیمی پالیسی 2020 کے نکتے 2.1 میں واضح کیا گیا ہے کہ تمام طلبا کے لیے پڑھنے، لکھنے اور بنیادی عددی مہارتوں کا حصول نہایت ضروری ہے، جو آگے کی تعلیم اور زندگی بھر سیکھنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ تاہم، مختلف قومی و غیر سرکاری مطالعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ابتدائی جماعتوں کے طلبا کی ایک بڑی تعداد اب تک بنیادی خواندگی اور حساب دانی سے محروم ہے۔ پالیسی کے نکتے 2.2 میں اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے 2025 تک درجہ سوم تک کے تمام طلبا میں بنیادی خواندگی اور عددی مہارتوں کے حصول کو نظام تعلیم کی 'اعلیٰ ترین ترجیح' قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں پالیسی کے نفاذ کے لیے ایک ہمہ گیر تعلیمی ڈھانچے اور مربوط تدریسی حکمت عملی کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے، جس کی عملی شکل قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح (NCF-FS,2025) کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح کا باب چہارم جس کا عنوان "تدریسیات" ہے، خواندگی اور عددی تعلیم کی تدریسی حکمت عملیوں، خصوصاً زبان کی تدریس کے لیے واضح رہنما خطوط فراہم کرتا ہے۔ نکتے 4.5 اور ذیلی نکتے 4.5.1 میں ابھرتی ہوئی خواندگی کے فروغ، اس کی تدریس کی مختلف طرز رسائیاں، اور غیر مانوس زبانوں کی تدریس جیسے موضوعات پر مفصل رہنمائی موجود ہے۔ یہ رہنما خطوط نہ صرف تعلیمی منصوبہ بندی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں بلکہ اساتذہ کو زبان و خواندگی کی تدریس میں بچوں کی عمر اور سیاق و سباق کے مطابق بہتر فیصلے لینے میں مدد دیتے ہیں۔

اس ضمن میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے نکتے 3.1 کے تحت، این سی ای آر ٹی کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ 8 سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے بچپن کی تعلیم کا ایک جامع قومی درسی خاکہ تیار کرے۔ اس خاکہ میں مقامی روایات، لوک ادب، کہانیاں، نظمیں، کھیل، اور فنونِ لطیفہ پر مبنی سرگرمیوں کو مرکزی حیثیت دی جائے، تاکہ تدریس بچوں کے جذباتی، لسانی، اور فکری ارتقا کے مطابق ہو سکے۔ یہ مقالہ، قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح کے انھیں خطوط، خصوصاً باب چہارم کے تجزیے پر مبنی ہے۔ اس میں ابھرتی ہوئی خواندگی کے نظریہ، تدریسی حکمت عملیوں، تدریسی طرز رسائیوں کے مختلف ماڈلز، اور زبان کے اساتذہ کے لیے درکار عملی رہنمائی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مقالہ کا مقصد اردو زبان و خواندگی کی تدریس کے دائرے میں تحقیق و عمل کا ایک مضبوط ربط پیدا کرنا ہے، تاکہ اردو زبان کے اساتذہ موجودہ درسیاتی خطوط کو بہتر طور پر سمجھتے ہوئے مؤثر اور بامقصد تدریسی تجربات ترتیب دے سکیں۔

زبان اور خواندگی کی تدریس: قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 کا باب چہارم، بالخصوص نکتے 4.5.1، زبان اور خواندگی کی تدریس کے تناظر میں ابتدائی جماعتوں میں جاری تعلیمی رویوں کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ موجودہ تدریسی عمل میں زبان کی تدریس محض حروف تہجی اور ماتراؤں کی مشق، خوشخطی، اور اجتماعی تکرار تک محدود ہو چکی ہے۔ نتیجتاً، بچوں کو مفہوم پر مبنی سرگرمیوں اور تخلیقی اظہار کے مواقع بہت کم حاصل ہوتے ہیں، جو کہ زبان سیکھنے کے فطری عمل کے برعکس ہے۔ قومی درسیاتی خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 اس تحدید کو ختم کرتے ہوئے ایک جامع اور بامعنی تدریسی نقطۂ نظر اپنانے کی سفارش کرتا ہے جس میں زبان اور خواندگی کی تعلیم کو صرف کوڈنگ یا ڈیکوڈنگ (حروف یا الفاظ کو پہچاننے) تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے بچوں کی فکری و تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے ایک ذریعہ سمجھا جائے۔

ابھرتی ہوئی خواندگی کا تصور: زبان اور خواندگی کی تدریس کے حوالے سے 'ابھرتی ہوئی خواندگی' کا تصور ایک بنیادی ستون کے طور پر ابھرتا ہے۔ قومی درسیاتی خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 نکتے 4.5.1.1 میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ وہ مہارتیں، علم اور رویے ہیں جو بچے روایتی طور پر روانی سے پڑھنے اور لکھنے سے قبل خود بخود سیکھنے لگتے ہیں۔ ان میں نہ صرف صوتی آگاہی، علامتی فہم اور تصویری قرأت شامل ہوتی ہے، بلکہ وہ ابتدائی تحریری اظہار، جیسے تصاویر بنانا یا آزادانہ لکیریں کھینچنا، کے ذریعے بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ مرحلہ اس وقت زیادہ مؤثر ہوتا ہے جب بچوں کو طباعت سے بھرپور ماحول (print rich environment) میں رکھا جائے، جہاں وہ تحریری مواد کو روزمرہ زندگی کا حصہ سمجھنے لگیں۔

طباعتی آگاہی اور تصویری خواندگی: ابھرتی ہوئی خواندگی میں طباعتی آگاہی (Print Awareness) ایک کلیدی عنصر ہے۔ اس سے مراد اس بات کی فہم ہے کہ تحریری متن کس طرح معنی رکھتا ہے، کس مقصد سے استعمال ہوتا ہے، اور کتابوں یا متن کے ساتھ تعامل کی کون سی روایات ہیں۔ بچے ابتدائی عمر سے ہی مختلف طباعتی اشکال کو تصویروں کے طور پر پہچاننا شروع کرتے ہیں، جیسے: لیبل، سائن بورڈ، یا کتاب کی سرخیاں وغیرہ۔

یہی رجحان آگے چل کر رمز کشائی (Decoding) اور مفہوم سازی (Making meaning) کی بنیاد بنتا ہے۔

تحریری اظہار اور ذاتی فہم: تحریری اظہار کے ابتدائی مراحل میں بچے تصویریں بناتے، لکیریں کھینچتے، یا اپنے تجربات کو علامتی انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تحریر ان کی گفتگو، مشاہدے، اور فرضی کھیل سے مربوط ہوتی ہے۔ وہ آزادانہ طریقے سے ہجے بنانے لگتے ہیں (جیسے: بلی کو ماؤں اور کتے کو ودّت) جو زبان کی ساختی فہم کی ابتدائی علامت ہے۔ یہ فطری عمل، اگر استاد کی رہنمائی اور ترغیب کے ساتھ جاری رکھا جائے، تو زبان کی پائیدار بنیاد رکھتا ہے۔

تدریسی حکمت عملی کی تشکیل: قومی درسیاتی خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 اس بات پر زور دیتا ہے کہ ابتدائی جماعتوں (خصوصاً جماعت 1 اور 2) میں زبان و خواندگی کی تدریس کو نصابی خاکے میں ساختی طور پر شامل کیا جائے تاکہ 3 سے 8 سال کی عمر کے بچوں کے لسانی تجربات، دلچسپیوں اور فطری میلانات کی بنیاد پر تدریس کی جا سکے۔ اس میں؛ مفہوم پر مرکوز تدریس، بچوں کی زبان میں کتابوں کا استعمال، زبانی زبان کی ترقی کو اہمیت دینا، بچوں کو تخلیقی تحریر کی ترغیب دینا، کہانیوں، نظموں، لوک گیتوں، اور تصویری مواد کا انضمام وغیرہ پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔

تجزیاتی بصیرت: زبان و خواندگی کی تدریس کا روایتی طریقہ، جس میں صرف صوتی اجزاء، لکھائی، اور تکرار پر زور دیا جاتا تھا، اب مؤثر نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے مقابلے میں جدید تحقیق اس بات پر زور دیتی ہے کہ بچوں کو بامعنی اور سیاقی ماحول فراہم کیا جائے جہاں وہ زبان کو بطور اظہار اور تفہیم کے آلہ کے طور پر استعمال کر سکیں۔ بچوں کی ابتدائی زبان، ان کی گھریلو بولیاں اور مقامی ثقافتی سرمائے کو بھی تدریسی منصوبہ بندی کا حصہ بنانا ضروری ہے۔

ابھرتی ہوئی خواندگی کی تدریس کی حکمت عملیاں: قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح (2022) زبان اور خواندگی کی ابتدائی تعلیم کو ایک کلیدی حیثیت دیتا ہے، جس کا مقصد ایسے تدریسی طریقوں کو فروغ دینا ہے جو نہ صرف بچوں کے زبان و بیان کی صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں بلکہ ان کی علمی بنیاد کو بھی مستحکم کرتے ہیں۔ نکتہ 4.5.1.2 (صفحہ 109) اور نکتہ 4.5.1.3 (صفحہ 110) میں بیان کی گئی ابھرتی ہوئی خواندگی کی تدریسی حکمت عملیوں اور اجزاء کو ایک مکمل اور مربوط فریم ورک کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جو ابتدائی سطح پر بچوں کی زبان و خواندگی کی نشوونما میں معاون ہیں۔ یہ حکمت عملیاں درج ذیل ہیں؛

1. **فعالیت، مشاہدہ اور اظہار:** ابھرتی ہوئی خواندگی کے فروغ کے لیے مجوزہ حکمت عملیاں اس نظریہ پر مبنی ہیں کہ بچے سیکھنے کے عمل میں فعال شرکت کے ذریعے زیادہ بہتر طور پر زبان سیکھتے ہیں۔ بچوں کو کہانیوں کی کتابوں، بلند آواز سے مطالعہ، اور 'پڑھنے کا دکھاوا' جیسے طریقوں سے مشغول کرنا، نہ صرف ان کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے بلکہ سمعی، بصری اور جذباتی سطح پر بھی سیکھنے کے عمل کو مستحکم کرتا ہے۔ اسی طرح، بچوں کو ڈرائنگ، بے ربط لکیریں کھینچنے، اور سلیٹ یا کاپی پر اپنی سوچ کا اظہار کرنے کی حوصلہ افزائی، اظہارِ ذات اور تجزیاتی فکر کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔

2. **طباعتی ماحول کی تشکیل:** ثقافتی مناسبت سے بصری ادراک کے ذریعے تعلیمی فضا کو طباعتی وسائل سے بھرپور بنانا چاہیے۔ جیسے بڑی تصویری کتابیں، نظموں کے پوسٹرز، اور بچوں کے رسائل وغیرہ، ایسا تعلیمی ماحول فراہم کرتے ہیں جو بصری حواس کو متحرک کرتا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں بچے طباعت کے مختلف طریقوں سے روشناس ہوتے ہیں، جو بعد ازاں رمز کشائی اور فہم کے عمل کو آسان بناتے ہیں۔ 'ریڈنگ کارنر' اور 'رائٹنگ کارنر' کی تشکیل، خود سے مطالعہ اور اظہارِ تحریر کی فضا مہیا کراتے ہیں، جو خود مختار آموزش کی بنیاد ہے۔

3. **ابتدائی زبان اور خواندگی کے اجزا:** ابتدائی خواندگی کی تدریس محض حروف کی شناخت تک محدود نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اسے ایک ارتقائی اور فطری انداز میں ترتیب دیا جانا چاہیے۔ اس تناظر میں، ابھرتی ہوئی خواندگی کی مہارتیں جیسے: طباعت کا شعور، لوگوگرافک پڑھنا، تصویری مطالعہ بچوں میں حروف اور الفاظ کے تصورات کو بہتر انداز میں قائم کرتے ہیں۔ ان ابتدائی مہارتوں کی مدد سے بچے زبان کو 'یاد' کرنے کے بجائے 'محسوس' کرنا سیکھتے ہیں۔

4. **صوتیاتی اور سمعی بیداری:** صوتی آگاہی، بچوں میں زبان کی صوتی ساخت کو سمجھنے کی بنیادی صلاحیت فراہم کرتی ہے جس سے زبان کی تفہیم میں وسعت آتی ہے۔ یہ صلاحیت اس وقت مضبوط ہوتی ہے جب بچے جملوں، الفاظ اور حروف کو سماعت کے ذریعے شناخت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی رمز کشائی کی مہارت، یعنی حروف و آواز کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی صلاحیت، بچوں کو لکھی ہوئی زبان کو آواز کے قالب میں ڈھالنے میں مدد دیتی ہے۔

زبان اور خواندگی کی تدریس کو ابھرتی ہوئی خواندگی کے تناظر میں دیکھنا آج کی اہم ضرورت ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں اور اردو زبان کے اساتذہ کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ بچوں کی زبان کے ابتدائی تجربات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور سمعی، بصری اور تخلیقی سرگرمیوں کو تدریسی لائحہ عمل کا جزو لازم بنائیں۔

5. **فہم، روانی اور تحریر:** فہم، روانی اور تحریر اعلیٰ خواندگی کی بنیادیں ہیں۔ تحریری متن سے فہم اخذ کرنا، تنقیدی انداز میں سوچنا، اور روانی کے ساتھ پڑھنا وہ صلاحیتیں ہیں جو خواندگی کو اعلیٰ سطح پر لے جاتی ہیں۔ ان میں درست، خودکار اور بااظہار مطالعہ، اور خیالات کی منظم انداز میں تحریر شامل ہے۔ تحریری صلاحیتوں کی تربیت کے بغیر خواندگی کا عمل ادھورا ہے۔ اس کے ساتھ مطالعے کی عادت اور ادب کے لیے قدردانی پیدا کرنا خواندگی کو پائیدار بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اس طرح زبان اور خواندگی کی تدریس کو ابھرتی ہوئی خواندگی کے تناظر میں دیکھنا آج کی اہم ضرورت ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں اور اردو زبان کے اساتذہ کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ بچوں کی زبان کے ابتدائی تجربات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور سمعی، بصری اور تخلیقی سرگرمیوں کو تدریسی لائحہ عمل کا جزوِ لازم بنائیں۔ بچوں کو زبانی زبان، طباعت کے فہم، اور صوتیاتی شعور کی طرف راغب کرنا ایک ایسا عمل ہے جو زبان کے فطری حصول کو آسان بناتا ہے۔ قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 اس ضمن میں ایک بصیرت افروز رہنما ہے، جس کی روشنی میں اردو میڈیم اساتذہ ابتدائی تعلیم کے میدان میں نئی راہیں متعین کر سکتے ہیں۔

خواندگی کی تدریس کی طرز رسائیاں: قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی تعلیم 2022 کے مطابق، زبان اور خواندگی کی تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے ایک متوازن، جامع اور منظم تدریسی نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔ خاکہ کے باب 4.5.1.4 (صفحہ 111) میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ زبان کی تدریس کے مختلف اجزاء، بشمول

مثال کے طور پر:

* مکمل جسمانی ردعمل (Total Physical Response): ایسے الفاظ یا جملے بولے جائیں جن کے ساتھ بچے جسمانی حرکت کے ذریعے مفہوم اخذ کر سکیں، مثلاً 'کودو!' کہتے وقت حقیقتاً کودنا۔
* زبانی اور ابلاغی مشقیں: مثلاً تصویری کہانیاں، کردار نگاری، مکالماتی کھیل، بچوں کی روزمرہ زندگی سے جڑے سادہ جملے اور ہدایت پر مبنی جملے: جیسے 'دروازہ بند کرو'، 'باہر دیکھو'
* زبان کی آہستہ آہستہ افزائش: توسیعی مکالمے، نئے الفاظ کا تعارف اور ان کا استعمال۔

ان سرگرمیوں کے ذریعے زبان کا سیکھنا فطری انداز اختیار کرتا ہے جو بچوں کے اعتماد کو تقویت دیتا ہے۔

2. **قابلِ فہم اور بامعنی مواد کی فراہمی:** غیر مانوس زبان کی تدریس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ زبان بچوں کی تفہیم کی سطح کے مطابق ہو۔ اس کے لیے استاد سادہ اور آہستہ زبان استعمال کرے۔ بات چیت کو حرکات، اشاروں، تصویری وسائل، اور بچوں کی مادری زبان سے منتخب الفاظ کے ذریعے تقویت دی جائے۔ ایسی کہانیاں یا سرگرمیاں استعمال کی جائیں جو بچوں کے سیاق و سباق سے قریبی تعلق رکھتی ہوں تاکہ مفہوم اخذ کرنا آسان ہو۔ یہ طریقہ سکھائی جانے والی زبان کو 'قابلِ فہم مواد' میں تبدیل کر دیتا ہے، جو زبان سیکھنے کے جدید نظریات کی بنیاد ہے۔

3. **بامقصد اور سچی زندگی سے جڑی زبان کا استعمال:** بچوں کو زبان سیکھنے کے لیے ایسے سیاق و سباق دیے جائیں جو نہ کہ صرف کتابی اور صرفی و نحوی درستگی پر مبنی ہوں بلکہ جو معنی خیز اور حقیقی ہوں، اس کے لیے:

* ابلاغی مشن جیسے 'کھیل کے قوانین سمجھانا' یا 'کسی کام کی وضاحت کرنا' اپنائے جائیں۔
* بچوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ زبان کو صرف امتحانی درستگی کے لیے ہی نہیں بلکہ اظہار، اشتراک اور مکالمے کے لیے استعمال کریں۔

یہ طریقہ زبان سیکھنے کے عمل کو فطری، مقصدی اور قابلِ رسائی بناتا ہے۔

4. **زبان سے بھرپور ماحول کی تشکیل:** زبان سے بھرپور ماحول بچوں کو بتدریج زبان میں روانی کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک ایسی جماعتی فضا تشکیل دی جائے جہاں بچے غیر مانوس زبان کو مختلف طریقوں سے سنیں، دیکھیں اور استعمال کریں۔ مثلاً: روزمرہ گفتگو میں زبان کا استعمال، تصویری اور تحریری مواد کی فراہمی، چھوٹے اشعار، لوک کہانیاں، ترانے اور باہمی گفتگو کے مواقع، وغیرہ۔

5. **دباؤ سے پاک، معاون اور حوصلہ افزا ماحول:** زبان سیکھنے کا عمل اس وقت زیادہ مؤثر ہوتا ہے جب بچے خود کو محفوظ، آزاد اور حوصلہ افزا ماحول میں محسوس کریں۔ اس لیے:

* غیر مانوس زبان میں روانی کی فوری توقع نہ رکھی جائے؛
* رسمی جانچ یا فوری درستگی سے اجتناب برتا جائے؛
* غلطیوں کو سیکھنے کا موقع سمجھا جائے، نہ کہ ناکامی؛
* استاد دوستانہ، معاون اور تشویق انگیز رویہ اختیار کریں۔

خلاصہ: زبان اور خواندگی کی تدریس تعلیم کے بنیادی مرحلہ کی اساس ہے، جس پر بچے کی سیکھنے، سوچنے، اظہار کرنے اور سماجی تعلق قائم کرنے کی ساری صلاحیتوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی سماج میں، جہاں بچے مختلف زبانوں، ثقافتوں اور لسانی پس منظر سے آتے ہیں، وہاں زبان کی تدریس صرف لسانی مہارت کی منتقلی کا عمل نہیں بلکہ ایک کثیر جہتی اور حساس تدریسی چیلنج بھی ہے۔ قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی تعلیم 2022 یہ واضح کرتا ہے کہ زبان محض الفاظ یا جملوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سوچ، معاشرت اور تشخص کی نمائندہ ہوتی ہے۔ خاکہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے زبان کو بچے کی فطری سیکھنے کی بنیاد مانتا ہے اور اس کے فروغ کے لیے سمعی، بصری، جسمانی اور سماجی سرگرمیوں کو لازمی قرار دیتا ہے۔ خاکہ میں ایک اہم بحث خواندگی کے ارتقائی مراحل پر مرکوز ہے، جہاں بچے کی زبان کے ساتھ تدریجی طور پر اس کی رسم الخط، حروف شناسی، صوتیات، اور بامعنی مطالعے کی مہارتیں استوار ہوتی ہیں۔ خاکہ میں واضح کیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اگر خواندگی کو غیر فطری یا مصنوعی انداز میں پیش کیا جائے تو یہ بچے کی تخلیقی قوت کو دبا سکتا ہے۔ لہٰذا، خواندگی کی تدریس کو زبان کے قدرتی استعمال کے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ خاکہ میں کثیر لسانی تدریسی ماحول کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، جو ہندوستانی سیاق میں انتہائی ضروری ہے۔ مادری زبان، مقامی زبان اور اسکولی زبان کے درمیان ربط و مطابقت پر زور دیا گیا ہے تاکہ بچے کو سیکھنے میں لسانی دشواریاں پیش نہ آئیں۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اساتذہ کو کثیر لسانی تدریسی حکمت عملیوں کو اپنانا چاہیے، جن میں ترجمہ، کوڈ سوئچنگ، اور بین اللسانی گفتگو شامل ہوں۔ ایک اہم نکتہ غیر مانوس زبان کی تدریس سے متعلق ہے، جہاں استاد کو ان بچوں کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے جو تدریسی زبان سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس چیلنج کا مؤثر حل ٹی پی آر، تصویری کہانی، سادہ ہدایات، اور قابلِ فہم مواد کے استعمال میں پوشیدہ ہے۔ بچوں کو زبان کی دنیا سے آہستہ آہستہ روشناس کرانے کے لیے دباؤ سے پاک، محفوظ اور دوستانہ ماحول مہیا کرنا ضروری ہے۔ یہ خاکہ زبان کے اساتذہ کے لیے ایک رہنما دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اساتذہ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ زبان کو محض ایک مضمون کے طور پر نہیں بلکہ بچے کی علمی، تخلیقی اور سماجی ترقی کے وسیلے کے طور پر برتیں۔ خاکہ اس ضمن میں نظری اور عملی دونوں سطحوں پر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

کتابیات/حوالہ جات:

* National Curriculum Framework (School Education) 2023-NCERT, New Delhi.
* National Curriculum Framework for Foundational Stage 2022-NCERT, New Delhi
* قومی تعلیمی پالیسی 2020، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند، اردو ترجمہ، شعبہ نشر و اشاعت امارات شرعیہ پھلواری شریف، بہار
* بھارت کا آئین، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی، 2010
* نجم السحر، صابرہ سعید، تدریس اردو، پریمئر پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، 2006
* محی الدین قادری زور، تدریس اردو، یونیک بک میڈیا، شرینگر، 2006

Dr. Afaque Nadeem Khan
Associate Professor, Department of Educational Studies
Faculty of Education, Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob.: 9981995549
akhan28@jmi.ac.in

مثال کے طور پر:

* مکمل جسمانی ردعمل(Total Physical Response): ایسے الفاظ یا جملے بولے جائیں جن کے ساتھ بچے جسمانی حرکت کے ذریعے مفہوم اخذ کر سکیں، مثلاً 'کودو!' کہتے وقت حقیقتاً کودنا۔
* زبانی اور ابلاغی مشقیں: مثلاً تصویری کہانیاں، کردار نگاری، مکالماتی کھیل، بچوں کی روزمرہ زندگی سے جڑے سادہ جملے اور ہدایت پر مبنی جملے: جیسے 'دروازہ بند کرو'، 'باہر دیکھو'
* زبان کی آہستہ آہستہ افزائش: توسیعی مکالمے، نئے الفاظ کا تعارف اور ان کا استعمال۔

ان سرگرمیوں کے ذریعے زبان کا سیکھنا فطری انداز اختیار کرتا ہے جو بچوں کے اعتماد کو تقویت دیتا ہے۔

2. **قابلِ فہم اور بامعنی مواد کی فراہمی:** غیر مانوس زبان کی تدریس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ زبان بچوں کی تفہیم کی سطح کے مطابق ہو۔ اس کے لیے استاد سادہ اور آہستہ زبان استعمال کرے۔ بات چیت کو حرکات، اشاروں، تصویری وسائل، اور بچوں کی مادری زبان سے منتخب الفاظ کے ذریعے تقویت دی جائے۔ ایسی کہانیاں یا سرگرمیاں استعمال کی جائیں جو بچوں کے سیاق و سباق سے قریبی تعلق رکھتی ہوں تاکہ مفہوم اخذ کرنا آسان ہو۔ یہ طریقہ سکھائی جانے والی زبان کو 'قابلِ فہم مواد' میں تبدیل کر دیتا ہے، جو زبان سیکھنے کے جدید نظریات کی بنیاد ہے۔

3. **بامقصد اور بچی زندگی سے جڑی زبان کا استعمال:** بچوں کو زبان سیکھنے کے لیے ایسے سیاق و سباق دیے جائیں جو نہ کہ صرف کتابی اور صرفی و نحوی درستگی پر مبنی ہوں بلکہ جو معنی خیز اور حقیقی ہوں، اس کے لیے:

* ابلاغی مشن جیسے 'کھیل کے قوانین سمجھانا' یا 'کسی کام کی وضاحت کرنا' اپنائے جائیں۔
* بچوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ زبان کو صرف امتحانی درستگی کے لیے ہی نہیں بلکہ اظہار، اشتراک اور مکالمے کے لیے استعمال کریں۔

یہ طریقہ زبان سیکھنے کے عمل کو فطری، مقصدی اور قابلِ رسائی بناتا ہے۔

4. **زبان سے بھرپور ماحول کی تشکیل:** زبان سے بھرپور ماحول بچوں کو بتدریج زبان میں روانی کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک ایسی جماعتی فضا تشکیل دی جائے جہاں بچے غیر مانوس زبان کو مختلف طریقوں سے سنیں، دیکھیں اور استعمال کریں۔ مثلاً؛ روزمرہ گفتگو میں زبان کا استعمال، تصویری اور تحریری مواد کی فراہمی، چھوٹے اشعار، لوک کہانیاں، ترانے اور باہمی گفتگو کے مواقع، وغیرہ۔

5. **دباؤ سے پاک، معاون اور حوصلہ افزا ماحول:** زبان سیکھنے کا عمل اس وقت زیادہ مؤثر ہوتا ہے جب بچے خود کو محفوظ، آزاد اور حوصلہ افزا ماحول میں محسوس کریں۔ اس لیے؛

* غیر مانوس زبان میں روانی کی فوری توقع نہ رکھی جائے؛
* رسمی جانچ یا فوری درستگی سے اجتناب برتا جائے؛
* غلطیوں کو سیکھنے کا موقع سمجھا جائے، نہ کہ ناکامی؛
* استاد دوستانہ، معاون اور تشویق انگیز رویہ اختیار کریں۔

خلاصہ: زبان اور خواندگی کی تدریس تعلیم کے بنیادی مرحلہ کی اساس ہے، جس پر بچے کی سیکھنے، سوچنے، اظہار کرنے اور سماجی تعلق قائم کرنے کی ساری صلاحیتوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی سماج میں، جہاں بچے مختلف زبانوں، ثقافتوں اور لسانی پس منظر سے آتے ہیں، وہاں زبان کی تدریس صرف لسانی مہارت کی منتقلی کا عمل نہیں بلکہ ایک کثیر جہتی اور حساس تدریسی چیلنج بھی ہے۔ قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی تعلیم 2022 یہ واضح کرتا ہے کہ زبان محض الفاظ یا جملوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سوچ، معاشرت اور تشخص کی نمائندہ ہوتی ہے۔ خاکہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے زبان کو بچے کی فطری سیکھنے کی بنیاد مانتا ہے اور اس کے فروغ کے لیے سمعی، بصری، جسمانی اور سماجی سرگرمیوں کو لازمی قرار دیتا ہے۔ خاکہ میں ایک اہم بحث خواندگی کے ارتقائی مراحل پر مرکوز ہے، جہاں بچے کی زبان کے ساتھ تدریجی طور پر اس کی رسم الخط، حروف شناسی، صوتیات، اور بامعنی مطالعے کی مہارتیں استوار ہوتی ہیں۔ خاکہ میں واضح کیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں اگر خواندگی کو غیر فطری یا مصنوعی انداز میں پیش کیا جائے تو یہ بچے کی تخلیقی قوت کو دبا سکتا ہے۔ لہٰذا، خواندگی کی تدریس کو زبان کے قدرتی استعمال کے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ خاکہ میں کثیر لسانی تدریسی ماحول کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، جو ہندوستانی سیاق میں انتہائی ضروری ہے۔ مادری زبان، مقامی زبان اور اسکولی زبان کے درمیان ربط و مطابقت پر زور دیا گیا ہے تاکہ بچے کو سیکھنے میں لسانی دشواریاں پیش نہ آئیں۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اساتذہ کو کثیر لسانی تدریسی حکمت عملیوں کو اپنانا چاہیے، جن میں ترجمہ، کوڈ سوئچنگ، اور بین اللسانی گفتگو شامل ہوں۔ ایک اہم نکتہ غیر مانوس زبان کی تدریس سے متعلق ہے، جہاں استاد کو ان بچوں کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے جو تدریسی زبان سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ اس چیلنج کا مؤثر حل ٹی پی آر، تصویری کہانی، سادہ ہدایات، اور قابلِ فہم مواد کے استعمال میں پوشیدہ ہے۔ بچوں کو زبان کی دنیا سے آہستہ آہستہ روشناس کرانے کے لیے دباؤ سے پاک، محفوظ اور دوستانہ ماحول مہیا کرنا ضروری ہے۔ یہ خاکہ زبان کے اساتذہ کے لیے ایک رہنما دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اساتذہ کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ زبان کو محض ایک مضمون کے طور پر نہیں بلکہ بچے کی علمی، تخلیقی اور سماجی ترقی کے وسیلے کے طور پر برتیں۔ خاکہ اس ضمن میں نظری اور عملی دونوں سطحوں پر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

کتابیات/حوالہ جات:

* National Curriculum Framework (School Education) 2023-NCERT, New Delhi.
* National Curriculum Framework for Foundational Stage 2022-NCERT, New Delhi
* قومی تعلیمی پالیسی 2020، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند، اردو ترجمہ، شعبہ نشر و اشاعت امارات شرعیہ پھلواری شریف، بہار
* بھارت کا آئین، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی، 2010
* نجم السحر، صابرہ سعید، تدریس اردو، پریمئر پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد، 2006
* محی الدین قادری زور، تدریس اردو، یونیک بک میڈیا، شرینگر، 2006

■

Dr. Afaque Nadeem Khan
Associate Professor, Department of Educational Studies
Faculty of Education, Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob.: 9981995549
akhan28@jmi.ac.in

محمد ذاکر حسین

غالب اور فریاد کی لے

ادب ماضی سے متاثر ہوتا ہے، حال کی عکاسی کرتا ہے اور مستقبل کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔ اسی بنا پر ادب کو معاشرے کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ تاہم جہاں آئینہ انسان کی ظاہری شکل وشباہت کو ظاہر کرتا ہے وہیں ادب انسان کے اندرونی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ کم وبیش تمام بڑے ادبا اور شعرا کی تخلیقات و نگارشات میں اس کے عکس نظر آتے ہیں۔ اس نظریہ سے اگر دیکھا جائے تو انیسویں صدی کو ہندوستانی ادب کی تہذیبی اور سماجی ترقی کی صدی کہا جا سکتا ہے۔ اس صدی نے آزادی کے ساتھ سماجی اصلاح کو بھی جدوجہد کا موضوع بنایا۔ اس دور کے ادب نے کبھی معاشرے کی بیداری کے لیے اپنی قدیم ثقافت کو عقیدت کے ساتھ یاد کیا ہے تو کبھی ناگہانی حالات پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ غالب نہ صرف اس صدی کے امام تھے بلکہ اُس صدی سے لے کر ادب کی رہتی دنیا تک بلاشرکتِ غیرے ادب کے امام برقرار رہیں گے۔ اُن کے سلسلے میں نثار احمد فاروقی کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے کہ 'شاید ہندستان میں کسی اور زبان کے شاعر کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل پر یکساں گرفت رکھتا ہو۔'[1]

غالب کے احوال کے تعلق سے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی زندگی ہمیشہ نشیب وفراز کی شکار رہی۔ آٹھ نو برس کی عمر تک ان کی زندگی فارغ البالی اور خوش حالی کے ماحول میں ضرور گزری، لیکن بعد کے ادوار مسائل و مشکلات سے پنجہ آزمائی میں گزرے۔ ایک طرف ہندستان کا سماجی اور سیاسی بحران پریشانیوں کا باعث بنا ہوا تھا، تو دوسری طرف اموات اور بدنصیبی نے غالب کی زندگی کو تناؤ سے بھر دیا تھا۔ چنانچہ سات سال کی عمر میں والد کا انتقال، تیرہ سال کی عمر میں شادی، کفالت کرنے والے چچا نصر اللہ بیگ کا سانحۂ ارتحال، سات بچوں کا بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے دینا، اکتیس سال کی عمر میں لے پالک بیٹے عارف کی جدائی، 1857 میں چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی گولی لگنے سے موت، یہی غم کیا کم تھے کہ غالب کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا، جس نے ان کے پورے وجود کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ مرحلہ غالب کے تمام ذہنی اور معاشی مشکلات کا سبب بنا اور وہ اپنی شکست کی آواز بن کر رہ گئے۔ غالب کی زندگی میں حالانکہ ایسا کوئی سال نہیں آیا جو اچھا ہوتا لیکن انھوں نے برے حالات سے نبرد آزمائی کو کبھی ماند نہیں پڑنے دیا۔

دانشوروں کے تعلق سے غالب کا اپنا الگ خیال تھا، جس کا اظہار انھوں نے 1825 کے اواخر میں رائے چھج مل کھتری کو لکھے اپنے خط میں کیا ہے کہ ''دانشوروں کا کام تو آبادیوں سے دور دامنِ کوہ میں خلوت نشینی اختیار کرنا اور شش جہت سے اہلِ دنیا پر اپنے دروازے بند کرنا، جسم کو ریاضت سے گھٹانا اور جان کو عقل و دانائی سے فروغ بخشنا ہے۔ جو شخص صاحبِ عقل وحکمت ہوگا، اس کا کام تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ بے برگ ونوا ہوتے ہوئے گوناگوں حسرتوں کے شکنجے سے باہر آ کر شادمانی وسرخوشی کی راہ پر گام زن ہو جائے۔''[2] لیکن غالب کا یہ خیال ان کی عملی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا ہے، نہ تو انھوں نے آبادیوں سے دور دامنِ کوہ میں خلوت نشینی اختیار کی اور نہ اہلِ دنیا پر اپنے دروازے بند کیے، بلکہ شکست وفتح کی پرواہ کیے بغیر نامساعد حالات کا انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اُن کی زندگی کا یہ رخ خطوط کے ساتھ اُن کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔

عام طور پر غالب کی شاعری کو اُن کے 'خیال' کا عکس سمجھا جاتا ہے، اُن کے 'حال' کا نہیں، حالانکہ اگر اُن کے خیال کے ساتھ ساتھ اُن کے احوال کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو اُن کے اشعار سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس طرح غالب کے خطوط کسی نہ کسی زاویے سے اُن کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان خطوط میں اُس دور کے سماج اور معاشرہ میں رونما ہو چکے واقعات وحادثات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے، اُسی طرح غالب کے کلام میں بھی اس عکس کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے پنشن کے معاملے کو ہی لے لیجیے: نواب

احمد بخش خاں کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خاں کے پسماندگان کا وظیفہ دس ہزار سالانہ مقرر ہوتا ہے، جسے گھٹا کر پانچ ہزار سالانہ کر دیا جاتا ہے اور جس میں غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ متعین ہوتا ہے۔ یہیں سے غالب ذہنی اور معاشی تناؤ میں گھر جاتے ہیں۔ پھر ان کی ساری تگ و دو پنشن میں اضافہ تک محدود ہو جاتی ہے، جو اُن کی ناکامی پر ختم ہوتی ہے۔ اس معاملے میں نواب احمد بخش خاں کے ناروا رویوں اور انگریز افسران کی سرد مہریوں نے غالب کے احساسات و جذبات کو شدید طور پر مجروح کیا، جس کے اثرات اُس دور میں 'فریاد' پر کہے گئے اُن کے اشعار پر صاف طور سے دکھائی دیتے ہیں۔

'فریاد' جو غالب کے کلام میں 'نقش فریادی'،[3] 'گرمیِ وحشت'[4]، 'لغزشِ پا'، 'لکنتِ زباں'[5]، 'مشتِ پر'، 'خار آشیاں'[6] اور 'تقریبِ امتحاں'[7] کی شکل میں نظر آتا ہے، وہی 'فریاد' غالب کے اُس دور کی نجی زندگی کی عکاسی کرتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ کالی داس گپتا رضا کے مرتبہ 'دیوان غالب کامل: تاریخی ترتیب سے' میں 1816 اور 1826 کے درمیان 'فریاد' پر جو اشعار غالب نے کہے، اُن کی تعداد 31 ہے۔ 1826 کے بعد 'فریاد' پر صرف ایک شعر ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب غالب پنشن کے معاملات کو نواب احمد بخش خاں کے توسط سے حل کرانا چاہتے تھے۔ قرض خواہوں کے شدید تقاضوں اور پنشن میں اضافے کی امید نے غالب کی زندگی کو عجیب کشمکش میں ڈال رکھا تھا۔ ہزار آفتوں کے احساس کی شدت میں تپتے ہوئے وہ خدا کے واسطے کا سہارا لے کر شاہ بیکساں سے فریاد پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد

پنشن کے معاملے کی شروعات نواب احمد بخش خاں سے ہوئی تھی، اس لیے 'شاہ بیکساں' سے اس کو خطاب کیا جا رہا ہے۔ 'خدا کے واسطے' کا قرینہ اس بات کی دلالت کر رہا ہے۔ غالب پنشن کے سلسلے میں کافی پریشان ہو گئے تھے اور سچ مانئے تو وہ بیچ چوراہے پر آ گئے تھے، چونکہ انھیں 'فریادِ جرس کی تاثیر' کا احساس ہے اس لیے وہ اپنی فریاد نواب احمد بخش خاں کے دربار تک پہنچاتے ہیں۔

"

عام طور پر غالب کی شاعری کو اُن کے 'خیال' کا عکس سمجھا جاتا ہے، اُن کے 'حال' کا نہیں، حالانکہ اگر اُن کے خیال کے ساتھ ساتھ اُن کے احوال کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو اُن کے اشعار سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔

"

نالاں ہو اسد تو بھی سرِ رہ گزر پر
کہتے ہیں کہ تاثیر ہے فریادِ جرس کو

غالب اپنی فریاد نواب احمد بخش خاں کے دربار تک پہنچا تو دیتے ہیں، لیکن جلد ہی انھیں اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ جاگیرداروں کی کرم فرمائی اتفاقیہ بات ہے، ورنہ عام طور پر غمگین دلوں کی فریاد اُن کی دیوار سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہے۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟

پنشن کے سلسلے میں فریاد کا جو سلسلہ غالب نے نواب احمد بخش خاں کے دربار سے وابستہ کر رکھا تھا، وہ کسی طور امید افزا نہیں لگ رہا تھا۔ چنانچہ غالب پچھلی کارروائیوں پر اپنے دیدۂ تر کو یاد کرتے ہیں اور رسوائی دل کی پرواہ کیے بغیر فریاد کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن دل و جگر کو تشنۂ فریاد پا کر جرأتِ فریاد کا شکوہ کرتے ہوئے، اس کشمکش میں پڑ جاتے ہیں کہ کس طور فریاد کا آہنگ نکالا جائے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

آہ وہ جراتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

فریاد اسد غفلتِ رسوائی دل سے
کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں

جب غالب نے میر امام علی کو اپنی عرضداشت کے ساتھ نواب احمد بخش خاں کی خدمت میں بھیجا تھا اور مرزا علی بخش بہادر کو سخت تاکید کی تھی کہ " جب یہ عرضداشت پیش ہو اور پڑھی جائے، اس وقت تمھیں بھی اس انجمن میں موجود ہونا چاہیے تاکہ تم میری نگارش کو گزارش سے تقویت بخشو اور میر امام علی کو حوصلہ ملے۔"[8] اُس وقت اُن کے دوست احباب نواب احمد بخش خاں سے براہ راست ملنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اس کا اظہار غالب نے مرزا علی بخش بہادر کے نام لکھے اپنے خط میں کیا ہے:۔ "میرے دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ میں نواب صاحب سے خود کیوں نہیں ملتا۔ یہ ممکن نہیں کہ نواب صاحب میری چارہ گری اور کار برآری پر آمادہ نہ ہوں۔ فی الحال جو کچھ میں کر رہا ہوں، وہ ان ادا ناشناسوں کی زباں بندی کے لیے ہے۔"[9] غالب نے نواب احمد بخش خاں تک اپنی فریاد

پنشن کے معاملے میں غالب فریاد کی آہنگ تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس طرح نالہ نَے کا پابند نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی۔

پہنچانے کے لیے جن جن واسطوں کا سہارا لیا، وہ سارے ناکام ثابت ہوئے اور غالب کو یہ احساس ہوا کہ اس معاملے میں بڑی سخت دلی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اور کہسار میری فریاد کو گئے کی ناتوانی کا ساز سمجھ بیٹھا ہے۔ چونکہ نواب احمد بخش خاں پنشن کے معاملے میں بڑی تنگ نظری اور سخت دلی سے کام لے رہے تھے۔ اگر 'کہسار' سے نواب احمد بخش خاں مراد لے لی جائے جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

زبانِ شوخ کا دل سخت ہوگا کس قدر یا رب
مری فریاد کو کہسار سازِ عجز نالی ہے

اتنی کوششوں کے باوجود جب امید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تو اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر غالب فلکِ ناانصاف سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں آہ و فریاد سے چھٹکارا مل جائے۔ اس لئے وہ آہ و فریاد سے رخصت کے طلب گار دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقام پر فریاد کے ساتھ آہ کا درد بھی شامل ہوگیا ہے۔

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

پھر غالب سوالیہ انداز میں اپنے دل کو تسلی دیتے ہیں کہ عشاق کی بے حوصلگی سے کیوں ڈرتے ہو لیکن اس احساس کے ساتھ کہ موجودہ مسند نشیں (نواب احمد بخش خاں) اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ کسی کی فریاد سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

پنشن کے معاملے میں غالب فریاد کی آہنگ تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس طرح نالہ نَے کا پابند نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی۔ اب اس فریاد میں آہ کے ساتھ نالہ بھی شامل ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے تلخ تجربہ غالب کا مقدر بن گیا تھا اور اسی تلخ تجربے نے انھیں احساس دلایا کہ جس طرح نالہ بانسری کا محتاج نہیں ہوتا، اسی طرح فریاد کا کوئی مخصوص رنگ و آہنگ نہیں ہوتا۔ بانسری بجاتے وقت سروں کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے، ورنہ وہ بے سُری ہو جائے گی۔ اس کے برعکس فریاد دل سے نکلتی ہے اور طبعی غم انگیزی سے وہ تاثر پیدا کرتی ہے جو کوئی سُر اور تال پیدا نہیں کرسکتا۔ غالب، نواب احمد بخش خاں کے حضور میں ہر طرح سے فریاد کر کے دیکھ چکے تھے، لیکن وہ کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ تبھی انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

نواب احمد بخش خاں نے پنشن کے سلسلے میں غالب کے ساتھ جو ناروا سلوک کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے غالب کا دل برداشتہ ہونا لازم تھا، جس کا اظہار انھوں نے مرزا علی بخش بہادر کے نام لکھے اپنے خط میں کیا ہے کہ "نواب صاحب نے بہت طفلِ تسلیاں دیں اور وہ اندازِ ستم روا رکھا جو التفات معلوم ہوتا تھا۔ اس سلوک نے مجھے گمراہ کیا۔ اب اس پر تا کے صبر کروں اور اس ناہوت میں کب تک خوش رہوں۔"[10] صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب یہ تصور کر بیٹھے تھے کہ غالب میرے علاوہ اور کہاں جا سکتا ہے، اس کی رسائی اور کہیں نہیں ہوسکتی، کیونکہ غالب میں فریاد کی طاقت ہی نہیں رہی۔ غالب اسی سوچ کا مخول اڑاتے ہوئے کہتے ہیں۔

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں؟

پنشن کا جو معاملہ نواب احمد بخش خاں کے دربار سے شروع ہوا تھا، وہ اب انگریز حاکموں کی دہلیز تک پہنچ چکا ہے، لیکن ان کی دہلیز بھی سخت مٹی کی بنی ہوئی نکلی، لیکن کہتے ہیں جہاں چاہ ہے، وہاں راہ ہے۔ غالب کی در بدری اور اُن کی پریشانیاں دیکھ کر ایک انگریز افسر مسٹر انڈریو اسٹرلنگ (Andrew Sterling) ان کا ہمدرد بن کر آیا۔ غالب نے اپنے ایک فارسی خط میں اس کا ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "یہاں کے افسرانِ بالا میں ایک بڑا حاکم ہے گورنر جنرل کی کاؤنسل سے قریبی رشتہ ہے، داد خواہوں کے فریادناموں کو وہ اراکین کاؤنسل تک اور حاکمانِ کشور کے فرمانوں کو فریاد کرنے والوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ انگریز افسر میرا ہمدرد ہے اور میرے حالِ زار پر نظر رکھتا ہے۔ جب اس نے میری فریاد کو سنا، تو میرے اوپر رحم کھایا اور کہا اگر تم نہیں جاسکتے، نہ جاؤ، صرف مقدمہ کے کاغذات دلی بھیج دو۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا ہوا اور کیسے ہو۔ اگر نہ ہوتو کہاں جائیں ہوتو کیونکر ہو۔"[11] مسٹر انڈریو اسٹرلنگ (Andrew Sterling) کی کرم فرمائی سے متاثر ہو کر غالب نے اس کی شان میں 55 بیت کا ایک قصیدہ لکھا تھا اور قصیدہ کے آخر میں اپنا حال بھی درج کیا تھا۔[12] اب اس پس منظر میں یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تیرے بیمار پہ ہیں فریادی
وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں

'فریاد' سے متعلق مذکورہ بالا اشعار کو غالب کے 'خیال' کے ساتھ ساتھ اُن کے 'حال' کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اگر غالب کے 'خیال' پر محمول کرتے ہوئے ان اشعار پر غور کیا جائے تو یہ 'فریاد' کسی

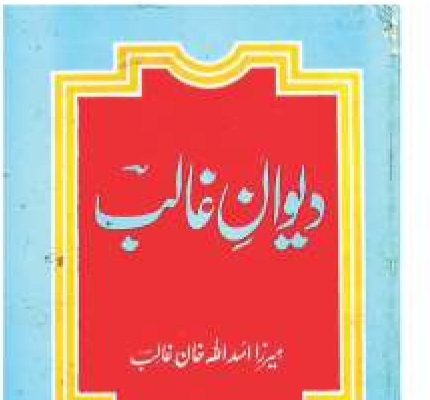

ایک شخص سے ہی نہیں بلکہ بارگاہ الٰہی سے بھی منسوب ہو جاتی ہے۔ اس سے قطع نظر اگر ان اشعار کو غالب کے 'حال' کو پیش نظر رکھ کر ان سے غالب کی زندگی کے نشیب و فراز کے جو عکس ابھرتے ہیں، اس کی نشاندہی

کی جائے تو ان کے حال کے عین مطابق ہوگا۔ فریاد کو پنشن کے معاملات سے جوڑ کر اس لئے بھی دیکھا جانا چاہیے کہ غالب نے خود اپنے خطوط میں پنشن سے متعلق عرضداشت کو فریاد نامہ کی توضیحات سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ”ہر آئینہ صورت یہ ہے کہ میں نے ایک عرضداشت جو میرے بیس سالہ ماجرے پر مشتمل ہے اور میرے فریاد نامہ کی توضیحات کا حاصل ہے۔“ 13 مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کو اپنی روداد سناتے ہیں کہ ”مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ میرا 'داد نامہ' کونسل کی سماعت و پیشی کے لائق قرار پایا۔“14 ایک انگریز افسر کی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ”جب اس نے میری فریاد کو سنا، تو میرے اوپر رحم کھایا۔“15

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ جس دور میں یہ اشعار کہے گئے اُس عہد میں حق طلبی اور مطالبے کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ کسی بھی چیز کی حصولیابی فریاد اور دادخواہی پر ہی منحصر تھی۔ غالب نے اس حقیقت کے پیش نظر پنشن کے معاملات کو نواب احمد بخش خاں سے لے کر انگریز کے اعلیٰ حکام تک پہنچایا اور اس معاملے میں فریاد اور دادخواہی کی راہ اپنائی۔ کامیابی تو ملی نہیں، لیکن غالب یہ درس دے گئے کہ حالات کتنے ہی ناموافق ہوں، ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہونا چاہیے۔ خاص طور سے وہ معاملہ جس سے ہماری عزت اور ہمارا وقار جڑا ہوا ہو۔ پنشن کا معاملہ غالب کی نظر میں صرف اضافۂ پنشن تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ ان کی عزت و آبرو اور وقار کا معاملہ بن گیا تھا، جس سے کسی صورت پیچھے نہیں ہٹا جاسکتا تھا۔

جہاں تک اشعار کے معانی کے اطلاق کا تعلق ہے تو شعر کے الفاظ سے جتنے بھی معانی برآمد ہوسکیں، وہ لائق اعتنا ہوتے ہیں اور یہ اس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب اس شعر میں معنی کے امکانات کی کثرت ہو۔ مختلف زمانوں اور مختلف تناظر میں جو شعر بامعنی نظر آئے، وہی شعر بڑا کہلاتا ہے اور بڑے شعر کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ ہر طور سے بامعنی نظر آئے۔ اس ذیل میں شمس الرحمٰن فاروقی نے دو اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ”کسی شاعری کی فہم اسی وقت مکمل ہوسکتی ہے جب ہم اس شعریات سے واقف ہوں جس کی روشنی میں وہ شاعری خلق کی گئی ہے اور جس کی رو سے وہ بامعنی ہوتی ہے۔“16 ”میں خود اس بات کا قائل ہوں

38 سال غالب کے ذہن ودماغ پر پنشن کا قضیہ چھایا رہا۔ یہ 38 سال کس کرب میں گزرے، اس کا اندازہ غالب کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان خطوط کی روشنی میں غالب کی شاعری سے بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

کہ شعر کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اس کے باریک ترین معنی تلاش کریں اور جتنے کثیر معنی شعر میں ممکن ہوں، ان کی دریافت کریں۔“17

4 مئی 1806 سے 27 جنوری 1831 تک تقریباً پچیس سال غالب کی زندگی پنشن کے معاملات میں الجھی رہی اور اسی تعلق سے وہ تین برس دلّی سے دور بھی رہے۔ یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ 1844 تک وہ مسلسل اپیل کرتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پنشن کے سلسلے میں ابتدائی فیصلہ برقرار رہا اور اس میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔ 38 سال غالب کے ذہن و دماغ پر پنشن کا قضیہ چھایا رہا۔ یہ 38 سال کس کرب میں گزرے، اس کا اندازہ غالب کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان خطوط کی روشنی میں غالب کی شاعری سے بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس 38 سال کی مدت میں زندگی کے حقائق اور سماجی اطوار سے غالب کا براہ راست سامنا ہوا۔ اسی کا ایک تلخ تجربہ فریاد کی صورت میں ان کے کلام میں رونما ہوا۔ جب غالب جیسی عظیم شخصیت کا امرا اور حکام اعلیٰ نے پاس نہیں رکھا تو عوام کا کون پرسان حال ہوتا۔ غالب نے فریاد کے اشعار کے توسط سے اس دور کے سماج کی اسی ناہمواری کو اجاگر کیا ہے کہ چاہے جتنی عاجزی سے اپنی فریاد پیش کریں، اس کی شنوائی نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے اشعار سے عہد غالب کے سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔

حواشی

1 غالب کی آپ بیتی رنثار احمد فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 1997، ص 9

2 اوراق معانی: غالب کے فارسی خطوط راردو ترجمہ تنویر احمد علوی، اردو اکادمی، دہلی، 1992، ص 70

3 مکمل شعر ملاحظہ فرمائیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے، پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

4 مکمل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

فریاد سے پیدا ہے، اسد گرمیِ وحشت
بتخالۂ لب ہے جرسِ آبلۂ پا

5 مکمل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

یہ کام دل کریں، کس طرح گمرہاں، فریاد
ہوئی ہے، لغزشِ پا، لکنت زباں، فریاد!

6 مکمل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کمال بندگیِ گل ہے رہنِ آزادی
ز دستِ مشتِ پر و خارِ آشیاں فریاد

7 مکمل شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تغافل، آئنہ دارِ خموشیِ دل ہے
ہوئی ہے محو بہ تقریبِ امتحاں فریاد

8 اوراق معانی، ص 50

9 ایضاً

10 اوراق معانی، ص 49

11 خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری ر تنویر احمد علوی، غالب اکیڈمی، 2004، ص 109

12 اوراق معانی، ص 79

13 خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری ص 107

14 اوراق معانی، ص 80

15 خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری ص 109

16 تفہیم غالب رشمس الرحمٰن فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 1989، ص 15

17 ایضاً ص 16

■

Dr. Mohd Zakir Husain
Khuda Bakhsh Library
Patna- 800004 (Bihar)
Mob.:9199702756
zakirkbl@gmail.com

محمد محمود عالم

اردو افسانے کے بدلتے رجحانات

اردو میں افسانہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ظہور میں آیا اور بیک وقت دو متوازی رجحانات کے ساتھ آیا، یعنی ایک رومانیت اور تخیل پرستی کا رجحان اور دوسرا حقیقت پسندی اور اصلاح پسندی کا رجحان۔ ایک طرف سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے رومانوی اور تخیلی اسکول سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار ہیں تو دوسری طرف پریم چند اسکول کی حقیقت پسندی کا تتبع کرنے والے فنکار اور یہ سچ ہے کہ دورِ آغاز میں اردو افسانہ کے رومانی میلان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ رومانی افسانہ نگاروں نے حسن و عشق کو مرکز توجہ بنائے رکھا اور خوابوں اور ماورائی تصورات کی بنیاد پر اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں رومانی کیف و کشش کی فراوانی تھی، لیکن اس کے اثرات مجموعی طور پر محدود رہے۔ 'خارستان وگلستان' کے خالق سجاد حیدر یلدرم 'طوق آدم' کے خالق سلطان حیدر جوش، 'کیوپڈ وسائیکی' کے خالق نیاز فتح پوری، 'سمن پوش' کے خالق محمد علی ردولوی نے اردو افسانے کے جس رومانی اسلوب کی روایت کی تشکیل کی اس میں عورت، فطرت اور حسن ومحبت ہی کے عناصر کو تفوق حاصل تھا۔ ہر چند کہ سجاد حیدر یلدرم نے جو افسانے لکھے ان میں صرف داستانوی رنگ ہی نہیں بلکہ زندگی کے متعدد مسائل نے بھی جگہ پائی ہے۔ انسانی نفسیات اور جنس جیسے مسئلہ پر بھی یلدرم نے لکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کا ذکر شمس الرحمن فاروقی کے یہاں ان لفظوں میں ہوا ہے:

''ان کی تاریخی اہمیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کئی میدانوں میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ افسانے میں وہ پریم چند سے پہلے 'ادب لطیف' کہی جانے والی نثر میں نیاز فتح پوری پر مقدم ہیں اور مزاح میں ان کا اثر پطرس کے یہاں جابجا نظر آتا ہے۔''

(افسانے کی حمایت میں، ص185و ص186)

یلدرم کی دنیا اپنے داخلی تنوع کے باوجود بہر حال رومان ومحبت ہی کی دنیا رہی اور ماورائیت کے حصار سے باہر نہ آسکی اور عقلیت آشنا اور حقیقت پسندانہ نہیں بن سکی۔ اردو افسانے کا یہ خالی، مگر ضروری گوشہ جس فنکار کے قلم سے پر ہوسکا، وہ منشی پریم چند ہیں۔ پریم چند نے اردو افسانہ کو عقلیت اور مقصدیت کی نئی جہت سے آشنا کیا، اپنے عہد کے ماحول ومعاشرت کو بڑی کامیابی کے ساتھ افسانے میں انگیز کیا۔

پریم چند کی روایت کو پریم چند کے عہد میں اور اس کے بعد جن افسانہ نگاروں نے آگے بڑھایا، ان میں علی عباس حسینی، راشد الخیری، اعظم کریوی، سدرشن، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، اپندر ناتھ اشک، حامد اللہ افسر، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر، احمد علی، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے اسمائے گرامی بطور خاص اہم ہیں۔

اردو افسانے کے ابتدائی دور کا دو متوازی رجحان ہی نہیں بلکہ ادبی و سیاسی تحریکات ومیلانات کے ساتھ اس میں آنے والی فکری وفنی تبدیلیاں یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ آج کا جدید افسانہ کسی حادثہ کی طرح سامنے نہیں آیا بلکہ اس نے ایک طویل اور پر پیچ سفر طے کیا ہے۔ 1930 سے پہلے اردو فن پاروں پر انگریزی کا اثر بہت نمایاں تھا۔ کئی ایک مشہور ادیب انگریزی، فرانسیسی، روسی اور ترکی ادب کے شہپاروں کو اردو کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرنے لگے تھے۔ ایسے ادیبوں میں سجاد حیدر یلدرم، جلیل احمد قدوائی، منصور علی، نیاز فتح پوری، سید بشیر الدین، خواجہ منصور حسن، عبدالمجید سالک، ظفر علی خاں اور محمد مجیب کے نام اہم ہیں۔

1932 میں اردو ادب اور خاص طور پر اردو افسانہ ایک نئے موڑ سے آشنا ہوا۔ انگریزوں کی استحصالی پالیسیوں کے نتیجے میں ابھرنے والی بے چینی اور بے اطمینانی، غیر ملکی حکمرانوں سے نفرت اور غلامی کا طوق اتار پھینکنے کے عزم نے ادیبوں کے احساسات پر تازیانے کا کام کیا۔ نتیجتاً ایک نئی تحریک 'ترقی پسند تحریک' کے نام سے وجود میں آئی، اس تحریک کا شعوری طور پر آغاز 1932 میں 'انگارے' سے ہوا۔ احمد علی کے مرتبہ اس افسانوی مجموعہ کے بیشتر افسانوں میں نظریاتی اعتبار سے مارکسی ازم اور موضوعاتی اعتبار سے فرائڈ کے نظریے کے اثرات نمایاں ہیں۔

'انگارے' کا شائع ہونا تھا کہ ادبی دنیا کے ساتھ موجودہ معاشرے میں بھی ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ 'انگارے' کے افسانوں کا موضوع دراصل حقیقی زندگی کا جرأت مندانہ اظہار تھا۔ زندگی کی قدروں کی پامالی، رجعت پسندی، قدامت پسندی، سیاسی اور اخلاقی قدروں کی پامالی جیسے موضوعات ان افسانہ نگاروں کو بغاوت پر

آمادہ کرنے کا سبب بنے فکر و خیال میں حقیقت پسندی کی شدید آنچ کے ساتھ ساتھ جنسی زندگی اور تلذذ کے جذبہ کی شمولیت کہیں کہیں اتنی بڑھ گئی کہ افسانے کی عبارتیں اور فقرے ابتذال، رکاکت اور عامیانہ پن کی صورت اختیار کر گئے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ 'انگارے' کے خلاف شدید ردعمل ہوا، حکومت وقت نے دفعہ 295 الف تعزیرات ہند کے تحت 25 مارچ 1933 کے سرکاری گزٹ میں ایک اعلان کے ذریعہ 'انگارے' کو ضبط کرلیا۔

ترقی پسند تحریک کی اس بنیاد نے جو بالواسطہ طور سے 'انگارے' کے ذریعے رکھی گئی تھی، رفتہ رفتہ ملک کی دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا، لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر اردو زبان پر پڑا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس تحریک کے راہ نماؤں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو خود اردو زبان میں لکھتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں کا ایک پورا قافلہ اس تحریک میں شامل ہوگیا۔ یہاں تک کہ منشی پریم چند کا افسانہ 'کفن' جب 1935 میں شائع ہوا تو ترقی پسند افسانہ نگاروں کے لئے ایک نئی اساس بن گیا۔

اپریل 1936 میں ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تو اس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور اپنی صدارتی تقریر میں ترقی پسند نظریے کی بڑی تفصیل سے وضاحت کی اور اس بات پر زور دیا کہ:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب سونا موت کی علامت ہوگی۔''

(رسالہ 'زمانہ' کانپور، اپریل 1936)

پریم چند کی بھر پور کوششوں اور سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کی مسلسل تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے نوجوان شاعر اور ادیب اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ ان میں کرشن چند، بیدی، مجاز و مخدوم، احتشام حسین، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں صرف مرد افسانہ نگاروں نے ہی نہیں بلکہ خواتین افسانہ نگاروں نے بھی چونکا دینے والی کہانیاں لکھیں۔ عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، تسنیم سلیم چھتاری، صدیقہ بیگم سیوہاروی، سرلا دیوی وغیرہ نے ترقی پسند افسانے کو خوب خوب آگے بڑھایا۔ ان میں کچھ کہانیاں بحث کا موضوع بھی بنیں کیونکہ کچھ تو بات نئی تھی، کچھ کہنے کا ڈھنگ نیا تھا۔ اس دور میں صرف روایتی طرز کی نہیں بلکہ ایسی کہانیاں بھی لکھیں جن میں پلاٹ نہیں تھے صرف کردار تھے، ایسی کہانیاں بھی تخلیق کی گئیں جو صرف چند لمحوں کے تاثر کی عکاسی کرتی تھیں۔ ایک کردار کو لے کر بھی کہانیاں لکھی گئیں اور ایک چھوٹے واقعہ کی بنیاد پر بھی کہانیوں کے تانے بانے بنے گئے۔ طویل کہانیاں بھی لکھی گئیں اور منی کہانیاں بھی۔ رپورتاژ بھی لکھے گئے اور قصباتی اور تاثراتی کہانیاں بھی تخلیق کی

آزادی کے بعد اردو افسانے میں ایک اور رحجان آیا جو مخصوص تہذیبی اقدار اور جاگیر دارانہ نظام کے خاتمہ سے تعلق رکھتا ہے .جاگیر دارانہ نظام کی زوال آمادہ قدروں سے متعلق ردعمل جن افسانہ نگاروں نے پیش کیا ان میں سہیل عظیم آبادی (الائو, بھابی جان), قاضی عبدالستار (پیتل کا گھنٹہ), رضو باجی, قرۃالعین حیدر (پت جھڑ کی آواز, ہائوسنگ سوسائٹی, نظارہ, درمیان), جیلانی بانو (موم کی مریم, نروان, فصل گل جو یاد آئی) کا ذکر ناگزیر ہے.

گئیں۔ جن میں جوائس اور ورجینا وولف سے متاثر ہو کر شعور کی رو کی تکنیک اپنائی گئی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے جدید افسانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نیا افسانہ زیادہ تر شہروں کی تشنج زدہ زندگی اور اس کے کرب و محرومی کی داستان ہے۔ اس انسان کی داستان جسے شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی کا تجربہ ہے جس کی روح میں کرب ہے، خلا ہے، بے نام دکھ ہے۔'' (جدید اردو ادب، محمد حسن)

حصول آزادی کے ساتھ برصغیر کی تقسیم نے بھی کئی برسوں تک اردو افسانے کو شدت سے متاثر کیا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت پر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، عصمت، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، عزیز احمد، انتظار حسین، کلام حیدری، خدیجہ مستور، شکیلہ اختر، جوگندر پال اور ممتاز مفتی اہم ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد کے افسانے ایک طرح سے ماضی کی یاد ہیں جہاں انسانی قدروں کی مٹنے کی داستانیں ہیں اور انسان کے ایک دم وحشی ہوجانے کی تصویریں یا ایسے کتبوں کی تحریریں جنھیں افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے ماضی کے مقبروں پر نصب کردیے ہیں۔

اس کے بعد علاقائی تہذیبوں کی تصویر کشی کا ایک رجحان ابھرا۔ احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ اور اشفاق احمد نے پنجاب کے دیہات میں رہنے والے سیدھے سادے، لیکن بانکے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے تو انور عظیم اور سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانوں میں صوبہ بہار کی زندگی کے بڑے نفیس خاکے ابھارے ہیں۔ غیاث احمد نے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی بڑی حقیقی تصویریں پیش کی ہیں۔ جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے دکن میں رہنے والوں اور اس علاقے کی تہذیب کے بڑے خوبصورت نقش کھینچے ہیں اور اس طرح اردو افسانے نے پنجاب، بہار، دکن اور دوسرے علاقوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب لادیا ہے کہ ہم اردو افسانے کو قومی یک جہتی کا ترجمان کہہ سکتے ہیں۔ کچھ افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے دوسری کہانیوں کے علاوہ اپنے پروفیشن کے بارے میں کچھ بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان میں ممتاز مفتی اور رام لعل اہم ہیں جنھوں نے اساتذہ اور ریلوے کرم چاریوں کے احوال پر کہانیاں لکھیں۔

آزادی کے بعد اردو افسانے میں ایک اور رجحان آیا جو مخصوص تہذیبی اقدار اور جاگیر دارانہ نظام کے خاتمہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کی زوال آمادہ قدروں سے متعلق ردعمل جن افسانہ نگاروں نے پیش کیا ان میں سہیل عظیم آبادی (الاؤ، بھابی جان)، قاضی عبدالستار (پیتل کا گھنٹہ)، رضو باجی، قرۃ العین حیدر (پت جھڑ کی آواز، ہاؤسنگ سوسائٹی، نظارہ، درمیان)، جیلانی بانو (موم کی مریم، نروان، فصل گل جو یاد آئی) کا ذکر ناگزیر ہے۔

1960 کے بعد جدیدیت کے تحت علامتی اور تجریدی افسانہ لکھنے کا رجحان تیز ہوا۔ اردو میں سب سے

پہلے جن لوگوں نے علامتی افسانہ لکھنے میں دلچسپی دکھائی ان میں احمد علی کا نام سرفہرست ہے۔ 'قید خانہ' اور 'موت سے پہلے' اردو کے پہلے کامیاب افسانے ہیں جن میں علامتی فضا موجود ہے۔ کرشن چندر کے افسانے 'دو فرلانگ، لمبی سڑک' اور 'غالیچہ' اور ممتاز شیریں کے افسانے 'دیپک راگ' اور 'میگھ ملہار' بھی علامتی افسانے کے اچھے نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ 'پھندنے' بھی ایک اچھا علامتی افسانہ ہے، جس میں کردار کا تجزیہ علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ اس رجحان کو پروان چڑھانے والوں میں امجد الطاف، جمیلہ ہاشمی، صادق حسین، آمنہ ابوالحسن، بانو قدسیہ خانم مرزا، خالدہ اصغر، بلراج مین را، انتظار حسین، سریندر پرکاش، رتن سنگھ، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، انور سجاد، کلام حیدری، اقبال مجید، منیر احمد شیخ، مشتاق اعجاز راہی، احمد داؤد، سلیم احمد اہم ہیں، لیکن ادب کے چند قاریوں کو علامتی اور تجریدی کہانیاں لکھنے والوں سے شکایت رہی کہ یہ کہانیاں کہانیوں کے معیار کو برقرار نہیں رکھ پاتی ہیں، بقول طیب انصاری:

''جدیدیت اگر رجحان ہے تو یہ رجحان ادب میں صحت مندی کی علامت نہیں ہے اور اگر تحریک ہے تو اس بات کا ثبوت کہ ہمارے فنکار انتشار ذہن کا شکار ہیں۔ جدید افسانے یا تجریدی افسانے اپنے اظہار میں ناکام ہیں اور ان کا المیہ یہ ہے کہ ان افسانوں کا کوئی قاری نہیں ہے۔''

(جدید افسانہ: ہیئت اور مسائل، طیب انصاری، مشمولہ شاعر، بمبئی، افسانہ نمبر 1981، ص 74)

لیکن ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے اپنے قاریوں کو سمجھاتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

''علامتوں میں سوچنا انسان کا پہلا فکری عمل رہا ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ سے زیادہ علامت کی بنیاد فکر اور وجدان پر ہوتی ہے کہ انسان نے تہذیب کے بچپنے سے ہی علامتوں میں سوچنا شروع کر دیا تھا، جب ادب باقاعدہ طور پر معرض وجود میں نہیں آیا تھا اس انداز فکر کی زندہ مثالیں اساطیر ہیں۔ مجرد خیال کو مجسم پیکر میں دیکھنے کی کوشش ہی اساطیر کی تخلیق کا سبب تھا اور علامت بھی ایسی ہی کوشش کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔''

(ماہنامہ نشانات، مالیگاؤں، نومبر 1974، ص 7 تا 9)

1970-75 کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں نے

ہم عصر افسانہ نگار فکر و عمل دونوں اعتبار سے آزاد ہے اور اپنے نظریات خود وضع کرتا ہے اس لیے آج کے افسانوں میں نئے تجربات اور ہیئت و تکنیک پر توجہ دی جارہی ہے۔

اپنے فنی رویے کا دوبارہ جائزہ لیا اور متوازن راہ اختیار کی۔ افسانوں میں حسب ضرورت نئی تکنیکوں کو بھی استعمال کیا گیا اور بیانیہ افسانہ لکھنے پر زور دیا گیا۔ علامتی افسانے بھی لکھے گئے، لیکن انھیں علامتی افسانوں کو کامیابی ملی جن میں کسی نہ کسی سطح پر کہانی پن موجود تھا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں سلام بن رزاق، حسین الحق، شوکت حیات، انور خاں، عبدالصمد، رضوان احمد، شفق، مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

آٹھویں دہائی سے اردو افسانہ ایک نئے دور یعنی پس جدیدیت کے دور میں داخل ہوا۔ یہ دور استحصال، معاشی ناہمواری، عدم استحکام، بے سمتی، شہروں کے پھیلاؤ، آبادی میں بے طرح اضافہ سے پیدا شدہ مسائل، ذہنی تناؤ، کھوکھلے اقدار، غربت، فرقہ واریت کے شباب کا دور تھا، جس سے پیدا شدہ مسائل نے یکسر پورے منظر نامہ کو بدل دیا تھا، چنانچہ اس کے زیر اثر افسانے کے موضوعات میں بھی کافی تبدیلیاں ہوئیں۔ نئے افسانہ نگار عہد نو کے تقاضوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آج کا فنکار موجودہ حالات سے بیزار ہے، لیکن اس میں نئی سمتوں کی تلاش کا حوصلہ ہے وہ صرف انسانی زندگی کی نفسیاتی الجھنوں اور بے چینیوں کا ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ اب نیا افسانہ نگار صرف واقعات و حادثات تک محدود نہ ہو کر انسان کے اندر چھپے ہوئے ازلی و ابدی شیطان کی نشاندہی اور انسان نما شیطان کے اندر چھپی ہوئی خود غرضی، دشمنی، منافقت اور کدورت کو بھی بے نقاب کر رہا ہے اور آنے والے خطرات کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کرا رہا ہے۔

ہم عصر افسانہ صحیح معنوں میں جدید افسانے سے اپنی الگ شناخت متعین کرتا ہے اور مسائل کو نئے انداز سے پیش کرتا ہے۔ ہم عصر افسانہ نگار فکر و عمل دونوں اعتبار سے آزاد ہے اور اپنے نظریات خود وضع کرتا ہے اس لیے آج کے افسانوں میں نئے تجربات اور ہیئت و تکنیک پر توجہ دی جارہی ہے۔ اب جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں ان کے پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ جدید تر کہانیاں اپنے ماحول اور معاشرے سے دوبارہ رشتہ بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ:

''اردو افسانہ نگاروں کو حیات و کائنات کا غائر مطالعہ کر کے اپنی زندگی، مشاہدے اور بصیرت کا ثبوت فراہم کرنا ابھی باقی ہے اور یہ کام شاید کل کا افسانہ نگار کرے گا۔'' (شاعر، بمبئی، ہم عصر اردو ادب نمبر 1977، ص 221)

مختصر یہ کہ اردو افسانے کے لکھنے والوں کا یقیناً، ایک دور تھا جب رومانویت کی فضا سے نکل کر ترقی پسند تحریک کے افق پر اُبھرے اور کئی دہائیوں تک اپنی چمک دمک دکھاتے رہے، پھر وہ وقت گزر گیا اور جدیدیت کو عروج ملا اور اس کا عروج مابعد جدیدیت کی نذر ہوا۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ، لیکن یہ سچ ہے کہ ترقی پسندی کا آفتاب، وہ آفتاب تھا جو ڈوب گیا، مگر شفق چھوڑ گیا۔ ردِ عمل کے طور پر ہی سہی جماعت کے مقابلے میں فرد کو دکھانے کا شعور اسی سے ملا اور سانچے میں توڑ پھوڑ کرنے کے بعد، پھر اسے پرانی ہیئت پر لانے اور پلاٹ سے انحراف کے بعد پھر پلاٹ کی طرف آنے اور کہانی کی واپسی کو قبول کرنے کے حوالے سے لامحالہ طور پر ترقی پسند افسانے کے توسیعی اثرات کا یا استعارے کی زبان میں یوں کہا جائے کہ ڈوب جانے کے بعد بھی اس کے چھوڑے ہوئے شفق کے اُجالوں کا انکار نہیں ہوسکتا اور اردو افسانے کے بدلتے رجحانات اس کے اثر و نفوذ سے یکسر بیگانہ نہیں مانے جاسکتے۔ یہ چراغ سے چراغ جلنے کا عمل ہے اور ہمیں افسانے کے بدلتے میلانات کی معنویت کا معترف بناتا ہے جو آج بھی جاری ہے۔

■

Dr. Mod Mahmood Alam
At. P.O: Sigori
Patna- 801110 (Bihar)
Mob.: 8083837666
mahmood808383@gmail.com

عرفان علی بشر

کلاسیکی اور جدید غزل میں اقدار کی معنوی تبدیلی

غزل اردو ادب کی وہ لطیف ترین صنفِ شاعری ہے جس میں جذبات، احساسات، اور فکری کیفیات کو نہایت اختصار، سادگی اور لطافت سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صنف اپنی پیدائش سے ہی انسان کے داخلی جذبات، عشق کے تجربات، ہجر و وصال کی کیفیات اور روحانی وجدان کی عکاسی کرتی رہی ہے۔ ہر عہد کی غزل اس عہد کے انسان کی فکر اور تہذیبی شعور کی نمائندہ ہوتی ہے، اس لیے غزل کے فکری نظام میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں سب سے نمایاں فرق کلاسیکی اور جدید غزل میں اقدار (Values) کی معنوی تبدیلی کا ہے۔

کلاسیکی اردو غزل میں اقدار کا محور ہمیشہ محبوب کی ذات رہی ہے۔ یہ محبوب کوئی عام انسانی کردار نہیں بلکہ ایک مافوق الفطرت، ناقابلِ رسائی اور تقدیس کا پیکر ہوتا تھا۔ عاشق کی تمام تر فکری و جذباتی توانائی محبوب کی طرف مرتکز ہوتی تھی۔ اس کا درد، اس کی خواہش، اس کی رضا اور اس کا انکار، سب کچھ محبوب سے مشروط ہوتا تھا۔ یار کی موجودگی عاشق کی روحانی معراج کا ذریعہ بنتی تھی، اور اس کے تصور سے ہی غزل کی جمالیاتی اور فکری دنیا تشکیل پاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی شعرا کی غزلیں محبوب کے تصور اور اس کی رمزیت سے بھرپور ہیں۔ اس معشوق کی محبت ایک طرح سے عشقِ مجازی کے پیرائے میں عشقِ حقیقی کی سی معنویت رکھتی تھی۔ بہر حال کلاسیکی غزل میں جن اقدار کو بنیاد بنایا گیا، وہ زیادہ تر عشقِ مجازی، صوفیانہ رمزیت، وفا، ہجر، فنا فی المحبوب، روحانی تسلیم و رضا، شائستگی اور تہذیبی ضبط جیسے عناصر پر مشتمل تھیں۔ محبوب کا تصور ایک مافوق الفطرت، ناقابلِ رسائی اور مقدس ہستی کے طور پر ابھرتا تھا۔ عشق کو ایک آزمائش، ایک باطنی سفر، اور انسانی ذات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس دور کی غزلوں میں ہم ایک دکھی، شکستہ اور درد میں ڈوبا عاشق دیکھتے ہیں، جو محبوب کے قدموں میں فنا ہو جانے کو سعادت سمجھتا ہے۔ میر کا ایک مشہور شعر ہے۔

جب کہ پہلو سے یار اٹھتا ہے
درد بے اختیار اٹھتا ہے
(میر)

یہاں عشق، انکارِ ذات اور مکمل سپردگی کا نام ہے۔ ایسی غزل میں جو اقدار سامنے آتی ہیں، وہ تسلیم و رضا، ضبط، حیا، فقر، اور خلوص کی ہوتی ہیں۔ یہی اقدار ولی، درد، سودا، اور غالب جیسے شعرا کی غزل کو تہذیبی سرمایہ بناتی ہیں۔ ان شعرا کی تخلیقات نے غزل کو محض عشقیہ واردات سے آگے بڑھا کر ایک فکری، سماجی اور تہذیبی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ خاص طور پر غالب کی غزل کلاسیکی اقدار کو جدید فکری تناظر میں پیش کرتی ہے۔ جس سے شاعری میں شعور کی بیداری، فلسفیانہ تفکر اور خود آگاہی کے پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ غالب کی غزل کلاسیکی اقدار کے ساتھ ساتھ عقل و شعور، فلسفہ اور خود آگاہی کے نئے زاویے بھی پیش کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک داخلی سوال اٹھتا ہے، لیکن یہ سوال عشق کی روشنی میں کیا جاتا ہے، جو اس عہد کی ایک قابلِ قبول قدر تھی۔ غالب کہتے ہیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
(غالب)

یہاں شاعر کی داخلی کشمکش، اس کی خواہشات کی شدت اور ناکامی کا شعور موجود ہے، لیکن اس شعور کے پیچھے اب بھی ایک تہذیبی وقار اور غم کی شائستگی قائم ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ کلاسیکی غزل معاشرتی ڈھانچے، تہذیبی شعور اور اخلاقی نظام کے دائرے میں لکھی جاتی تھی۔ اس میں تخیل کی پرواز ضرور ہوتی تھی، لیکن وہ ہمیشہ ایک باوقار تہذیبی نظام کے اندر رہ کر چلتی تھی۔ الفاظ کی ترتیب، استعاروں کی نزاکت، تشبیہوں کی لطافت، اور غم کی شائستگی —— یہ سب کلاسیکی غزل کی جمالیات کا حصہ تھے۔ محبوب کا دراصل ایک رمزیاتی پیکر تھا، جو شاعر کے اندرونی روحانی تجربے اور سماجی تہذیبی شعور دونوں کا آئینہ دار تھا۔ جیسا کہ تنویر احمد علوی نے لکھا ہے:

"کلاسیکی شاعری اجتماعی شعور سے بھی عبارت ہے اور تاریخ و روایت کا سلسلہ اسی سے جڑا ہوا ہے، اور اس میں وہ ذہن بھی شریک ہے جو تاریخ کی تخلیق ہے اور وہ ذہن بھی جس نے علاقائی وحدتوں سے اپنے لیے سوچ کا سامان تیار کیا۔"[1]

غزل کا یہی کلاسیکی سانچا بیسویں صدی میں آ کر مکمل طور پر تبدیل ہو جاتا ہے۔ سیاسی، سماجی، اور تہذیبی منظرنامے میں ایسی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی

ہیں جو نہ صرف انسان کی روزمرہ زندگی بلکہ اس کی داخلی نفسیات، احساسات اور جذباتی نظام کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ نوآبادیاتی سیاست، تحریکِ آزادی، تقسیم ہند کا سانحہ، صنعتی انقلاب، شہری زندگی کی بھیڑ میں تنہائی، فرد کی اجنبیت، طبقاتی تصادم، شناخت کا بحران، مذہبی انتہاپسندی، اور اخلاقی زوال — یہ وہ عناصر ہیں جنھوں نے اردو شاعری، بالخصوص غزل کی ساخت، لہجہ، اور معنوی نظام کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس نئے شعری احساس اور بدلتے ہوئے فکری رویے کا عکس ہمیں غالب، فراق، علی سردار جعفری، ن۔م۔راشد، میراجی، عادل منصوری، ظفر گورکھپوری اور بلراج کومل جیسے شعرا کے کلام میں نظر آتا ہے، جہاں محبت اب ایک مجرد جذبہ نہیں رہتی بلکہ سماجی، سیاسی اور انسانی تناظرات میں ڈھل کر ایک وسیع تر معنویت اختیار کر جاتی ہے۔ فراق کا یہ شعر اس بدلتے ہوئے رجحان کی ایک روشن مثال ہے۔

امید و یاس وفا و جفا فراق و وصال
مسائل عشق کے ان کے سوا کچھ اور بھی ہیں

(فراق)

یہی تبدیلی غزل کی موضوعاتی وحدت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اب محبوب محض ایک مقدس اور ماورائی ہستی نہیں رہا، نہ ہی وہ کوئی ایسا خوابیدہ وجود ہے جو صرف پیکرِ حسن ہو۔ جدید غزل میں محبوب کبھی ایک زندہ انسان ہوتا ہے، جو اپنی کمزوریوں، الجھنوں، شکستگیوں اور خامیوں کے ساتھ جیتا ہے، اور کبھی نظام، سماج، یا خود شاعر کی ذات کا استعارہ بن جاتا ہے۔ محبوب اب ایک آسمانی حقیقت نہیں بلکہ ایک زمینی مسئلہ ہے۔ اس میں تقدیس کی جگہ مایوسی، بے چینی، انکار اور بغاوت نے لے لی ہے۔ ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، خلیل الرحمٰن، شاذ تمکنت، جذبی، مجروح، مظہر امام، ساحر، جاں نثار اور دیگر جدید شعرا کی غزل میں محبوب اکثر ایسا کردار ہوتا ہے جو شاعر کے داخلی کرب کو کسی بڑی اجتماعی سچائی سے جوڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمھیں بھلا دیتے

(خلیل الرحمٰن)

مرا ضمیر بہت ہے مجھے سزا کے لیے
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لیے

(شاذ)

ہر عہد کی غزل اس عہد کے انسان کی فکر اور تہذیبی شعور کی نمائندہ ہوتی ہے، اس لیے غزل کے فکری نظام میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں سب سے نمایاں فرق کلاسیکی اور جدید غزل میں اقدار (Values) کی معنوی تبدیلی کا ہے۔

جاگ اے نسیم خندۂ گلشن قریب ہے
اٹھ اے شکستہ حال نشیمن قریب ہے

(جذبی)

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

(مجروح)

یہ تبدیلی ہمیں اس بات کا شعور دیتی ہے کہ غزل محض ایک شعری صنف نہیں، بلکہ یہ ہر دور کے انسان کی تہذیبی، فکری اور جذباتی حالت کا اظہار یہ بھی ہے۔ جس طرح زمانہ بدلتا ہے، ویسے ہی غزل کی قدریں، اس کے استعارے، اس کے موضوعات اور اس کا لہجہ بھی بدلتا ہے۔ جدید غزل کے شاعر کا محبوب دراصل وہی ہے جو معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور داخلی بحرانوں سے نبرد آزما ہے۔ اس تبدیلی نے اردو غزل کو محض لفظی حسن کا آئینہ نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے فکری اور سماجی حقیقتوں کا بھی آئینہ دار بنا دیا ہے۔ جدید دور میں بدلتے ہوئے عشق کے رویے کے متعلق خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''موجودہ دور میں عشق کا تصور بہت حد تک بدل گیا ہے۔ زندگی کی بھاگ دوڑ اور تیز رفتاری کی بنا پر اس جذبے میں بہت حد تک تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ سب سے پہلے تو وہ جذبہ عشق ہی مفقود ہو گیا جس سے عاشق محبوب پر اپنا دل و جان نچھاور کر دیتا ہے۔ اب ہمارے معاشرے میں حسن و عشق کا تصور بدل چکا ہے۔ اس کے آداب کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ ہاں اس میں ارضیت آ گئی ہے۔ جو کہ ایک سچے عشق کی پہچان ہے۔''[2]

جدید غزل میں اقدار کی معنوی تبدیلی کا عمل محض محبوب کے تصور تک محدود نہیں بلکہ یہ تبدیلی غزل کے اسلوب، زبان، ساخت اور اظہار کی تکنیک تک جا پہنچتی ہے۔ استعارہ اب صرف جمالیاتی مقصد نہیں رکھتا بلکہ طنز، احتجاج، علامت اور تجرید کا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ شاعری اب جمالیات کی پناہ گاہ نہیں بلکہ تجربات کی آگ میں جلتا ہوا ایک احتجاجی اعلان ہے۔ چنانچہ اگر کلاسیکی غزل 'محبوب پر فنا' کا فلسفہ پیش کرتی ہے تو جدید غزل 'فرد کی بقا' اور 'نظام پر سوال' کا شعور بیدار کرتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو تبدیلی ہے، وہ دراصل ایک مکمل فکری اور تہذیبی سفر کی روداد ہے — جو اردو شاعری کی معنویت کو مسلسل وسعت دے رہا ہے۔ جدید شعرا کی غزلوں میں یہ تبدیلی انتہائی شدت کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے یہاں اقدار کا زوال صرف انکار تک محدود نہیں بلکہ شدید طنز، بغاوت اور افسوس میں ڈھل جاتا ہے:

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

(مجروح)

تو کہاں ہے تجھ سے اک نسبت تھی میری ذات کو
کب سے پلکوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں رات کو

(کیفی اعظمی)

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف
جنگ گر لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی

(ساحر)

یہ ایک ایسی دنیا کا بیان ہے جہاں نہ رشتے محفوظ ہیں، نہ اخلاقی اصول باقی، نہ اعتماد، نہ محبت۔ یہاں شاعر کا تجربہ فرد کی اس دنیا سے تعلق رکھتا ہے جہاں اقدار بکھر چکی ہیں، اور وجود ایک اذیت بن چکا ہے۔ جدید دور کی غزلیں کرب کو درد اور خامشی میں ڈھالتی ہیں۔ ان شعرا کے یہاں اقدار کا زوال ہنگامہ خیز بغاوت نہیں بلکہ ایک خاموش ماتم کی شکل اختیار کرتا ہے:

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا

(ناصر کاظمی)

یہاں 'یاد' ایک نئی قدر ہے، جو ماضی کی ایک چھوٹی سی باقیات کے طور پر انسان کے اندر سانس لے رہی ہے۔

جدید غزل میں یاد، تنہائی، بے یقینی، اجنبیت، شکست، اور احتجاج وہ اقدار ہیں جو کلاسیکی اقدار کی جگہ لے چکی ہیں۔فرد اب مرکز میں آچکا ہے۔ وہ فرد جو شکست خوردہ ہے، جس کا نظام پر اعتماد نہیں، جس کا محبوب دھند میں ہے، اور جس کی خواہشات اب ادھوری اور منتشر ہیں۔ یہ فرد داخلی کرب، سیاسی بے بسی، تہذیبی اضمحلال اور سماجی انتشار سے دوچار ہے۔ وہ اپنی تنہائی کا جشن نہیں مناتا، بلکہ اس میں جیتا ہے۔وحید اختر نے اس سلسلے میں بڑی عمدہ بات کہی ہے:

''اس دور نے زخم خوردہ اقدار کے زیر سایا زخم خوردہ شخصیتیں پیدا کیں جو شدید احساس تنہائی کا شکار ہیں۔ ہر روح کے ہاتھ میں اس کا اپنے زخموں کا اعمال نامہ ہے اور دار و گیر عرصہ حشر میں نفسی نفسی کا وہ غل ہے کہ کوئی کسی کی جزا کو نہیں پہنچتا۔ سب ایک ہی غم کے اسیر ہیں، سب کے درمیان درد کا ایک ہی رشتہ ہے، پھر بھی سب کس قدر تنہا ہیں! جدید ادب اسی انفرادی اور اجتماعی احساس تنہائی کی داستان ہے۔''3

جدید غزل میں نسائی شعور کی بیداری بھی اقدار کی معنوی تبدیلی کا ایک بڑا حوالہ ہے۔ کلاسیکی غزل میں عورت کا تصور محبوبہ کی صورت میں مرد شاعر کی نگاہ سے بنتا ہے، جب کہ جدید غزل میں عورت خود بولتی ہے، خود اپنا دکھ، اپنی شناخت، اور اپنی آزادی کی بات کرتی ہے۔خواتین شعرا کی شاعری میں عورت ایک خود شناس ہستی کے طور پر سامنے آتی ہے:

نغمہ و شعر و زباں اہل سیاست کے قتیل
پوری تہذیب کے مٹنے کے نشاں دیکھے ہیں
اقدار ہوس و شور و منافق نظری
جن کا شیوہ رہا وہ پیر مغاں دیکھے ہیں
جلتے بام و در و دیوار سلگتے ہوئے شہر
جن سے پتھرا گئیں آنکھیں وہ سماں دیکھے ہیں

(ساجدہ زیدی)

ساجدہ زیدی کے یہ اشعار ایک گہرے دکھ اور کرب کا اظہار ہیں جو اس عورت کی زبان بن کر ابھرے ہیں جس نے اپنے اردگرد تہذیب کے بکھرتے ہوئے نقش دیکھے ہیں۔ وہ عورت جو محبت اور اقدار کی امین تھی، آج اہل سیاست کے شور، شر، اور زہر آلود زبان سے خائف ہے۔ جنھیں رہنمائی کا منصب حاصل تھا وہ بھی ہوس اور منافقت کے پجاری نکلے۔ اس طرح جدید شاعرات نے بھی زماں اور مکاں کی حدود سے نکل کر خود کو سماج کا فرد مان کر حالات کا جائزہ لیا ہے۔ دکھوں کی داستان کو غم زمانہ میں ڈھال کر پیش کرنا سیکھا ہے۔

جدید غزل کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ اقدار کو مسلمات کی حیثیت سے نہیں دیکھتی بلکہ ان پر سوال اٹھاتی ہے، چنانچہ اب وفا، عشق، سچائی، یا انسانیت جیسے الفاظ کو محض بیان نہیں کیا جاتا بلکہ ان پر سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا یہ اقدار اب بھی باقی ہیں یا محض سماجی دھوکہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں طنز، تمثیل، علامت، تجرید اور انکار کی شعری زبان زیادہ نظر آتی ہے۔اس تبدیلی کو اگر فکری لحاظ سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کلاسیکی غزل ایک منظم، مرتب، اور مانوس دنیا کی نمائندہ تھی، جب کہ جدید غزل ایک بے ترتیب، بکھری ہوئی اور اجنبی دنیا کی عکاسی کرتی ہے۔ دونوں کی دنیا الگ ہے، لہٰذا ان کی اقدار بھی مختلف ہیں۔ ایک طرف محبوب مرکز ہے، تو دوسری طرف فرد کی ٹوٹ پھوٹ۔ ایک طرف تسلیم و رضا ہے، دوسری طرف بغاوت اور سوال۔ گوپی چند نارنگ اس فرق کو یوں بیان کرتے ہیں:

''جدید غزل میں نہ صرف مضامین بدلے ہیں، بلکہ غزل کی داخلی کائنات کا نظام بھی بدل چکا ہے، اب غزل کا شاعر خود مرکز بن چکا ہے اور خارجی دنیا کو اپنی داخلی روشنی سے پرکھتا ہے۔''4

> **غزل محض ایک شعری صنف نہیں، بلکہ یہ ہر دور کے انسان کی تہذیبی، فکری اور جذباتی حالت کا اظہاریہ بھی ہے۔ جس طرح زمانہ بدلتا ہے، ویسے ہی غزل کی قدریں، اس کے استعارے، اس کے موضوعات اور اس کا لہجہ بھی بدلتا ہے۔**

اس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلاسیکی اور جدید غزل میں اقدار کی معنوی تبدیلی محض اسلوب یا موضوعات کی سطحی تبدیلی نہیں بلکہ تہذیبی، فکری اور داخلی شعور کی گہرائیوں سے جڑا ایک ہمہ گیر سفر ہے۔ کلاسیکی غزل ایک ایسے عہد کی نمائندہ ہے جہاں محبت، وفا، ہجر و وصال، تقدیر، تصوف، اور خود سپردگی جیسے عناصر غزل کے مرکزی مضامین ہیں۔ اس میں محبوب ایک مقدس اور ماورائی ہستی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور شاعر کی ذات تسلیم، صبر اور قربانی کا پیکر بن کر ابھرتی ہے۔ کلاسیکی اقدار میں حسن کی پرستش، تقدیر پر ایمان اور روایتی اصولوں کی پاسداری نمایاں ہے۔

اس کے برعکس جدید غزل انکار، سوال اور جستجو کی غزل ہے۔ یہاں محبوب کوئی آسمانی وجود نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی ہستی ہے جس سے محبت کے ساتھ ساتھ سوال بھی کیے جاتے ہیں۔ شاعر صرف عاشق یا صوفی نہیں بلکہ ایک حساس انسان ہے جو سماجی، سیاسی، وجودی و نفسیاتی مسائل سے ٹکراتا ہے۔ وہ اقدار جو کبھی غیر متزلزل سمجھی جاتی تھیں جدید شاعر ان پر سوال اٹھاتا ہے اور ان کی معنویت کو نئے سیاق و سباق میں پرکھتا ہے۔

یہ معنوی تبدیلی اصل میں اردو غزل کے ارتقائی سفر کی غماز ہے۔ کلاسیکی غزل جہاں تسلیم کا استعارہ ہے وہیں جدید غزل تلاش اور احتجاج کی علامت ہے۔ ایک طرف روایت کا جمال ہے تو دوسری طرف انفرادیت کا کرب۔ یہ دو انتہائیں مل کر اردو غزل کو ایک ایسی جہت عطا کرتی ہیں جو اسے ہر دور میں زندہ، متحرک اور معنویت سے بھرپور رکھے گی۔ غزل کا یہی فکری سفر اسے محض ایک صنف سخن نہیں بلکہ تہذیبی شعور کی علامت بنا دیتا ہے۔

حواشی

1. تنویر احمد علوی، کلاسیکی اردو شاعری کے روایتی ادارے، کردار اور علامتیں، شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2006، ص11
2. مظہر احمد، جدید شاعری اور خلیل الرحمٰن اعظمی، شبانہ پبلی کیشنز، دہلی 1989، ص78
3. وحید اختر، تعارف، اسم اعظم: حاصل سیر جہاں، کلیات شہریار، انڈین بک ہاؤس علی گڑھ، 2001، ص2
4. گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی 1990، ص211

■

Irfan Ai Bashar
58/2, Subhash Nagar, Utraula
Distt.: Balrampur- 271604 (UP)
Mob.:9792512148
irfan.ahmad.khan13@gmail.com

ساجد ذکی فہمی

'امراؤ جان ادا' اور مشترکہ تہذیبی عناصر

بحیثیت ناول نگار مرزا محمد ہادی رسوا (1857۔ 21 اکتوبر 1931) کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے ناول کی تاریخ میں انقلاب برپا کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ وہ بیک وقت ناول نگار، شاعر، مترجم، ریاضی داں ہونے کے ساتھ ساتھ علم طب، علم کیمیا، علم ہیئت، منطق اور علم نجوم میں بھی درک رکھتے تھے۔ اس مختصر مضمون میں ہمیں ان کی جملہ تصانیف و تخلیقات یا علوم وفنون سے سروکار نہیں بلکہ ان کے شہرۂ آفاق ناول 'امراؤ جان ادا' میں موجود مشترکہ تہذیبی عناصر کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

مرزا رسوا کی علمیت اور ان کی تخلیقی ذہانت سے انکار ممکن نہیں۔ وہ نہایت ذہین و فطین شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں زبان پر مہارت حاصل تھی۔ 'امراؤ جان ادا' (1899) کے علاوہ انھوں نے چار طبع زاد ناول 'افشائے راز'، 'شریف زادہ'، 'ذات شریف' اور 'خونی شہزادہ' تحریر کیے، لیکن جو شہرت اور مقبولیت 'امراؤ جان ادا' کے حصے میں آئی وہ ان کے دیگر ناولوں کو نصیب نہ ہوسکی۔ ناول میں رسوا نے ایک طوائف کی زندگی کو مرکز بنا کر لکھنوی تہذیب کی عکاسی اس انداز سے کی ہے کہ یہ شہر جیتا جاگتا اور سانس لیتا ہوا ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خانم جان کا کوٹھا ایسا مرکز ہے جہاں شریف النفس، رذیل، نواب، ڈاکو، بوڑھے، جوان، کم سن، مولوی حتیٰ کہ باپ اور بیٹے بھی اپنا کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری جانب رسوا نے ناول میں لکھنؤ کی معاشرت، سماجی زندگی، تہذیب، ثقافت، رسم و رواج، رہن سہن اور نشست و برخاست وغیرہ کا بھی پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

اس عہد کے تاریخی و تہذیبی حالات پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دلّی کی تباہی کے بعد اہل فن کی نگاہ میں لکھنؤ ہی علم وادب کا مرکز ٹھہرا، لہٰذا باکمالوں اور اہل فن نے دلّی سے نکل کر لکھنؤ کی راہ لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ ہر فن کے استاد کا مرکز بن گیا۔ علاوہ ازیں حکومت کی سرپرستی اور دولت کی فراوانی نے لکھنؤ کو تہذیبی اور مذہبی اعتبار سے کافی ثروت مند بنا دیا تھا۔ لوگ بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ مغل حکومت سے علیحدہ ہونے کے بعد لکھنؤ والوں نے دہلوی تہذیب سے الگ اپنی ایک تہذیب یا ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ خواہ وہ آداب مجلس اور نشست و برخاست کے طریقے ہوں یا طعام ولباس اور پوشاک و زیورات کے۔ دوسری جانب نوابان اودھ برعکس مغلوں کے اثنا عشری کے پابند تھے۔ لہٰذا مذہبی معاملات میں انھوں نے جس تصرف سے کام لیا وہ خود شیعیت کی تاریخ میں معدوم دکھائی دیتی ہیں۔ ان تمام باتوں نے مل کر لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت میں ایسی چمک اور جاذبیت پیدا کردی تھی جو اس سے قبل ہندوستان میں کبھی دیکھی نہیں گئی۔ رسوا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے 'امراؤ جان ادا' میں اس مشترکہ تہذیب کا ایسا مرقع پیش کیا ہے جو اس سے پہلے ہمیں رتن ناتھ سرشار کے 'فسانۂ آزاد' میں دکھائی دیتا ہے۔ محمد حسن اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

''سرشار کے فسانۂ آزاد کے طرز پر مرزا محمد ہادی رسوا امراؤ جان ادا کی کہانی کو لکھنوی تہذیب کے پس منظر میں سجاتے ہیں۔ پھر لکھنوی تہذیب کا بھی وہ دور جو اقدار کی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ امراؤ جان ادا اس پس منظر کا ایک لازمی جز ہے۔ ڈاکوؤں کی شورہ پشتی، پرانے نوابوں کی طوائف نوازیاں، عشق و عاشقی کے چرچے اور سب سے بڑھ کر اس دور کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں امراؤ جان ادا میں ہر صفحے میں بکھری ہوئی ہیں۔ یہ جادو ایسا موثر ہے کہ سرشار کے فسانۂ آزاد کے بعد امراؤ جان ادا کو لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا سب سے کامیاب مرقع کہا جاسکتا ہے۔''[1]

ناول کے آغاز میں مشاعرے کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ مشاعرہ ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک اہم جز رہا ہے۔ ہندوستان بالخصوص دلّی اور لکھنؤ میں بادشاہ، نواب، امرا اور رؤسا اس کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ دلّی کی تباہی کے بعد لکھنؤ چونکہ مرجع خلائق بنا ہوا تھا اس لیے شعرا جوق در جوق لکھنؤ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ ناول میں منشی احمد حسین صاحب جو اطراف دلّی سے آکر

لکھنؤ میں آباد ہوئے تھے، اپنے کمرے میں اکثر شعری نشستوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ یہاں احباب اپنے اشعار سناتے اور داد و تحسین وصول کرتے۔ مشاعروں میں داد دینے کا طریقہ بالکل روایتی ہوا کرتا تھا۔ آج بھی لوگ اسی طرز پر قائم ہیں۔ مثال کے طور پر امراؤ جان ایک غزل پڑھتی ہیں جس پر حاضرین داد دیتے ہیں۔ داد دینے کے لیے جن الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:

''حضار جلسہ: واہ وا سبحان اللہ کیا کہنا۔
رسوا: کیا شعر کہا ہے۔
خان صاحب: یہ بھی خوب کہا۔
احباب: غزل از مطلع تا مقطع ایک رنگ ہے۔
آغا صاحب: نشست الفاظ تو ملاحظہ ہو۔
پنڈت صاحب: کیا دُر فشانی کی ہے۔''[2]

مندرجہ بالا اقتباس میں جس طرح شعر کی تعریف کی گئی ہے اس سے شعر کی خوبی یا خامی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے الفاظ مشاعرے کی تہذیب کا حصہ ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ ابتدا سے ہی مشاعروں میں حصہ لینے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہوا کرتے تھے۔ مذہبی اعتبار سے شعرا میں تخصیص نہیں برتی جاتی تھی۔ ہندو اپنی شاعری میں قرآنی تعلیمات اور تلمیحات کا بے جھجک ذکر کرتے تو مسلمان بھی ہندوؤں کے عقائد اور ان کی رسومیات کا برملا اظہار کیا کرتے تھے۔ منشی احمد حسین صاحب کے کمرے میں منعقد ہونے والے اس مشاعرے میں بھی ایک پنڈت جی موجود ہیں۔ ان کی موجودگی ہندوستان کی اس مشترکہ تہذیب کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صدیوں کے میل جول سے پیدا ہوئی تھی۔

شعر و شاعری کے ساتھ گیت سنگیت بھی ہماری گنگا جمنی تہذیب کی پہچان رہے ہیں۔ امیر خسرو، سورداس، تان سین اور ان جیسے نہ جانے کتنے اشخاص کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے اس فن کو ترقی دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مغلوں کے عہد میں اس فن نے کافی ترقی کی۔ نوابانِ اودھ بھی فن موسیقی سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں جب دولت کی فراوانی کی وجہ سے زنان بازاری کا زور بڑھا اور ہر گلی کوچے سے ناچنے اور گانے کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوئیں تو لوگ

کسی ملک یا خطے کی تہذیب، تمدن اور ثقافت کو سمجھنے کے لیے لباس و زیورات سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ ابتدا سے ہی ہندوستانی عورتوں میں خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، زیورات کے استعمال کا رواج کثرت سے رہا ہے۔

اس فن کی طرف زیادہ سرعت کے ساتھ متوجہ ہوئے۔ طوائفوں کے کوٹھے میں چونکہ ناچ گانے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس لیے طوائفوں کا اس فن میں کامل ہونا ضروری خیال کیا گیا۔ ناول میں خانم جو کوٹھے کی نائکہ ہے وہ بھی اس فن میں مہارت رکھتی ہیں۔ ایک جگہ غلط درس دینے پر سنگیت کے استاد کی کس طرح گرفت کرتی ہیں ملاحظہ فرمائیں:

''ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں (امراؤ جان) سوہا گا رہی ہوں۔ خانم بھی موجود ہیں میں نے استاد جی سے پوچھا، گندھار اس میں کومل ہے یا ات کومل۔
استاد جی: ات کومل
خانم: خاں صاحب ماشاءاللہ یہ میرے سامنے؟
استاد: کیوں؟
خانم: اور پھر آپ مجھی سے پوچھتے ہیں کیوں۔ سوہا میں گندھار ات کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہیے۔
استاد: کہنے لگے۔ گندھار کومل لگ گئے۔
خانم: بس آپ ہی قائل ہو جیے۔ خود آپ کومل کہیں اور چھوکری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کستے ہیں؟ خاں صاحب میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں گلے سے نہ ادا ہو مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا۔ میں بھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔''[3]

مندرجہ بالا اقتباس میں جس قسم کے گیت، سُر یا تال کی بات ہو رہی ہے وہ خالص ہندوستانی تہذیب کے مظہر ہیں۔

امراؤ جان ادا میں رسوا نے طوائفوں کے بہت سے رواج و رسومیات کا ذکر کیا ہے۔ ان ہی میں سے ایک رسم کو 'مِسّی' کہا جاتا ہے۔ یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی ہے جب کوئی طوائف ناچ، گانے، سُر اور تال غرض کہ ہر اعتبار سے کامل ہو جاتی تھی۔ اس رسم کے ادا کیے جانے کے بعد اس طوائف کو کسی مرد کے ساتھ منسلک کر کے اس کا کمرہ علیحدہ کر دیا جاتا۔ یعنی اب اس کے کمرے میں باقاعدگی کے ساتھ مردوں کا آنا جانا شروع ہو جاتا تھا۔ اس رسم کی ادائیگی کے وقت ناچ گانے، کھانے پکانے اور تحفے تحائف بھی پیش کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ طوائفوں میں اس رسم کو بڑی دھوم دھام سے منانے کا رواج تھا۔ خانم کی بیٹی بسم اللہ جان کی جب مِسّی ہوئی اس وقت کا ایک منظر امراؤ جان کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''بسم اللہ کی مِسّی بڑے دھوم سے ہوئی۔..... دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لیے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی شہر کی رنڈیاں، ڈوم ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی، دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی تک سے آئے تھے۔ سات دن سات رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔''[4]

مذکورہ اقتباس میں 'مِسّی' تو خالص ہندوستانی رسم ہے ہی اس کے ساتھ بارہ دری کا لفظ بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ بارہ دری دراصل لکھنوی ثقافت کی پہچان ہے۔ لکھنؤ میں چھوٹی بڑی کئی بارہ دریاں موجود تھیں۔ یہ ایک ہال کی مانند ہوا کرتی تھیں۔ اس میں بارہ دروازے ہوتے تھے۔ اسی مناسبت سے اسے بارہ دری کہا جاتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں ان بارہ دریوں میں لوگ آرام بھی کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مختلف قسم کے جلسے اور مذہبی رسومات کے لیے بھی ان بارہ دریوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ ان بارہ دریوں کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں مذہبی تفاوت کا کوئی دخل نہیں تھا۔

کسی ملک یا خطے کی تہذیب، تمدن اور ثقافت کو سمجھنے کے لیے لباس و زیورات سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ ابتدا سے ہی ہندوستانی عورتوں میں خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، زیورات کے استعمال کا رواج کثرت سے رہا ہے۔ مانگ کا ٹیکا، گلے کا ہار، کان کی

بالی، ناک کی نتھیا، چوڑی، کنگن، کمر بند، انگوٹھی، دستانہ، پائل، گھنگرو یا پازیب وغیرہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنی حیثیت کے مطابق استعمال کرتے آئے ہیں۔ دولت کی فراوانی کی وجہ سے لکھنؤ والوں نے لباس اور زیورات کے استعمال میں مزید مرصع سازی سے کام لیا۔ رسوا ایک جگہ خانم جان کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لباس اور زیورات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

''.....کیا شاندار بڑھیا تھی.....ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی.....ململ کا دوپٹہ سفید کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید، اودے مشروع کا پیجامہ بڑے بڑے پائنچے، ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے، کانوں میں سادی دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔''[5]

اب ایک اقتباس میں مولوی صاحب کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں:

''...مولوی صاحب کا نورانی چہرہ سفید کترواں داڑھی۔ صوفیانہ لباس، ہاتھ میں عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، خاک پاک کی تسبیح، اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی، ہرولی کی جریب، چاندی کی شام بہت ہی نفیس۔ ڈیڑھ خمہ حقہ۔ افیون کی ڈبیہ پیالی۔''[6]

درج بالا اقتباس میں مولوی صاحب کا جس طرح حلیہ بیان کیا گیا ہے وہ بھی خاص لکھنوی تہذیب کی دین ہے۔ اس کے علاوہ خاک پاک کی تسبیح اور اس میں سجدہ گاہ کا بندھا ہونا ان کے شیعہ عقائد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا تھا کہ لکھنؤ میں شیعیت کا غلبہ تھا اور رسوا خود بھی شیعہ تھے اس لیے ''امراؤ جان ادا'' میں ہمیں جگہ جگہ ان عقائد اور رسومات کا ذکر ملتا ہے جو براہ راست شیعہ عقائد سے تعلق رکھتے ہیں۔ افیون کی ڈبیہ سے رسوا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ جب مولوی حضرات تک افیون کے عادی تھے تو عوام الناس کا ذکر ہی کیا۔

زیورات اور لباس کے علاوہ کھانے پینے کی اشیا سے بھی کسی ملک کی ثقافت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مغل جب ہندوستان میں وارد ہوئے اور یہاں بود و باش اختیار کی تو مقامی لوگ ان نئے پکوانوں سے آشنا ہوئے جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اسی طرح یہاں کھائی اور بنائی جانے والی چیزوں نے بھی مغلوں کو متاثر کیا۔ اس میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قسم کے نئے پکوانوں کا تجربہ کیا گیا۔ لکھنؤ والوں نے دسترخوان پر سجائی جانے والی اشیا میں جس جدت طرازی اور مرصع سازی سے کام لیا تاریخ میں اس کی مثال اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ دراصل اس کے پیچھے دلّی کی تہذیب سے خود کو بہتر اور منفرد ثابت کرنے کا عمل کارفرما تھا۔ عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب

مغل جب ہندوستان میں وارد ہوئے اور یہاں بود و باش اختیار کی تو مقامی لوگ ان نئے پکوانوں سے آشنا ہوئے جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اسی طرح یہاں کھائی اور بنائی جانے والی چیزوں نے بھی مغلوں کو متاثر کیا۔

'گذشتہ لکھنؤ' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ رسوا نے اس ناول میں ایک جگہ دستر اخوان پر چنے گئے انواع و اقسام کے کھانوں کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بورانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقر خانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربّے، مٹھائیاں، دہی، بالائی، غرض کے ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔''[7]

اس قسم کے کھانوں کا ذکر رسوا نے کئی جگہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں بہت سے برتنوں کے استعمال کو بھی دکھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کنول، پیچوان، پان دان، پیک دان، سلفچی، تسلہ، رکاب اور لوٹا وغیرہ۔ ان سے بھی مشترکہ تہذیبی وراثت پر روشنی پڑتی ہے۔

عرب جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو ان کے یہاں ایک سے زائد شادیوں کا رواج تھا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کے یہاں شادی ایک ہی بار کی جاتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ شادی سات جنموں تک برقرار رہے گی۔ یعنی کسی صورت بھی شوہر اور بیوی کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں کے یہاں شادی کے وقت پر کرتی کو گواہ بنایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ طویل مدت تک رہنے کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر بھی یہ چیزیں آہستہ آہستہ سرایت کر گئیں۔ مذہبی اعتبار سے اگرچہ مسلمانوں میں ایک سے زائد شادیوں کی اجازت باقی رہی لیکن سماجی طور پر اسے بُرا سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں کی طرح مسلمان عورتیں بھی شوہر یا اپنے سسرال کے ہاتھوں ہزار ہا تکالیف برداشت کرنے کے بعد بھی علیحدگی اختیار کرنا گوارا نہیں کرتیں۔ آپ اسے بھلے ہی ان کی شریف النفسی سے تعبیر کریں لیکن یہ ہماری مشترکہ تہذیبی وراثت کا نتیجہ ہے۔ رسوا ایسے ہی تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانے کی عورتوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے امراؤ جان ادا کی زبانی کہلواتے ہیں:

''...کیا تمھیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بے چاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں، ہزار ہا قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں۔ اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں مگر برے وقت میں بے چاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

...گھر کی عورت کیسی ہی خوبصورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہو، بے وقوف مرد بازاریوں پر جو ان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں، فریفتہ ہو کر انھیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لیے ترک کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی قسم کا جادو ٹونا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آجاتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے اس لیے کہ وہ اس حال میں اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں بلکہ بدکار عورتوں کو ہی مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔''[8]

درج بالا اقتباس میں عورتوں کے جذبۂ ایثار اور محبت کی جو بات کی گئی ہے وہ برصغیر کی عورتوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ ہندوؤں کے یہاں پتی چونکہ پرمیشور کا درجہ رکھتا ہے اس لیے اس کے خلاف کچھ کہنا یا اس کو لعن طعن کرنا ہندو عورتوں کے لیے زیبا نہیں۔ اس قسم کے واقعات ناولوں کے علاوہ خود ہمارے سماج میں بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں جہاں بیوی سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کیے رہتی ہے۔ یہ رویہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے یہاں یکساں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ صدیوں تک ساتھ رہنے کی وجہ سے دونوں کے

لکھنؤ کے محرم، چہلم، میلے ٹھیلے، تیج تہوار، بازار، مختلف قسم کے لباس اور زیورات، انواع و اقسام کے کھانے، رسم و رواج اور عقائد و رسومات، شرفا کی گفتگو، طوائفوں کا ناز و انداز، رذیلوں کی ہنگامہ آرائی، ڈاکوؤں کی شورہ پشتی، مصاحبوں کی عیاری اور بانکوں کے عشق وغیرہ کا مفصل ذکر اس ناول میں موجود ہے۔

بہت سے عقائد اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب ان کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا ممکن نہیں۔

لکھنؤ کا ذکر آئے اور میلوں ٹھیلوں کی بات نہ ہو تو لکھنؤ کا پورا نقشہ ابھر کر سامنے آ ہی نہیں سکتا۔ محرم اور چہلم کے جلوس، میلوں ٹھیلوں کا منظر، خوانچے والوں کی پکار، اوباش قسم کے لڑکوں کی دھما چوکڑی، انواع و اقسام کے کھانے، کرتب بازیاں، مختلف قسم کی پالیاں اور نہ جانے کتنی ہی چیزیں تھیں جنھوں نے لکھنؤ کو قابل دید بنا رکھا تھا۔ سرشار نے 'فسانۂ آزاد' میں اور عبدالحلیم شرر نے 'گذشتہ لکھنؤ' میں ان تمام چیزوں کو مفصل بیان کیا ہے۔ رسوا نے بھی اپنے ناولوں میں لکھنؤ کے میلوں اور محرم و چہلم کا ذکر بڑے پُر تپاک انداز میں کیا ہے۔ عیش باغ کا میلہ جو نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میلے میں وہ بھیڑیں تھیں کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں، خوانچہ والے، میوہ فروش، ہار والے، تنبولی، ساقنیں غرض کہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ تھا..... ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تنزیب کے انگر کھے اور اودی صدری، نکہ دار ٹوپی، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اترائے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں صندلی رنگا ہوا دوپٹہ سر سے آڑا باندھے ہوئے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ..... ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں۔ کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ ناک میں ننھی سی نتھنی ہے، اونچی چوٹی گندھی ہوئی، لال شالباف کا موباف پڑا ہے، ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں۔ کلائیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں اتار نہ لے۔

لیجیے دوسرے صاحب ایک اور ان کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں..... معمولی گالی گلوج کے بعد ملاقات سلام بندگی، مزاج پرسی بے تکلف دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔ اے پان تو کھلوا، لطف تو یہ کہ آپ مسلمان یار ہندو۔''9

اس اقتباس میں تنزیب کے انگر کھے، اودی صدری، نکہ دار ٹوپی، مخملی چڑھویں جوتے، دوستوں میں بے تکلف گالیاں اور پان کا کثرت سے استعمال ہندوستانی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میں جو منظر بیان کیا گیا ہے اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی تخصیص دکھائی نہیں دیتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے جلسے جلوس اور میلوں ٹھیلوں میں برابر شریک ہوا کرتے تھے۔ رسوا نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے کہ پان کھانے والا مسلمان تو پان کھلانے والا ہندو۔ یعنی یہاں کوئی بھید بھاؤ اور مذہبی رشتہ کشی نہ تھی۔

مختصر یہ کہ مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنے ناول 'امراؤ جان ادا' میں خانم جان کے کوٹھے کو مرکز بنا کر اودھ کی مشترکہ تہذیب کی بہترین عکاسی کی ہے۔ لکھنؤ کے محرم، چہلم، میلے ٹھیلے، تیج تہوار، بازار، مختلف قسم کے لباس اور زیورات، انواع و اقسام کے کھانے، رسم و رواج اور عقائد و رسومات، شرفا کی گفتگو، طوائفوں کا ناز و انداز، رذیلوں کی ہنگامہ آرائی، ڈاکوؤں کی شورہ پشتی، مصاحبوں کی عیاری اور بانکوں کے عشق وغیرہ کا مفصل ذکر اس ناول میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں امراؤ جان اور رام دئی کی دوستی یا منشی احمد حسین صاحب کے گھر مشاعرے میں پنڈت جی، آغا صاحب، رسوا اور امراؤ جان میں بے تکلفی کا منظر ہماری مشترکہ تہذیبی وراثت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ رسوا نے 'امراؤ جان ادا' میں اودھ کی تہذیب کی عکاسی کی ہے لیکن بغور اس تہذیب کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ بھی دراصل ہماری مشترکہ تہذیبی روایت کا ہی حصہ ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رسوا نے ناول 'امراؤ جان ادا' میں اودھ کے زیر سایہ پورے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی عکاسی کی ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

حواشی

1. امراؤ جان ادا، مرزا محمد ہادی رسوا، تعارف: محمد حسن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1997
2. امراؤ جان ادا، مرزا محمد ہادی رسوا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1997، ص 20 اور 22
3. ایضاً، 1997، ص 60
4. ایضاً، ص 72
5. ایضاً، ص 54
6. ایضاً، ص 63
7. ایضاً، ص 188
8. ایضاً، ص 224
9. ایضاً، ص 39-138

Dr. Sajid Zaki Fahmi
Assistant Professor , Department of Urdu
Hiralal Bhakat College, Nalhati
Birbhum (West Bengal)
Mob.: 9990121625
sajidzakifahmi@gmail.com

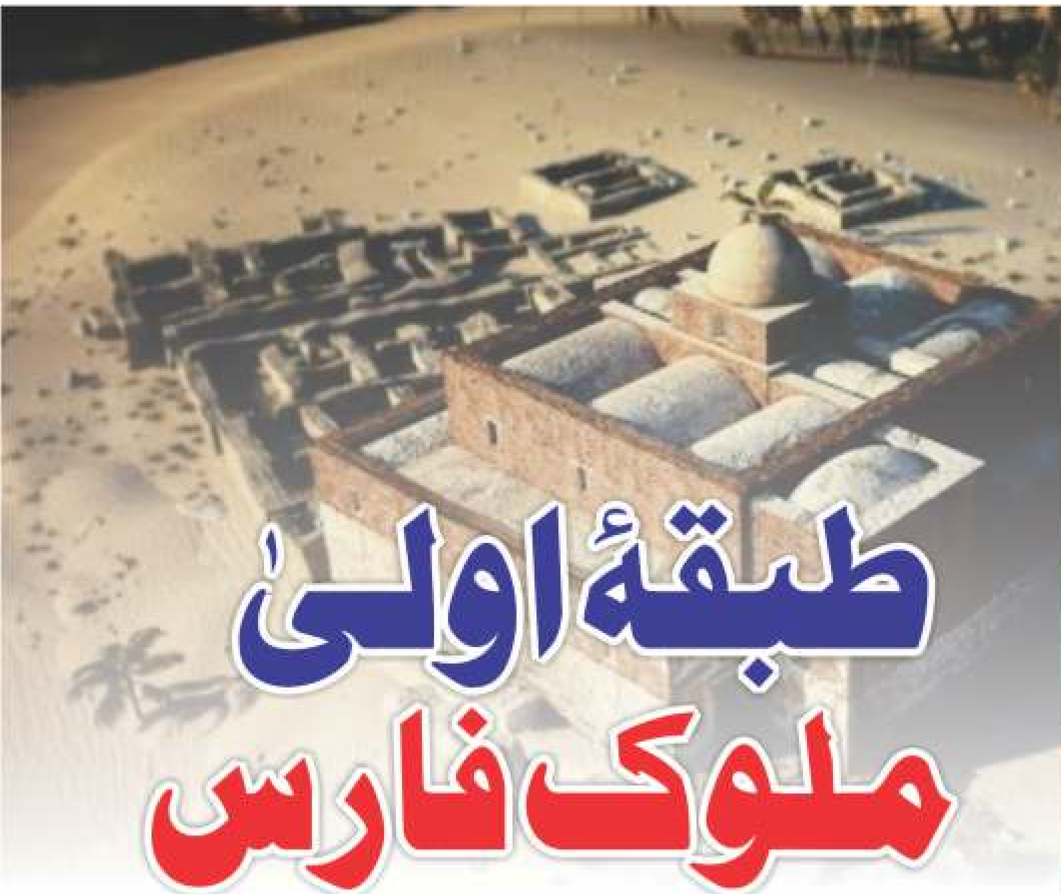

مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی
مرتب: محمد صہیب

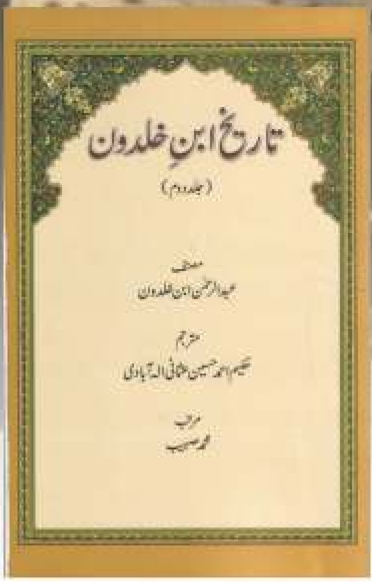

طبقۂ اولیٰ ملوک فارس

کیومرث

کل علمائے فارس اس امر پر اتفاق کر رہے ہیں کہ کیومرث ہی آدم علیہ السلام ہیں اور ان کا لڑکا منشا نامی تھا اور منشا کا سیامک اور سیامک سے افروال پیدا ہوا اور سیامک کے افروال کے علاوہ چار لڑکے اور چار لڑکیاں اور تھیں، لیکن کیومرث کا نسلی سلسلہ صرف افروال سے چلا اور باقیوں کے اعقاب منقطع ہو گئے، جن کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ افروال بن سیامک کی صلب سے اوشہنک پیشداد (ہوشنگ) پیدا ہوا۔ افروال کیومرث کے ملک کا وارث ہوا اور اس نے اقالیم سبعہ پر حکومت کی۔

طبری بہ روایت ابن کلبی کہتا ہے کہ اوشہنک بن عامر [عابر][1] ابن شالخ ہے اور پھر وہی کہتا ہے کہ اہل فارس کا یہ دعویٰ اور خیال ہے کہ اوشہنک دو سو برس بعد آدم علیہ السلام کے ہوا اور نوح علیہ السلام بعد آدم علیہ السلام کے دو سو برس بعد [کذا] ہوئے۔ اسی بنا پر اہل فارس نے اوشہنک اور نوح کو ایک شخص قرار دیا ہے لیکن اس نے [طبری نے] اس سے اختلاف اور اس کا انکار کیا ہے کیونکہ اوشہنک کی شہرت اس غلط واقعے کے مخالف ہے۔

بعض علمائے فارس یہ کہتے ہیں کہ اوشہنک پیشداد مہلائل ہے اور اس کا باپ افروال قینان ہے اور سیامک انوش اور منشا شیث[2] اور کیومرث آدم علیہ السلام ہیں۔

بعض علمائے فارس یہ بیان کرتے ہیں کہ کیومرث کومر بن یافث بن نوح کو کہتے ہیں۔ یہ نہایت معمر اور مُسن تھا، اپنے باپ سے علاحدہ ہو کر جبل دنباوند (ملک طبرستان) میں آ کر مقیم ہوا اور اس کا مالک بن بیٹھا۔ بعد ازاں فارس پر قبضہ حاصل کیا اور ایک عظیم الشان بادشاہ ہوا، اس نے بہ حالت حیات اپنے لڑکوں کو اطراف و جوانب کی طرف بھیجا اور انھوں نے بابل کو لے لیا۔ کیومرث ہی نے سب سے پہلے شہر اور قلعے بنوائے اور گھوڑوں کو سواری کے لیے پسند کیا۔ یہ آدم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس نے لوگوں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اس کو اس نام سے پکاریں۔ اہل فارس اس کے لڑکے ماذاے کی اولاد سے ہیں۔ ابتدائے زمانہ سے اسی کی اولاد کی کیانیہ اور کسرویہ میں حکومت رہی تا آنکہ حکومت فارس کا خاتمہ ہوا۔

ہوشنگ

اہل فارس یہ روایت کرتے ہیں کہ اوشہنک ہی مہلائیل ہے اور اس نے ہند پر قبضہ حاصل کیا تھا اس کے بعد طہمورث بن انوجہان بن انکہد بن اسکہد بن اوشہنک بادشاہ ہوا۔ بعضوں نے بجائے اسکہد کے فیشداد لکھ دیا ہے اور در حقیقت یہ کل اسما عجمی ہیں، اسی وجہ سے اور نیز اصولاً روایت منقطع ہونے کے سبب سے ہم ان کی صحت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

طہمورث

ابن کلبی لکھتا ہے کہ طہمورث[3] بابل کا پہلا بادشاہ ہے اور اس نے ہفت اقلیم پر حکومت کی اور یہ نہایت نیک طینتی سے حکومت کرتا تھا اور منصف تھا۔ اسی کے 10[4] جلوس میں بیوراسپ ظاہر ہوا اور اس نے مذہب صابیہ کی بنیاد ڈالی۔

جمشید

علمائے فارس کہتے ہیں کہ طہمورث کے بعد جمشید[5] تخت نشین ہوا۔ اس کے معنی ہیں: شجاع یا شعاع شمس۔ یہ طہمورث کا حقیقی بھائی تھا، یہ بھی ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا اور نہایت نیک سیرت اور عادل تھا۔ پھر بعد چندے ظالم اور جابر ہو گیا، اس کی موت سے ایک برس پہلے بیوراسپ نے اس پر خروج کیا اور گرفتار کر کے آرے سے چیر ڈالا اور بعضے یہ کہتے ہیں کہ جمشید نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا، اس وجہ سے پہلے اس پر اس کے بھائی استو[6] نے خروج کیا لیکن ناکامیاب رہا، تب بیوراسپ اٹھا اور اس نے جمشید کی حکومت کا قلع قمع کر دیا اور سات سو برس تک حکومت کرتا رہا۔ ابن کلبی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

ضحاک

طبری کہتا ہے کہ بیوراسپ[7] کو ازدہاک کہتے ہیں، جس کو عرب ضحاک کے نام سے موسوم کرتے ہیں،

یہ وہی شخص ہے جس کا ذکر ابونواس شاعر کے اس شعر میں ہے۔

وکان منا الضحاك تعبده الـ
حامل و الجن فی محاربها

(ضحاک ہم میں سے تھا، جس کی عبادت اونٹ والے (یعنی روسا) اور جن (یعنی بدوی) اپنی محرابوں میں کرتے تھے۔)8

اور پھر طبری ہی روایت کرتا ہے کہ عجم کا یہ خیال ہے کہ جمشید نے اپنی بہن کا عقد اپنے خاندان میں سے کسی کے ساتھ کر دیا تھا اور اس کو یمن کا حاکم مقرر کیا تھا، اس سے ضحاک پیدا ہوا، چنانچہ اہل یمن ضحاک کا نسب یوں بیان کرتے ہیں: ''ضحاک بن علوان بن عبیدہ بن عویج۔'' اس نے اپنے بھائی سنان بن علوان کو مصر کا بادشاہ کر کے بھیجا تھا، جو ابراہیم علیہ السلام کا فرعون تھا، اور اہل فارس ضحاک کا نسب اس طرح لکھتے ہیں: ''بیوراسپ (ضحاک) بن رتیکان بن ویدوشنک بن فارس بن افروال۔'' اور بعضے اس کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے ہفت اقلیم پر بادشاہت کی، یہ ساحر اور کافر تھا، اس نے اپنے باپ کو مار ڈالا اور یہ اکثر بابل میں رہتا تھا۔

ہشام کی روایت ہے کہ ضحاک کے بعد جمشید بادشاہ ہوا، یہی ابراہیم علیہ السلام کا نمرود ہے اور اہل فارس کا نواں بادشاہ ہے، جبل دنباوند میں پیدا ہوا تھا۔

> ضحاک نہایت مستعد اور بہادر تھا، جب اس نے ہند پر فوج کشی کی اور خود لڑائی پر گیا تو افریدون نے اس کے زمانۂ عدم موجودگی میں اس کے ملک پر قبضہ کر لیا اور بہ وقت مراجعت ضحاک اور افریدون میں لڑائی ہوئی۔

ضحاک نہایت مستعد اور بہادر تھا، جب اس نے ہند پر فوج کشی کی اور خود لڑائی پر گیا تو افریدون نے اس کے زمانۂ عدم موجودگی میں اس کے ملک پر قبضہ کر لیا اور بہ وقت مراجعت ضحاک اور افریدون میں لڑائی ہوئی۔ ضحاک کا ادبار9 آ گیا تھا، وہ ان لڑائیوں میں افریدون کے ہاتھ گرفتار ہو کر جبل دنباوند میں قید کر دیا گیا اور اس کی گرفتاری اور اس پر فتح یابی کے دن کو عید کا دن مقرر کیا، لیکن اہل فارس یہ بیان کرتے ہیں کہ شاہی خاندان جس میں حکومت چلی آ رہی تھی وہ اوشہنک اور جمشید کا تھا اور ضحاک یعنی بیوراسپ نے ان پر خروج کیا اور فتح یاب ہوا۔ اس نے بابل آباد کیا اور نبطیوں سے اپنی فوج تیار کی اور اہل عالم پر بہ زور سحر غالب آیا۔

افریدون

اصفہان کا ایک شخص عالی (کابی حداد) نامی اس کی مخالفت پر اٹھ کھڑا ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ تھا، جس پر اس نے جراب لٹکا کر جھنڈا10 بنایا اور لوگوں کو ضحاک کے برخلاف ابھار کر اس سے لڑا، جب ضحاک میدان جنگ سے بھاگا تو اس کی رائے سے بنی جمشید میں سے افریدون کو تخت نشین کیا۔ افریدون نے تخت پر بیٹھتے ہی ضحاک کا تعاقب کیا اور اس کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔

افریدون زمانۂ نوح علیہ السلام میں تھا، شاید اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ افریدون ہی نوح علیہ السلام تھے۔ لیکن تحقیق یہ ہے، جس کو ہشام بن کلبی نے نسابین فارس سے نقل کیا ہے کہ افریدون جمشید کی اولاد سے ہے، ان دونوں میں نو پشتوں کا فرق ہے، اس نے دو سو برس سلطنت کی اور ضحاک کی کل مظالم اور غصب کی ہوئی چیزیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیں۔

اولاد افریدون اور تقسیم سلطنت

افریدون نے اپنی حالت حیات ہی میں ملک کو اپنے تین لڑکوں میں تقسیم کر دیا۔ بڑے لڑکے سرم (سلم) کو روم، شام اور مغرب دیا، طوج (تور) کو ترک اور چین دیا، ایرج کو عراق، ہند اور حجاز دیا11۔ افریدون کے مرنے کے بعد سرم (سلم) اور طوج (تور) نے مل کر ایرج کو لڑ کر مار ڈالا اور اس کے ملک کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ اہل فارس یہ خیال کرتے ہیں کہ افریدون اور اس کے اوپر کی دس پشتیں ''اشکیان'' کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایرج کے دو بیٹے وندان اور اسطوبہ اور ایک لڑکی خورک نامی تھی، جو [وندان اور اسطوبہ] بعد مرگ افریدون اپنے باپ ایرج کے ساتھ مارے گئے، اسی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ افریدون نے پانچ سو برس حکومت کی اور اسی نے ثمود اور نبط کے آثار سواد سے محو کیے۔

'کَے' لقب کی ابتدا

ابتداً اسی [افریدون] نے اپنے کو 'کَے' کے لقب سے ملقب کیا اور کَے افریدون کے نام سے مشہور ہوا۔ 'کَے' کے معنی ہیں تنزیہ (یعنی مخلص اور متصل روحانیات سے) اور بعضوں نے اس کے معنی اور بھی بہت کچھ بیان کیے ہیں۔

منوشہر

چند دنوں کے بعد منوشہر (منوچہر) بن منشخر بن ایرج نے زور پکڑا، یہ افریدون کی نسل سے تھا، اس کی ماں اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے تھی، اس نے سن شعور کو پہنچ کر اپنے چچوں [چچاؤں] سے لڑائی کی اور ان کو مار کر بادشاہ بن بیٹھا اور بابل کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ فارس کو دین ابراہیمی کی طرف مائل کیا۔

پھر افراسیاب بادشاہ ترک نے اس پر چڑھائی کی اور بابل کو اس سے چھین لیا اور طبرستان تک اس کا تعاقب کرتا چلا گیا۔ جب طبرستان بھی منوشہر (منوچہر)

کو پناہ نہ دے سکا تو وہ طبرستان چھوڑ کر عراق کی طرف چلا گیا اور افراسیاب نے طبرستان پر قبضہ کرلیا۔

افراسیاب

افراسیاب کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ طوج (تور) بن افریدون کی نسل سے تھا، جس وقت منوشہر نے طوج (تور) کو قتل کیا اور اس کے خاندان پر تباہی آئی اس وقت یہ چھپ کر بلادترک میں چلا گیا اور وہیں اس نے نشو ونما پائی اور انھیں کے ملک سے خروج کیا؛ اسی وجہ سے افراسیاب ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ طبری کہتا ہے کہ جب منوشہر بن منشور مرگیا تو افراسیاب بن اشک بن رستم بن ترک نے بابل پر قبضہ کرلیا اور مملکت فارس کو تہ و بالا کردیا۔

زومر

اس کے بعد زومر (زوایازاب) بن طہمارست (طہماسپ) اور بہ روایت دیگر راسپ بن طہمارست نے افراسیاب پر خروج کیا۔ زومر بن طہمارست نو واسطے سے منوچہر کی طرف نسباً منسوب کیا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ طہمارست اپنے باپ سے علاحدہ ہوکر بلادترک میں چلا گیا تھا اور وہیں اس نے عقد کرلیا تھا، جس سے زومر پیدا ہوا اور سن شعور کو پہنچ کر افراسیاب کی مخالفت پر اٹھا اور لڑکر اس کو سلطنت فارس سے نکال دیا اور افراسیاب ترکستان کو چلا گیا۔ زومر نے اس فتح یابی کے دن کو 'عیدمہرجان' کے نام سے مشہور کیا۔

منوشہر کے مرنے کے بارہ برس کے بعد زومر کا فارس پر قبضہ اور تسلط ہوا۔ یہ نہایت نیک سیرت، صلح پسند اور امن دوست تھا۔ اس نے بابل کی بگڑی ہوئی حالت اور افراسیاب کی خراب کی ہوئی آبادی کو ازسرنو بارونق بنایا، اس نے سواد میں نہر زاب نکالی اور اس کے کنارے پر شہر بسایا اور اس کا نام 'زواہی' رکھا، ہر طرح کے درخت، پھول، پھل کے لگائے، طرح طرح کے کھانے ایجاد کیے، غنیمت کو اہل لشکر پر تقسیم کیا۔

کرشاسپ

کرشاسپ 12 (گرشاسپ) طوج بن افریدون کی اولاد سے اور بہ روایت دیگر اولاد منوشہر سے ہے اور اس کا نائب تھا۔ اہل فارس میں یہ ایک عظیم الشان شخص گذرا ہے، لیکن بادشاہ نہیں ہوا اور بادشاہت زومر بن طہمارست کرتا تھا۔ زومر اپنی حکومت کے تیسرے سال مرگیا۔ اس کے زمانے میں بنی اسرائیل تیہ سے نکلے

منوشہر کے مرنے کے بارہ برس کے بعد زومر کا فارس پر قبضہ اور تسلط ہوا۔ یہ نہایت نیک سیرت، صلح پسند اور امن دوست تھا۔ اس نے بابل کی بگڑی ہوئی حالت اور افراسیاب کی خراب کی ہوئی آبادی کو ازسرنو بارونق بنایا، اس نے سواد میں نہر زاب نکالی اور اس کے کنارے پر شہر بسایا اور اس کا نام 'زواہی' رکھا، ہر طرح کے درخت، پھول، پھل کے لگانے، طرح طرح کے کھانے ایجاد کیے، غنیمت کو اہل لشکر پر تقسیم کیا۔

تھے اور یوشع نے اریحا کو فتح کیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ملوک فارس کے دوسرے طبقے کی حکومت کا سلسلہ چلا جن کا پہلا بادشاہ کیقباد ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس طبقے کا زمانۂ حکومت دو ہزار چار سو ستر برس رہا، جیسا کہ بیہقی اور اصفہانی نے تحریر کیا ہے، اور ان کے بادشاہوں میں سے صرف انھی نو بادشاہوں کو ذکر کیا ہے جن کو طبری نے لکھا ہے۔ واللہ وارث الارض ومن علیہا۔ [اللہ تعالیٰ زمین اور اس پر لبنے والوں کا مالک ہے۔]

حواشی و ماخذ

1 عربی نسخوں میں 'عائذ' ہے۔ دارالفکر 2:182، دارالکتب العلمیہ 2:178۔ [م۔ص]

2 امام غزالی لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے شیث علیہ السلام کو امور دین کا والی مقرر کیا تھا اور کیومرث کو دنیاوی حکومت کا افسر بنایا تھا۔ واللہ اعلم۔ [مترجم]

3 طہمورث نہایت نیک مزاج تھا، یہ اپنے دادا کی چال چلا، روزہ رکھنے کا حکم دیا، فارسی میں کتابت کی اور امر الٰہی کا پابند تھا، چالیس برس بعد مرگیا۔ [مترجم]

4 عربی متون میں '1 جلوس' ہے۔ دارالفکر 2:183، دارالکتب العلمیہ 2:178۔ [م۔ص]

5 جمشید نے ریشم کیڑوں سے نکالا، کاتب اور دربان مقرر کیے، نوروز کو عید کا دن ٹھہرایا۔ [مترجم]

6 دارالفکر 183:2 / دارالکتب العلمیہ 178:2 کے نسخوں میں 'استویز' ہے۔ [م۔ص]

7 بیوراسپ جمشید کا عامل تھا، اس نے اپنے زمانۂ حکومت میں ٹیکس، محصول مغنی، ملاحی نکالے، سولی دینا، ہاتھ پاؤں کا کاٹنا اسی کی ایجاد ہے۔ اس نے ہزار برس حکومت کی۔ اس کے اواخر عہد حکومت میں ابراہیم علیہ السلام تھے۔ سواد پر نمرود اس کا عامل تھا۔ [مترجم]

8 اصل نسخے میں شعر کا ترجمہ حاشیے میں ہے۔ [م۔ص]

9 ادبار = بدنصیبی، نحوست، شکست وغیرہ۔ [م۔ص]

10 اس جھنڈے کو 'دُرفش کاویان' کہتے ہیں، اہل فارس اس کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ جنگ قادسیہ میں یہ جھنڈا مسلمانوں نے چھین لیا تھا۔ [مترجم]

11 پیش نظر عربی نسخوں میں افریدون کے لڑکوں کے درمیان تقسیم سلطنت سے متعلق عبارت یہ ہے: فکانت الروم وناحیة المغرب لسرم، والترك والصين والعراق لايرج... (روم اور اطراف مغرب سرم کے حصے میں آئے اور ترک، چین اور عراق ایرج کو ملے...) نسخۂ دارالفکر 184:2، نسخۂ دارالکتب العلمیہ 179:2۔ اس موقع پر مترجم علام نے اردو میں جو مفہوم و معنی پیش کیا ہے وہ عربی عبارت سے بالکل مختلف ہے۔ مترجم نے لکھا ہے کہ 'طوج کو ترک اور چین دیا گیا' جب کہ عربی متن اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے کہ طوج کے حصے میں کیا آیا۔ اسی طرح مترجم کے مطابق ایرج کو عراق کے علاوہ ہند اور حجاز بھی دیے گئے، اس کی بھی صراحت نہیں ہے۔ بہرحال حاشیے میں جو عربی عبارت نقل کی گئی ہے اس کے مطابق ترجمہ نہیں ہے۔ غالباً مترجم نے کسی دوسرے ماخذ سے یہاں اضافہ کیا ہے۔ [م۔ص]

12 کرشاسپ کی نسبت بعض مورخین لکھتے ہیں کہ یہ زوا کا نائب تھا اور بابل میں رہتا تھا، اس نے بغاوت کرکے اس سے ملک نکال لیا یا تقسیم کرلیا، بیس برس تک حاکم رہا۔ [مترجم]

■

ماخذ: تاریخ ابن خلدون (جلد دوم)، **مصنف**: عبدالرحمٰن ابن خلدون، **مترجم**: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی، **مرتب**: محمد صہیب، **پہلی اشاعت**: 2018، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

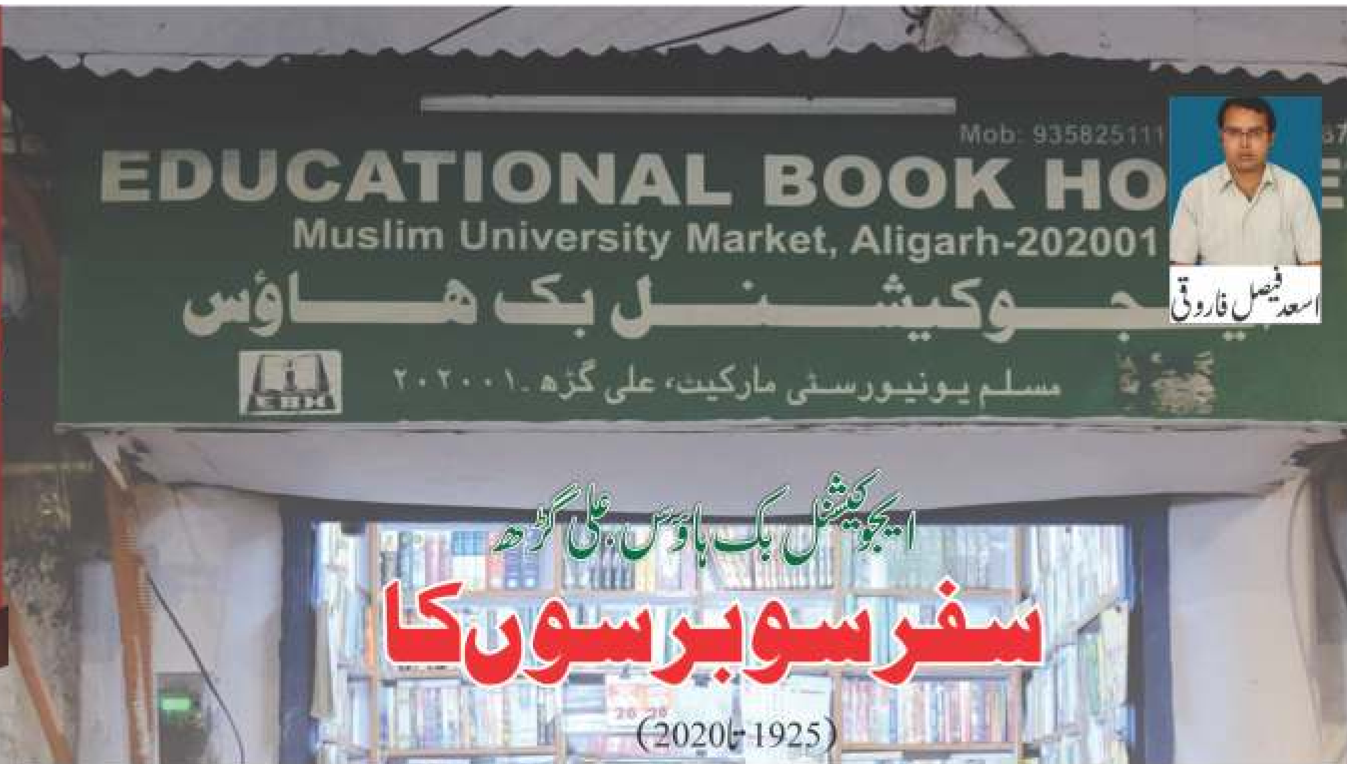

اسعد فیصل فاروقی

ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

سفر سو برسوں کا

(1925 تا 2020)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قوم وملت کا وہ ادارہ ہے جس کے آس پاس علم کا وہ شہر بسا ہوا ہے جس کی خوشبو نے ایک دنیا کو معطر کیا ہے۔ اس کے آس پاس ایسے بہت سے ادارے قائم ہوئے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کے خیر خواہان کی وجہ سے وجود میں آئے ۔ ایسے ہی ایک ادارہ ایجوکیشنل بک ہاؤس بھی ہے۔ قوموں کے عروج وزوال میں ادارے بنتے ہیں، بگڑتے ہیں۔نجی اداروں کی ویسے ہی زندگی کم ہوتی ہے۔ مگر وہ ادارے جو قوم کی خدمت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، جن کا مقصد علم پروری ہوتا ہے، وہ ایک مضبوط سایہ دار درخت کی طرح کھڑے رہتے ہیں، جس کے سایہ میں بہت سے مسافر آرام کرتے ہیں۔

ویسے بھی ہمارے یہاں اداروں میں ٹوٹ پھوٹ جلدی ہوتی ہے اور وہ انتشار کا شکار ہوجاتے ہیں، لیکن اگر کوئی ادارہ قوم، ثقافت، تہذیب اور علم کی خدمت کے لیے وجود میں آتا ہے اور اس کے اندر اس کام میں جنون، خلوص، اور نیک نیتی ہوتی ہے تو ان کی ترقی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ آج یہ ناچیز جس ادارہ کی بات کر رہا ہے، وہ صرف ایک ادارہ نہیں، بلکہ اس نے اپنی محنت، خلوص سے ایک ایسے علمی مرکز کے طور پر قومی اور بین الاقوامی سطح پر شناخت قائم کی ہے جس نے علی گڑھ کی علمی وادبی کاموں کو دور دراز تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کی یہ پہچان آج بھی قائم ودائم ہے۔ یہ ادارہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ہے۔ یہ صرف ایک ادارے کا ایک یا دو برس کا سفر نہیں ہے، یہ کہانی پورے سو برس کی کہانی ہے۔

علی گڑھ میں اشاعتی اداروں کی تاریخ میں ایجوکیشنل بک ہاؤس بہت اہمیت کا حامل ہے، جو ایک زمانہ سے اردو کی ترقی، اس کے فروغ کے لیے کوششوں میں لگا ہوا ہے اور ایک زمانہ کو روشن کر رہا ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس کا آج یہاں تفصیل سے ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری ہے، کیونکہ آج ہم اس کے قیام کی ایک صدی منا رہے ہیں۔

علی گڑھ میں کتاب کی اولین دوکان

اگر علی گڑھ میں کتاب کی دوکان کی تاریخ کو بیان کیا جائے تو اس میں بھی سرسید کو اس معنی میں اولیت حاصل ہوتی ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ علی گڑھ میں ایک کتاب کی دوکان قائم کرنے کی کوشش شروع کی اور اس کے لیے ایک فنڈ کا بھی آغاز کیا۔ سرسید علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے 7 جولائی 1888 کے شمارے میں کتابوں کی دوکان کے قیام کے سلسلہ سے ایک اشتہار دیتے ہیں جس کا عنوان 'ایک تجارتی دوکان کتابوں اور اسٹیشنری یعنی سامان نوشت وخواند کے فروخت کی علی گڑھ میں' ہے۔ اس عنوان کے تحت سرسید درج کرتے ہیں:

''چونکہ علی گڑھ کے ضلع میں تعلیم کی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور کالج اور اسکولوں کے لیے انگریزی اور فارسی وعربی وغیرہ ہر قسم کی کتابوں اور سامان نوشت وخواند کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے اور دوکان کتب فروشی اور اسٹیشنری کی علی گڑھ میں نہیں ہے اس لیے ہمارا ارادہ ہے کہ بطور لمیٹڈ کمپنی کے ایک دوکان کتب فروشی و دیگر سامان تعلیم ونوشت وخواند کی علی گڑھ میں قائم کریں۔ یہ تجویز ہے کہ اس دوکان کا سرمایہ دو ہزار پانسو روپیہ قرار دیا جاوے اور پچاس حصہ اس کے مقرر ہوں فی حصہ پچاس روپیہ اور جب کہ پچاس حصوں کے خریدار موجود ہوجاویں گے تو ایک دن مقرر کرکے سب کو جمع کریں گے اور اس کے قواعد اور طریق کارروائی آپس کی صلاح سے مقرر کریں گے پس جس صاحب کو اس میں شریک ہونا ہو اس سے ہم کو مطلع فرماویں اور یہ بھی تحریر کریں کہ وہ کس قدر حصوں کے خریدار ہوں گے۔

بالفعل مندرجہ ذیل حصہ دار شریک ہوئے ہیں:

سید احمد خاں راقم آثم دو حصہ

مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب دو حصہ

سید ولایت حسین صاحب بی اے دو حصہ

سید کلن صاحب ایم دو حصہ

منشی محمد سعید احمد صاحب ایک حصہ

مولوی عبدالغنی ایک حصہ

علی گڑھ یکم جولائی سنہ 1888 راقم سید احمد خاں۔''

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مورخہ 7 جولائی 1888، ص 764)

سرسید کی یہی کتابوں کی دوکان 'کالج بک ڈپو' کے نام سے مشہور ہوئی اور ایک عرصہ تک کالج کے طلبا کی کتابوں کی ضرورت کو تکمیل کرتی رہی۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام سے قبل کالج میں 'کالج بک ڈپو' اچھی حالت میں تھا، جس کے نگراں میر ولایت حسین تھے۔ آپ بیتی میں میر ولایت حسین درج کرتے ہیں:

> علی گڑھ میں اشاعتی اداروں کی تاریخ میں ایجوکیشنل بک ہاؤس بہت اہمیت کا حامل ہے، جو ایک زمانہ سے اردو کی ترقی، اس کے فروغ کے لیے کوششوں میں لگا ہوا ہے اور ایک زمانہ کو روشن کر رہا ہے۔

''اس میں اسٹیشنری کے ساتھ بعض کتابیں، سرسید، مولانا شبلی، مولوی نذیر احمد اور مولوی حالی کی بھی رکھ لیں، اور ان کی فہرست طبع کرائی، جس کا مقدمہ مولانا شبلی نے لکھا۔ یہ فہرست شائع کی اور اس کے ذریعہ سے ہماری کتابیں باہر جانے لگیں۔''

ایجوکیشنل بک ہاؤس کا قیام

1920 میں کالج بک ڈپو کے منیجر میر ولایت حسین صاحب سبکدوش ہوگئے ان کے بعد اس بک ڈپو کی حالت ویسی نہیں رہی اور وہ جلد ہی بند ہوگیا۔ اس دوران یونیورسٹی کا قیام بھی دسمبر 1920 کو عمل میں آگیا۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد لڑکوں کو یونیورسٹی کے قریب ایک کتابوں کی دوکان کی ضرورت تھی جہاں سے وہ کتابوں کے علاوہ اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان بھی لے سکیں کیونکہ کتابوں اور دیگر اسٹیشنری کی اشیا کی خرید وفروخت کے لیے بڑی دقتوں کا سامنا تھا۔ لڑکوں کی ان ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے 1925 میں محمد عبدالشہید (1898-1968) جو کہ میرٹھ کے رہنے والے تھے اور علی گڑھ محمڈن کالج کے طالب علم رہ چکے تھے، نے یہ اہم کام اپنے ذمہ لیا اور کتابوں کی ایک دوکان تصویر محل اور مسیحی قبرستان کے پاس فلر روڈ، پر کھولی، اور نام رکھا ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ اس طرح انھوں نے کالج بک ڈپو کے بند ہونے کے بعد علمی خلا کو پورا کیا۔

شمشاد مارکیٹ میں:

1928 میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (1867-1930) کے فرزند صاحبزادہ شمشاد احمد خاں (1888-1954) نے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کے فائدے کے لیے ایک مارکیٹ کی تعمیر کروائی اور ان کے نام کی مناسبت سے یہ مارکیٹ 'شمشاد بیولڈنگ' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس مارکیٹ کے درمیان میں مسجد ہے اور آس پاس دوکانیں ہیں۔ اس میں انھوں نے اساتذہ اور طلبا کی عام ضروریات کی چیزوں کی دوکانیں قائم کیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے محمد عبدالشہید مالک ایجوکیشنل بک ہاؤس سے یہ درخواست کی کہ وہ بھی اپنی کتابوں کی دوکان کو شمشاد مارکٹ میں منتقل کریں تاکہ ان کے طلبا اور اساتذہ کو آسانی ہو، اور ان کو کتابیں اور اسٹیشنری کا دوسرا سامان خریدنے کے لیے دور نا جانا پڑا کرے، جس کو انھوں نے فوراً مان لیا۔ اس طرح سے ایجوکیشنل بک ہاؤس 1928 میں شمشاد مارکیٹ منتقل ہوگیا۔ 1929 میں علی گڑھ میگزین میں جو اشتہار ایجوکیشنل بک ہاؤس کا شائع ہوا، اس کے مطابق ''Educational Book House, Book Sellers, Publishers, and Stationers, Civil Lines, Shamshad Building, No. 1, (New Swimming Baths)''۔ اس اشتہار کے مطابق یہ ادارہ نہ صرف کتابوں کی فروخت اور اشاعت کرتا ہے بلکہ مسلم یونیورسٹی میں داخلے سے متعلق تمام اطلاعات بھی فراہم کرتا ہے۔ جس کو داخلے سے متعلق اطلاعات حاصل کرنا ہو، وہ ایک آنہ ٹکٹ کے ساتھ خط کو بھیجے تاکہ فوراً جواب دیا جاسکے۔

شمشاد بلڈنگ کی تعمیر کے سلسلہ میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کے ممتاز مورخ افتخار عالم خاں صاحب نے بھی اپنی کتاب 'مسلم یونیورسٹی کی کہانی، عمارتوں کی زبانی 1920 تا 1947' میں روشنی ڈالی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ مارکیٹ 1929 میں صاحبزادہ شمشاد احمد خاں نے اپنی والدہ کے سرمایہ سے تعمیر کروائی تھی، اور اس کی تعمیر میں 30 ہزار روپیہ خرچ آیا تھا۔ اس عمارت کا افتتاح سابق وائس چانسلر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب نے کیا تھا۔ صاحبزادہ شمشاد احمد خاں کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی اس مارکیٹ کو کرائے پر لے لیکن یہ بات طے نہیں ہو پائی۔ اس میں کل 18 دوکانیں تھیں اور درمیان میں ایک مسجد تھی جو صاحبزادہ شمشاد احمد خاں کی والدہ کے نام پر ہے۔ اس میں درزی، دودھ دہی، پرچونی، ڈبل روٹی، جنرل مرچنٹ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، پان بیڑی، مرمت سائیکل، سامان سائیکل، گوشت وغیرہ کی دوکانیں تھیں۔ جو اہم بات یہ ہے کہ جدول میں جو کرایہ درج ہے اس میں سب سے زیادہ کرایہ ایجوکیشنل بک ہاؤس 31 روپے دیتا تھا، جبکہ باقی دوکانوں کا کرایہ صرف 5 روپے تھا۔

(مسلم یونیورسٹی کی کہانی، عمارتوں کی زبانی 1920 تا 1947، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2006، ص 65-161)

ایجوکیشنل بک ہاؤس کا ایک اشتہار جو سرگزشت، سرسید نمبر یکم مارچ 1930 میں شائع ہوا میں لکھا ہے:

''ایجوکیشنل بک ہاؤ، سول لائن علی گڑھ نے اپنے حسن معاملات و راست گوئی کے باعث نہ صرف علی گڑھ بلکہ دور دراز کے ممالک میں بھی خریداروں کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ آج ہر شخص جس کو کہ ایک مرتبہ 'ایجوکیشنل بک ہاؤس' سے معاملہ کا اتفاق ہوا ہے۔ اس کی راستی اور فوری تعمیل کے لیے معترف ہے۔ قوی امید ہے کہ آپ ہر کتابی ضرورت پر سب سے پہلے ایجوکیشنل بک ہاؤس کو یاد فرمائیں گے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس آپ کی مطلوبہ کتب کی تعمیل کے لیے کسی امکانی کوشش

سے باز نہ رہے گا۔ مفصل پتہ یہ ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ بک سیلرز واشیشنرز، سول لائن، شمشاد بلڈنگ متصل سوئمنگ باتھ کلب، علی گڑھ"

ابتدائی کتابوں کی اشاعت

ایجوکیشنل بک ہاؤس کی قدیم فہرستوں کی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ آزادی سے قبل ہی ایجوکیشنل بک ہاؤس نے کتابوں کی اشاعت کا کام بھی زور شور سے شروع کردیا تھا۔ عام طور پر دیکھا یہ جاتا ہے اردو اشاعتی ادارے صرف ادبی اور دینی کتابوں کے اشاعتی مرکز بن کر رہ جاتے ہیں، اور ان کے یہاں سے علوم وفنون کی کتابیں شائع نہیں ہوتیں، لیکن ایجوکیشنل بک ہاؤس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس کے یہاں سے ادب کے علاوہ دیگر علمی موضوعات پر بھی کتابوں کی اشاعت ہو۔ اس طرح اس نے مختلف علوم وفنون پر کتابوں کی اشاعت کی آغاز سے ہی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں اس نے نفسیات، سماجیات، مذہب وفلسفہ، تاریخ وتہذیب، سیاسیات، تعلیم، سائنس اور سماجی علوم نیز شعروادب پر بھی کتابوں کو شائع کیا۔ ابتدائی اردو کتابوں میں جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں پہلی کتاب 'کائنات ادب' ہے۔ اس کے علاوہ 'مخزن ادب'، 'سخن نو'، 'دہلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ'، 'داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی'، 'بچوں کی تربیت'، 'العقیدہ الحسنہ'، 'احسن الانتخاب' وغیرہ جو آزادی سے قبل ایجوکیشنل بک ہاؤس کی اشاعتی سرگرمیوں کی یادگار ہیں۔

آزادی کے بعد نیا آغاز

تقسیم ہند کے سانحہ نے دونوں ملکوں کے لوگوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اسد یار خاں بتاتے ہیں ان کے والد کے کئی عزیزوں نے ان کے والد محمد عبدالشہید سے یہ کہا کہ وہ بھی پاکستان چلیں لیکن پروفیسر رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ یہیں اپنا کام جاری رکھیں، اس طرح ان کے والد نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ شمشاد مارکیٹ بلڈنگ میں ایجوکیشنل بک ہاؤس کا قیام آزادی کے بعد 1951 تک رہا۔ اس کے بعد ان کی یہ دوکان حامد بلڈنگ کانفرنس مارکیٹ میں منتقل ہوگئی اور شمشاد بلڈنگ کی دوکان کو اسٹور کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ آزادی کے بعد جن کتابوں کی اشاعت ایجوکیشنل بک ہاؤس کے ذریعہ عمل میں آئی ان میں ڈاکٹر ہاشم قدوائی، لکچرر پولٹکل سائنس، علی گڑھ کی تصنیف 'جمہوریہ ہند کے جدید دستور اساسی کا خاکہ' ہے جو کہ 1951 میں شائع ہوئی۔ 'جمہور'، علی گڑھ کے مورخہ 26 دسمبر 1951 کے شمارے میں ایجوکیشنل بک ہاؤس کی جانب سے اس کتاب کا ایک اشتہار شائع ہوا۔ اشتہار میں درج ہے:

"زیر نظر کتاب میں مصنف نے جمہور ہند کے جدید دستور کو بیان کیا ہے، دستور سے متعلق جملہ ضروری باتیں اس میں آگئی ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف طلبہ بلکہ ہندوستانی سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑے کام کی ہے۔ صدق، معارف، الجمعیۃ، تنویر اور جمہور نے اپنے ریویو میں مصنف کو اس مفید کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دی ہے۔ ڈاکٹر سید محمود وزیر ترقیات حکومت بہار، اور پروفیسر ہارون خاں شیروانی صدر شعبۂ سیاسیات عثمانیہ یونیورسٹی نے اسے بہت پسند کیا ہے۔" (جمہور، 26 دسمبر 1951)

جامعہ اردو کے ابتدائی سالوں میں اس کے رجسٹرار سید ظہیر الدین علوی کو درسی کتابوں کی ضرورت جب پیش آئی تو ایسے مشکل وقت میں

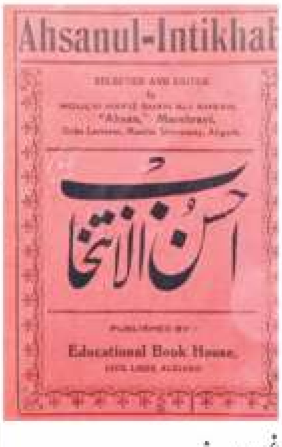

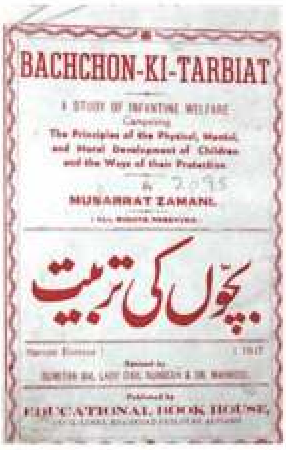

انھوں نے محمد عبدالشہید صاحب سے رابطہ کیا۔ عبدالشہید صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی خدمات حاصل کرکے جامعہ اردو کے لیے درسی کتابیں تصنیف کروائیں۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے نصابی کتابوں پر خاص توجہ دی جس کی وجہ سے طلباء اور ریسرچ اسکالروں کو سہولتیں مہیا ہوئیں۔ اسی طرح ایجوکیشنل بک ہاؤس نے جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی درسی کتابوں کی اشاعت بھی انجام دی۔

14 جنوری 1968 میں محمد عبدالشہید صاحب کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد اس ادارہ کا انتظام ان کے بیٹوں اسد یار خاں (پ 1942)، جن کو عرف عام میں علی گڑھ والے ان کو کپتان صاحب کہتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں کئی برس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گھڑسواری ٹیم کے کپتان تھے اور احمد سعید خاں (پ 1948) جو تمام علی گڑھ والوں کے بھیا ہیں، نے بحسن خوبی سنبھالا۔ علی گڑھ کے مایہ ناز ادیب اور استاد اطہر پرویز اپنی تصنیف علی گڑھ سے علی گڑھ تک میں رقمطراز ہیں:

"یہ پرانی دکان ہے علی گڑھ کے باہر ایجوکیشنل بک ہاؤس کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن شمشاد کے لڑکے تو اسے اسد بھائی کی دوکان کہتے ہیں۔ اسد یار خاں اپنی ذات سے انجمن ہیں کچھ لوگ ان کو کپتان صاحب بھی کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ یونیورسٹی کے رائڈنگ کلب کے کپتان تھے۔ ان کی رائڈنگ کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا اچھا خاصا اثر تھا۔ سننے میں تو یہاں تک آیا کہ رائڈنگ کلب کا راستہ اسد یار خاں کی دکان سے ہوکر گزرتا ہے۔"

(علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اطہر پرویز، اردو گھر، ص 90)

دونوں بھائیوں نے بہت کم وقت میں کتابوں کی طباعت کے معیار کو نہ صرف بلند کیا بلکہ معیاری، ادبی وعلمی کتابوں کی اشاعت عمل میں بھی لائے اور جلد ہی ان کا یہ ادارہ برصغیر ہندو پاک میں صف اول کا اشاعتی مرکز بن گیا۔ غالبیات، سرسیدیات، اقبالیات کے موضوعات پر اس ادارہ نے اعلیٰ تحقیقی تصانیف شائع کیں۔ ادارہ نے ہندو پاک کے مرحوم ادیبوں اور شاعروں بلکہ عصر حاضر کے معروف ادیبوں اور علمی شخصیتوں کی کتابیں شائع کیں۔ ان میں اقبال، فیض احمد فیض، وزیر آغا،

ابواللیث صدیقی، حسن عسکری، پروفیسر مسعود حسین خاں، اختر انصاری، خلیق احمد نظامی، محمد ہاشم قدوائی، رضا علی عابدی، آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، قمر رئیس، اسلوب احمد انصاری، خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی، مسعود حسن رضوی، اطہر پرویز، نورالحسن نقوی، شہریار، ابوالکلام قاسمی، شمیم حنفی، خلیل احمد بیگ، محی الدین قادری زور، شوکت سبزواری، محمد حسن، ظہیر احمد صدیقی، فضل امام، اختر انصاری، ابن فرید، عتیق احمد صدیقی، عبادت بریلوی، سید عابد علی عابد، اطہر صدیقی، افتخار عالم خاں، ثریا حسین، اصغر عباس وغیرہ شامل ہیں۔

اطہر پرویز اپنی مذکورہ تصنیف میں اسد یار خاں، احمد سعید خاں اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''ایجوکیشنل بک ہاؤس، اسد یار خاں کے والد جناب عبدالشہید نے قائم کیا تھا۔ وہ عام طور پر درسی کتابوں کا کام کرتے تھے۔ اب اسد یار خاں نے عام ادبی کتابوں کی اشاعت بھی شروع کردی ہے اور بعض بے حد خوبصورت کتابیں شائع کی ہیں۔ 'کلیاتِ اقبال' کا صدی ایڈیشن جس اہتمام سے انھوں نے چھاپا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں چھپا۔ 'الفاظ' کے نام سے ایک اردو جریدہ شائع کر رہے ہیں۔ غرض بڑی محنت سے بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ جب کوئی نیک کام کرنا چاہتے ہیں تو میرے پاس مشورے کے لیے ضرور آتے ہیں۔ اسد یار خاں، دوکان کے بجائے اپنے دفتر میں بیٹھتے ہیں۔ دوکان کی ذمہ داری احمد سعید کے سپرد ہے، احمد سعید ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مگر بڑی مستعدی سے کام کرتے ہیں۔ اور ایک لمحے کے لیے دوکان نہیں چھوڑتے اور شمشاد کی خبر رساں ایجنسی کا کام کرتے ہیں۔ میرے کرم فرما ہیں بلکہ یوں سمجھیے کہ میرا کام کر کے خوش ہوتے ہیں۔ تاہم نام شمشاد میں اسد یار خاں کا چلتا ہے۔ شاید اسی لیے شیخ سعدی نے کہا تھا کہ: 'سگ باش برادر خورد مباش' سعادت مند ایسے ہی لوگوں کو کہتے ہیں۔''

(علی گڑھ سے علی گڑھ تک، اطہر پرویز، اردو گھر، ص 92)

یہاں یہ بھی اظہار کردینا ضروری ہے کہ محمد عبدالشہید صاحب کے اس اشاعتی کام اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کی ترقی میں ان کی بیوی مسرت زمانی کا بھی گراں قدر کردار رہا، انھوں نے نہ صرف کتابوں کی ترتیب اور پروف ریڈنگ میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹایا بلکہ خواتین کی صحت اور بچوں کی نگہداشت اور تربیت پر انھوں نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کی کتابوں میں سے چند اہم ہیں، 'بچوں کی تربیت'، 'تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے (ایجوکیشنل سائکولوجی)'، 'رہبر تندرستی'، 'رہبر صحت'، 'علم خانہ داری'۔ مسرت زمانی (1920-1998)

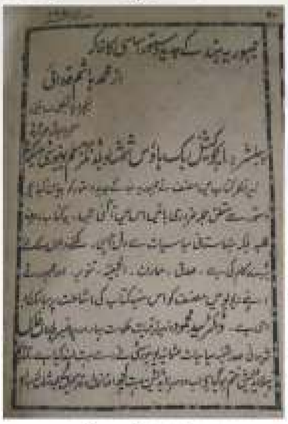

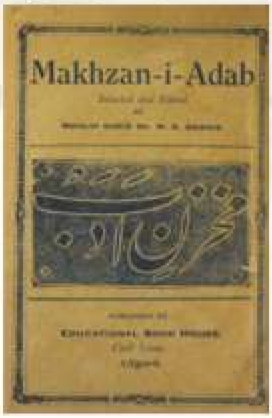

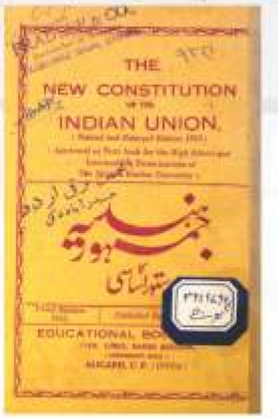

نے تقریباً 78 برس کی عمر پائی اور ان کا انتقال 9 دسمبر 1998 کو علی گڑھ میں ہوا۔ اسی طرح سے عبدالشہید خاں کے ایک اور بیٹے ڈاکٹر محمد عارف خاں (1943-2025) جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 15-10 برس شعبۂ کامرس میں تدریسی خدمات انجام دیں اور پھر افریقہ، اور عرب ممالک میں ایک عرصہ تک کامرس کے پروفیسر رہے، نے بھی اپنے علی گڑھ قیام کے دوران اپنے موضوع یعنی کامرس اور بینکنگ پر اردو میں کئی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں میں 'ایڈوانس اکاؤنٹنس'، 'جدید طریقۂ تنظیم تجارت (مبادی علم تجارت)'، 'بک کیپنگ اینڈ اکاؤنٹس' وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح محمد عبدالشہید کا پورا خاندان اردو کی بے لوث خدمت میں پیش پیش رہا، جس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

اسد یار خاں بتاتے ہیں کہ آزادی سے قبل سے ہمارے اس بک ہاؤس پر رشید احمد صدیقی، حسرت موہانی، عصمت چغتائی، معین احسن جذبی، آل احمد سرور، اسرار الحق مجاز، ظہیر احمد صدیقی، اطہر پرویز، قمر رئیس، جیسی ادبی شخصیات اکثر تشریف لاتیں اور ادبی محفلیں برپا ہوتی رہیں۔ ان کے درمیان ادبی موضوعات پر بحث و مباحثے ہوتے، نیز دیگر قومی اور بین الاقوامی سطح کے علمی موضوعات پر دانشورانہ گفتگو ہوتی۔ اور یہ سلسلہ کمزور تو ہوا ہے لیکن ابھی بھی جاری ہے۔

یہاں یہ واضح کرتے چلیں کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس نے اب تک تقریباً 1000 کتابیں شائع کی ہیں، ہر برس اس ادارہ کی تصانیف میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس اردو کا وہ اشاعتی ادارہ ہے جس کو ملک کی تمام اردو اکیڈمیوں سے کتابوں کی شاندار طباعت پر انعامات حاصل ہو چکے ہیں۔ لکھنؤ میں 1979 میں نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی اور یوپی اردو اکیڈمی کی جانب سے پہلی قومی اردو پبلشرز کی نمائش ہوئی۔ اس میں پہلا انعام ایجوکیشنل بک ہاؤس کو ملا تھا۔ اسد یار خاں کہتے ہیں کہ ہم ایک زمانہ تک اردو اکیڈمیوں کو انعام کے لیے کتابیں بھیجتے رہے، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بند کردیا اور زیادہ توجہ کتابوں کی شاندار طباعت پر دینے لگے۔

ادبی رسالہ کا اجرا

1976 میں ایجوکیشنل بک ہاؤس کے منیجر اسد یار خاں نے ایک اہم فیصلہ یہ کیا کہ اردو میں ادب کے فروغ کے لیے ایک دو ماہی ادبی رسالہ جاری کیا جائے۔ اس طرح 'الفاظ' کا اولین شمارہ ابوالکلام قاسمی کی ادارت میں 15 اگست 1976 کو منصۂ شہود پر نمودار ہوا۔ اس رسالہ نے اپنی ادبی نگارشات کی وجہ سے جلد ہی ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔ اس کی مجلس مشاورت میں پروفیسر خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی عبدالستار، اور نسیم قریشی جیسی اردو ادب کی ممتاز و معروف ہستیاں شامل تھیں۔ 1980 کے بعد ابوالکلام قاسمی اس کی ادارت سے علیحدہ ہوگئے اور مجلس ادارت میں اطہر پرویز، نورالحسن نقوی، اسد یار خاں کا نام درج ہونے لگا۔ مینیجنگ ایڈیٹر احمد سعید خاں اور پرنٹر پبلشر اسد یار خاں تھے۔ سالانہ قیمت دس روپے اور قیمت فی کاپی دو روپے تھی۔ اس رسالہ نے تقریباً بیس برس اردو ادب کی آبیاری

کی۔اس نے ادبی حلقوں میں اپنی الگ پہچان قائم کی اردو کی ممتاز اور معروف ادبی شخصیات نے اس کو نہ صرف پسندیدگی اور قدر کی نظر سے دیکھا بلکہ اپنی بہترین تخلیقات کو اشاعت کے لئے بھی نوازا۔ وحید اختر، ابن فرید، قاضی عبدالستار، خورشید الاسلام، عمیق حنفی، شمیم حنفی، سید امین اشرف، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، فرحت احساس، آشفتہ چنگیزی، غیاث الرحمٰن، جاوید حبیب، عبید صدیقی، وزیر آغا وغیرہ برصغیر کے وہ نثر نگار اور مشہور شعرا ہیں جن کی تخلیقات الفاظ کے اوراق کی زینت بنتی رہیں۔ الفاظ جب تک جاری رہا اس نے اردو کے نامور محققین مصنفین نیز اردو اصناف پر کئی خصوصی شمارے شائع کئے۔ معید الرحمٰن اپنی کتاب 'نذر ابوالکلام قاسمی' کے دیباچہ عرض حال میں رقمطراز ہیں:

''قاسمی صاحب نے تنقید لکھنے کا آغاز دو ماہی رسالہ الفاظ(1980-1976) کے اداریوں اور تبصروں سے کیا۔اس رسالے میں قاسمی صاحب نے ادب کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع کیا۔ نثری نظم پر بڑی فکر انگیز بحثیں اس رسالہ کے ذریعہ منظر عام پر آئیں۔''

الفاظ کی کتابت ریاض احمد، الہ آباد اور سرورق کی تزئین سرفراز احمد کے سپرد تھی اسرار کریمی پریس الہ آباد سے طبع ہوتا تھا۔'الفاظ' کا مقصد اردو ادب کی آبیاری کرنا نیز نئے لکھنے والوں میں سنجیدہ ادب کے تئیں دلچسپی پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے 'الفاظ' کے پہلے شمارے کے اداریہ میں مدیر رسالہ رقمطراز ہیں:

''الفاظ کی پہلی کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں ہم نے مختلف الخیال لوگوں کو اظہار خیال کی دعوت دی تھی۔ان میں سے بعض کے جواب آپ کے سامنے ہیں۔ یہ کتاب رسالہ الفاظ کی تمہید کی شکل میں پیش کی جارہی ہے۔

علی گڑھ سے کسی ادبی جریدے کا شائع نہ ہونا تعجب کی بات ہے، اشاعت نہیں۔ اس وقت جب رسائل یکے بعد دیگرے دم توڑ رہے ہیں اور جو باقی ہیں ان کی اکثریت آخری ہچکیاں لے رہی ہے۔ کسی نئے رسالے کا اجرا کا خیال طویل المدتی عہد و پیمان کا دوسرا نام ہے۔ایفائے عہد کا عزم اور حوصلہ اس کا محرک بھی ہے۔

ردعمل کے طور پر جاری ہونے والے ادبی جرائد کی عمر جذباتی ابال سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتی۔ الفاظ کی اشاعت نہ تو کسی ردعمل کا مظاہرہ ہے اور نہ ہی کسی خاص گروہ کا ترجمان ہے۔ اگر غیر جانبداری اس کا تصور ہے تب بھی ادارے کو اعتراف میں تکلف نہیں۔ فرد کے ذہنی تحفظات اور فکری تعصبات بالکل فطری ہوتے ہیں اور ممکن ہے آپ کو بعض مشتملات سے شبہ ہو کہ رسالہ اس کا شکار ہے، مگر وہ آپ کا شبہ ہی ہوگا ادارہ کی شعوری کوشش الفاظ کو خاص لیبل سے آزاد رکھنا ہے۔

بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کی علمی شان اور میراث کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔ یہ ادارہ محبان اردو کی کشش کا ہمیشہ مرکز رہا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے

ہمارے نزدیک ادبی اقدار کے پیمانے ادب سے باہر نہیں ہوتے اس لئے زیر نظر رسالے میں شائع ہونے والی تمام چیزوں کی بنیادی شرط ادبی ہونا ہے۔''

(الفاظ، علی گڑھ اگست 1976)

راقم الحروف کی ایجوکیشنل بک ہاؤس سے25-30 برس کی یادیں جڑی ہیں، اپنے بچپن میں جب وہ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، ایجوکیشنل بک ہاؤس پر پہلی مرتبہ آنے کا موقع ملا، یہ برس1995 کا تھا،اس کے بعد سے یہ رشتہ بتدریج ایسا مضبوط ہوا کہ گذشتہ پچیس برسوں میں ہفتے میں کم سے کم دو یا تین مرتبہ کا چکر ضرور لگنے لگا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ شروع کے کئی برس عصر اور مغرب کے درمیان آنا ہوتا کیونکہ ابا کا یہی حکم تھا کہ مغرب سے پہلے گھر آجایا کرو۔ جب کالج میں آئے تو مغرب کے بعد آنے لگے۔ اکثر یہ دیکھا کہ مغرب کے بعد ابوالکلام قاسمی صاحب کی محفل سجتی تھی، جس میں نہ صرف اردو ادب کے ممتاز اساتذہ اور ان کے شاگرد بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ محفل2017 تک جاری رہی۔ مرحوم پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب سے پہلی بار یہیں ملاقات ہوئی۔

یہ وہ مقام ہے جہاں پر اس ناچیز کو پہلی دفعہ علی گڑھ اور علی گڑھ سے باہر کی علم و ادب کی معروف، معتبر اور ممتاز شخصیات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ان میں پروفیسر ہاشم قدوائی، پروفیسر مشیر الحسن، پروفیسر قاضی عبدالستار، منظور ہاشمی، قربان علی، رئیس نعمانی، دانش عبدالغفور اور پتہ نہیں کتنے لوگ شامل ہیں۔

بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کی علمی شان اور میراث کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔ یہ ادارہ محبان اردو کی کشش کا ہمیشہ مرکز رہا ہے۔ محمد عبدالشہید اور اس کے بعد ان کے فرزندان اسد یار خاں اور احمد سعید خاں نے جس لگن، محنت اور دیانت داری سے اردو کے اس ادارے ایجوکیشنل بک ہاؤس کو سینچا، اس کے ذریعہ اردو کے فروغ کے لیے خدمات انجام دیں اور اردو کتابوں کو کم قیمت اور اچھے گیٹ اپ کے ساتھ اردو کے دور دراز علاقوں تک پہنچایا، اس نے ہندوستان میں آزادی کے بعد اردو کو تقویت بخشی اور اردو ادب کی ترویج و ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس طرح کی شاندار خدمات اردو کے کم ہی بک ہاؤس اور اشاعتی اداروں کے حصہ میں آئی ہے۔ یہ ان کی اس محنت، خلوص اور جذبے کا ہی نتیجہ ہے کہ اس ادارے نے ایک صدی مکمل کرلی ہے اور آج بھی یہ ادارہ اسی طرح اردو کی خدمت میں پیش پیش ہے جو اپنے آپ میں ایک مثال بھی ہے۔ اس صدی کی تکمیل کے سعد موقع پر ایجوکیشنل بک ہاؤس اور اس کے مالکان کتابوں کے شائقین، اردو قارئین اور محبان اردو کی جانب سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دعا یہی ہے کہ ایجوکیشنل بک ہاؤس کی خدمات اسی طرح اردو کے لیے جاری وساری رہیں۔

■

Dr. Asad Faisal Farooqui
C/O Mrs. Mohsina Farooqi
Maulana Azad Library, AMU
Aligarh- 202002 (UP)
Mob.: 9412595891
asadfaisalamu@gmail.com

یادِ رفتگاں

ظہیر انور

انیس رفیع
اور اس کے بعد کا اجالا

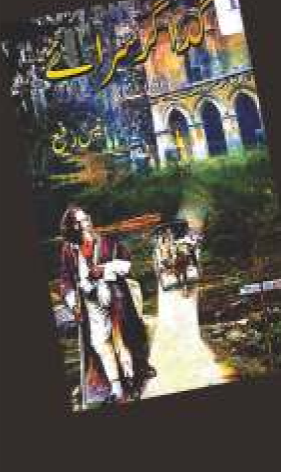

غالب نے کہا تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب کے معیار پر اترنے اور انسان ہونے کے لیے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایسے تمام حضرات جو آدمی سے انسان ہونے کے عمل سے گزرتے ہیں، ابتدا سے مشکلوں، دشواریوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کے حوالے سے یہ مقام ہاتھ آتا ہے۔ ایسی ہی صفات افسانہ نگار اور تنقید نگار انیس رفیع کے اندر بھی موجود تھیں۔ میرے لیے یہ سانحہ ذاتی سطح پر بارگراں سے کچھ کم نہیں۔ وہ میرے استاد بھی تھے۔ جب میں گیارہویں جماعت کا طالب علم تھا تو استادِ محترم سے کلاس روم میں آشنائی ہوئی تھی۔ 1969 کا زمانہ تھا۔ ان دنوں مجھے یہ علم نہ تھا کہ ان کی صلاحیتیں یا علمی اور ادبی لیاقتیں کس معیار کی تھیں۔ ان کا ہنر دھیرے دھیرے ان سے ملاقاتوں اور ان کے افسانوں کے مطالعے کے بعد کھلتا گیا۔ اسکول میں ان کی محبت، اپنائیت اور بے تکلفی سے پڑھانے کی خصوصیات سے متعارف ہی نہیں، متاثر بھی ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے اسکول میں دو بڑے مقبول اساتذہ تھے: طیب احمد خاں اور انیس رفیع، اور دونوں ہی مختصر عرصے کے لیے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بہ حیثیت استاد آئے تھے۔ انھیں تو کہیں اور سفر پہ جانا تھا لیکن طالب علموں سے بڑے مہربان اور شفیق دوست کی طرح پیش آتے اور انھیں ہر پل لکھنے، پڑھنے اور کچھ نیا کر گزرنے کا حوصلہ دیتے تھے۔ اس سے پہلے انیس رفیع صاحب اسلامیہ ہائی اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے چکے تھے اور کچھ عرصہ بہار کے کسی کالج میں پولیٹکل سائنس کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ وقت گزرتا گیا اور پھر ان کا تقرر ریڈیو اسٹیشن میں پروگرام ایگزیکیوٹیو (Programme Executive) کے طور پر ہوا اور جب وہ کلکتہ تشریف لائے تو اس شہر کی فضا ہی جیسے بدل گئی۔ ایک نقیب، اسپیکر، اداکار اور ڈراما نگار کے طور پر ان سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ برسوں دراز رہا۔ ان کے آفس، ریڈیو اسٹیشن کے کینٹین میں ہنسی، مذاق کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ادبی گفتگو بھی خوب خوب ہوئی۔ اگرچہ وہ مختصر عرصے کے لیے ہمارے استاد رہے، تاہم ٹی وی اسٹیشن کے ڈائرکٹر کے عہدے تک، بلکہ زندگی کے آخری دنوں تک ان سے ہماری راہ و رسم برقرار رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت بہ حیثیت افسانہ نگار، ریڈیو ٹاک میں شریک کار، ریڈیو ڈراموں کے تخلیق کار اور پروڈیوسر کے طور پر بڑھتی گئی۔ آفس اور کینٹین ہی کیا، شہر کے کئی مقامات پر بہت کچھ ان سے بحث و تمحیص کے حوالے سے ادب، افسانے اور تنقید و تبصرے کے نئے گوشے میں ہمیں روشنی ملی۔ ان کے کئی افسانوں پر خود ان کے ساتھ مکالمہ ہوا، بالخصوص دو آنکھوں کا سفر، اب وہ اترنے والا ہے، مادر فروش، پشت پر رکھا ہوا آئینہ، لوہے کی مٹھی، کرفیو سخت ہے اور 'گداگر سرائے' نیز 'اندر قلعہ' جیسے طویل مختصر افسانہ یا ناویلا/ ناولٹ پر گفتگو کے حوالے سے کہانی، نئی جدید تر کہانیوں کو سمجھنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس طرح ہم دونوں کے درمیان محبت اور قربت کا ایک انوکھا رشتہ قائم ہوگیا۔ انھوں نے مجھے کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں ان کا شاگرد ہوں بلکہ مجھے ایک دوست کی طرح ہمیشہ ٹریٹ کیا۔ ہماری یہ دوستی ادبی محفلوں میں، جلسوں میں، ایک ساتھ اسٹیج پر شریک ہونے کی وجہ اور بھی مستحکم ہوتی چلی گئی۔ بنگال کے اردو افسانے کے تین چار افسانہ نگار ظفر اوگانوی، انیس رفیع اور فیروز عابد بحث و تکرار کے ساتھ ساتھ رسالوں میں بھی تواتر سے نظر آتے رہے۔ سجاد نظر بھی ایک بہترین افسانہ نگار کے طور پر اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ ہندوستان کے تمام اہم ادبی جریدوں اور رسائل میں ان کی کہانیوں نے قاری کا ایک حلقہ بنا لیا تھا اور نئی نسل متاثر بھی ہو رہی تھی اور سیکھ بھی رہی تھی۔

انیس رفیع کے کل تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ایک افسانوی مجموعے کی رسم اجرا میں مجھے بھی شریک ہونے اور اپنی رائے کے اظہار کرنے کا موقع ملا تھا۔ ان کی جتنی کہانیاں شائع ہوئیں، وہ تو جگ ظاہر ہے لیکن کہانیاں اور انتہائی بامعنی اور خوب صورت کہانیاں کسی اور کے نام سے بھی شائع ہوئیں۔ دن گزرتے گئے، ان کی محبت اور خلوص کا سایہ بڑھتا گیا۔ محفلوں میں بالخصوص سجاد نظر، فیروز عابد، کامل اختر، معین اعجاز، ف س اعجاز، حسن اثر کے علاوہ یوسف تقی کے گھر میں، نیز آخری چند برسوں میں صدیق عالم کی صحبت میں بھی شامیں گزریں اور سادہ کہانیوں سے لے کر جدید، مابعد جدید اور طلسمی حقیقت نگاری تک بحث کے موضوع بنتے رہے۔ نئی طرز کی کہانیوں اور تنقید کے نئے لب و لہجے سے ان کی واقفیت کسی سے کم نہ تھی۔ انھوں نے مجھے ایک دوست کی طرح اپنا لیا لیکن رہے وہ میرے استاد ہی، اور جو خلوص و محبت کا مظاہرہ کیا، وہ آدھی صدی سے اوپر کا قصہ ہے، جس کے پورے بیان کے لیے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو ناکافی ہے۔ ہاں، ان ملاقاتوں میں ہر بار یہ احساس ہوا کہ وہ کسی گھنے درخت کے سائے سے کم نہیں۔ ذوق نے کیا خوب کہا تھا

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ سے ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

وہ تیزی سے میرے قریب آتے گئے اور پھر کئی ڈراموں کو اسٹیج پر دیکھا، اسٹیج اور فلم سے ان کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ میرے کئی ڈراموں مثلاً انتظار اور ابھی،

انگاروں کا شہر، نیلامی ایک سلطان کی، بٹوارہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ، اسکرپٹ زماں حبیب) اور 'نقارہ' وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میرے ڈرامے کو نہ صرف سراہا بلکہ میری ہدایت کی پزیرائی بھی کی۔ وہ ان ڈراموں کے اسٹیج کی پیش کش سے متاثر تھے اور پھر انھوں نے 'انگاروں کا شہر' ریڈیو ورشن، اور ڈراما 'خوابوں کا سویرا' کا ٹی وی پروڈکشن کی ذمے داری بھی نبھائی۔ ریڈیو پر ڈراما پیش کرتے ہوئے انھوں نے ابتدائیہ کے طور پر جو کچھ کہا تھا، وہ آج بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے اور پہلی بار تحریری صورت میں اس کا اظہار ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ اردو ڈراما بنگلہ ڈراموں کی ہم سری کرنے لگا ہے۔ اس بات میں صداقت ہے کہ نہیں، اس سے مجھے سروکار نہیں لیکن نئی نسل کو انھوں نے ہمیشہ سراہا اور میرے لیے بھی یہ نہایت حوصلہ مندانہ بات تھی اور دوسری طرف ان کی نکتہ رسی اور کشادہ دلی بھی صاف ظاہر تھی۔ وہ ایسے مقام پر تھے کہ ان کے یہ توصیفی جملے ہم جیسے کم تر ادیبوں اور ڈراما نگاروں کے لیے اہمیت کے حامل تھے۔ بہ حیثیت افسانہ نگار 'شب خون'، 'شاعر' وغیرہ میں ان کے افسانوں کی مسلسل اشاعت کی وجہ سے ان کی شہرت ملک گیر سطح پر مستحکم ہو چکی تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کی رفاقت قابل ذکر تھی۔ نئے لکھنے والوں یا ان کے ساتھ ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں جو ادبی، فکری، علمی اور دانش وری کے پہلو ظاہر ہو رہے تھے، انیس رفیع بھی ایسی خصوصیات سے مالا مال تھے۔ علاوہ ازیں انسان دوستی، وضع داری، عملی زندگی میں تھوڑی بہت لاپرواہی، نہایت حساس نیز غیر محتاط بھی تھے، لیکن ایثار و محبت کی دنیا میں بے مثال اور تحریر کے حوالے سے نہایت باخبر اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی ہمیشہ کرتے رہتے تھے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن میں نئے لکھنے والوں کو ہمیشہ موقع دیتے۔ Voice Over، نقابت اور اداکاری نیز آوازوں کو سامنے لانے کے لیے کوششیں کیں اور میری زندگی کا بھی بڑا حصہ ان کی ایسی ہی خصوصی روایات اور عنایات کے احاطے میں گزرا۔ یاد آتا ہے کہ ابتدائی دنوں میں ریڈیو اڈیشن کے لیے راقم الحروف کو ایک اسٹوڈیو میں تنہا چھوڑ کر پیچھے سے دیکھتے رہے اور آواز دی کہ آپ کو ایک بوڑھے کا کردار ادا کرنا ہے جسے شہر بدر کا حکم ملا اور وہ اپنی عمر رسیدہ بیوی سے نکلنے سے پہلے بات کر رہا ہے۔

بہ حیثیت استاد انھوں نے کبھی غصے اور جبر کا اظہار نہ کیا بلکہ علمی صلاحیتوں سے شاگردوں کو متاثر کیا۔ بہ حیثیت پروفیشنل بھی ان کے اندر خلوص اور وسعت نظری شامل رہی اور بہ حیثیت افسانہ نگار وہ جن مستند افسانہ نگاروں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ان میں ظفر اوگانوی، فیروز عابد، سجاد نظر کے علاوہ ہندوستان گیر سطح پر نئی نسل کے علاوہ شوکت حیات، سلام بن رزاق، طارق چھتاری، شفق، عبدالصمد، سید محمد اشرف اور اقبال مجید جیسے اہم فن کار اور افسانہ نگار شامل تھے۔ یہ تمام لوگ نئی کہانی، جدید تر کہانی اور زندگی کے مسائل کی عکاسی کے حوالے سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ ان میں بیشتر جدید افسانوی سطح، نئے اسلوب اور موضوعات، کردار کے خارج و باطن کے اظہار کے ساتھ نئی علامتی سطح اور عصری حسیت (بشمول کہانی کی واپسی) کی اہمیت سے

> **وہ دیہات کی زبان، الفاظ اور محارے نیز دیہات کے بسنے والوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ الفاظ کا حسن، گا ؤں اور شہر کے حالات، رسم و رواج، تیوہار نیز سیاسی اتھل پتھل کا زبردست مشاہدہ تھا اور مطالعہ بھی کسی سے کم نہ تھا۔**

آشنا لوگ تھے۔ کچھ لوگوں نے نئی افسانوی بنت میں میانہ روی اختیار کی اور کچھ کہانی کار نے جدید تر حسیت اور نئے اسالیب کے ساتھ نئی منزلوں کا بھی پتہ دیا۔ جدیدیت کی تحریک اور شمس الرحمٰن فاروقی کی قربت نے انیس رفیع کو جدید طرز کی تخلیقیت کی طرف موڑ دیا لیکن وہ اپنے عصر کے مسائل کے اظہار سے کبھی غافل نہ رہے۔ کچھ تجرید اور کچھ علامت نگاری نے ان کی کہانیوں میں ذرا سی پیچیدگی پیدا کی تھی لیکن زندگی اور اس کے مسائل سے اور بدلتی ہوئی قدروں سے ان کی کہانیاں کبھی خالی نہ رہیں۔ ان کی کہانی، کہانی کے پلاٹ اور مخصوص الفاظ کے برتنے کا سلیقہ عصری معنویت سے پر تھا۔ 'گداگر سرائے' تک آتے آتے وہ اپنے عصر، اپنے سماج، گاؤں اور شہر کے حالات، اپنے کردار اور ان کی نفسیات سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اپنے تجربوں اور اختراعی قوت سے نئے طرز کی کہانیوں کی تجسیم کاری سے بھی ان کی کہانیاں عبارت ہو گئیں۔ بہار کے گاؤں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کی زبان بہت سارے ہم عصر لکھنے والوں سے مختلف تھی۔ زبان میں بہار کی ٹھیٹ بولی اور محاوروں کے برمحل استعمال نے ان کی کہانیوں میں نیا ذائقہ پیدا کر دیا تھا۔ 'اب وہ اترنے والا ہے'، 'کرفیو تخت ہے' کے بعد 'گداگر سرائے' اور ان کی بیشتر کہانیوں میں ایسی زبان کا برملا اظہار ہوا ہے۔ وہ دیہات کی زبان، الفاظ اور محارے نیز دیہات کے بسنے والوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ الفاظ کا حسن، گاؤں اور شہر کے حالات، رسم و رواج، تیوہار نیز سیاسی اتھل پتھل کا زبردست مشاہدہ تھا اور مطالعہ بھی کسی سے کم نہ تھا۔ کہانی 'کرفیو تخت ہے' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''سورج کہیں لاپتہ ہو گیا ہے۔

''سورج کے اچانک غائب ہو جانے سے قاسم ہیبت ناک مقدمے میں پھنس گیا ہے۔''

''کھڑکی مت کھولنا۔ سن سے گولی اندر آجائے گی۔''
کبھی اندر جھانک کر دیکھا نہیں، باہر جھانکنے سے کیا فائدہ۔

''Halt''

''دروازہ بولٹ ہے نا۔''

''ڈھیر سارے وقت کا ہم کیا کریں گے۔''

''بیان جاری رکھو۔''

''پھر میں نے دیکھا، بغل والے منہدم مکان کے ملبے سے لوگ سر پر ٹوپیاں رکھے باہر آ رہے ہیں۔''

''آہستہ آہستہ کوئی دن یہ ساری کتابیں گر پڑیں گی زمین پر تب کیا ہوگا مسٹر ڈائر؟''

''وہ ہوگا جو کتابوں کے آنے سے پہلے ہوا تھا۔''

اور اب افسانے کا آخری جملہ بھی دیکھیے:

''وہ دونوں بھی جماعت میں کھڑے ہو گئے، مگر انھیں حیرت اس وقت ہوئی جب ان کے ہاتھ بھی اوپر سے نیچے نہیں آسکے۔''

یہ ان کے نہایت اہم اور بے مثال افسانے سے ایک مختصر اقتباس ہے لیکن اپنے عصر کا ایک زبردست حوالہ بن گیا ہے کہانی کی ساری فضا ایسی ہی پیکر سازی سے خلق ہو کر اپنے عصر کی تاریخ ہمارے سامنے رقم کر رہی ہے۔ ٹھیک ان کی کہانی 'غروب سے پہلے' جس کی پذیرائی محمد حسن نے بھی کی تھی اور بائیں بازو کی

سیاست کے حوالے سے سچائی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی طرح یہ افسانہ بھی چھوٹی چھوٹی خودکفیل علامتوں کے سہارے وقت کی سنگین تصویر ہمارے سامنے واشگاف انداز میں پیش کررہا ہے۔ کرفیو زدہ ماحول، مسافر، منہدم گھر کے ملبے، اذان کی آواز، نمازی ہاتھ اٹھائے بڑھتے ہوئے ان کو غور سے پڑھیں تو بین السطور میں بے شمار معنیاتی نکات چھوٹی چھوٹی خودکفیل علامتوں کے سہارے جنم لیتے ہیں، مزید یہ کہ گولی کے اندر گھروں میں آنے کا خطرہ، چمگادڑ سے کتابوں کے گرنے کا خوف، ان تمام تصویری پیش کش نے اس مختصر کہانی میں قوم اور مذہب کی سائیکی کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ افسانہ نگار تاریخ رقم کررہا ہے لیکن تاریخ داں کی طرح نہیں بلکہ ایک افسانہ نگار کی طرح جسے اپنے فن پر پورا بھروسہ ہے۔

ان کی تحریروں میں خواہ وہ افسانہ ہو کہ تنقید، ان کی مخصوص شناخت تھی اور ان کا منفرد انداز (Style) تھا۔

تنقید کی بات آئی ہے تو چند جملے ان کی تنقید کے سلسلے میں بھی پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ کہانی کی علامت نگاری اور عصری معنویت سے تنقید کے رچے ہوئے شعور تک استاد محترم اپنی کتابوں کے حوالے سے ایک ماہر افسانہ نگار اور تنقید کے حوالے سے ایک منفرد دانش ور بن کر ابھرے۔ تنقید میں بھی ان کی زبان تخلیقی تھی۔ چوں کہ بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار تھے لہٰذا تخلیقی رنگ ان کی تنقید کا اختصاص تھا۔ ان کی تنقید کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ فرمائیں جو ان کے تنقیدی شعور کو ہمارے سامنے خوب صورتی سے پیش کرتا ہے:

''تکنیک کی حتمی اور مستند تعریف بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ مواد، اسلوب اور ہیئت سے علیحدہ ایک آرٹ ہے۔ فن کار خام مواد کو جب اپنے نادر اسلوب اظہار میں حلول کر کے فن پارے کو ایک مخصوص طریقہ سے متشکل کرتا ہے تو تکنیک کی پرچھائیاں روشن ہونے لگتی ہیں۔ بقول ممتاز شیریں، مختصر لفظوں میں افسانے کی تعمیر میں جس طریقے سے مواد ڈھلتا ہے، وہی تکنیک ہے۔''

اور آخر تک بیانیہ کی قسموں پر بلیغ اور جامع تبصرہ کرتے ہوئے انیس رفیع اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''ان دنوں تنقید کا ایک نیا اسکول قائم ہوا ہے جو بیانیہ کی ساخت اور وضعیات (Structure) پر بہت زور صرف کررہا ہے۔ شاید اسی خصوصی توجہ کی بنا پر بیانیہ کی تنقید اور اس کی بحث میں ایک خاص تنقیدی نظریہ مرتب ہوگیا ہے، یعنی بیانیات (Narratology) جسے آج تنقید میں بڑی نمایاں حیثیت مل گئی ہے اور جدید تنقید تو یہ بھی کہتی ہے کہ بیانیہ پوری زندگی کا استعارہ ہے۔''

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انیس رفیع کا مطالعہ فلکشن، فکشن کے بیانیہ اور تنقید پر کس قدر گہرا تھا۔ جدید بلکہ مابعد جدید تنقید پر بھی ان کی نگاہ رہی تھی۔ بیانیہ کی نئی نہج کے علاوہ وہ منشائے مصنف، مصنف کی موت اور متن سے مصنف کی بے دخلی کے علاوہ کثرت معنی کی فکر انگیز بحث سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے تنقید میں نہایت شفاف اور محتاط رویہ اختیار کیا جو قاری کے فہم وعرفان کو مہمیز کرتا ہے۔ یہاں نہ شدت پسندی ہے اور نہ بے جا دانش وری ہے بلکہ ان کی تحریر کی ماہرانہ گرفت سے ہم آگاہ ہوتے ہیں۔ ایسی مثالوں سے ان کی تنقید کی کتاب بھری پڑی ہے۔

اردو افسانے اور تنقید کی نئی نسل ان سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد انداز کے افسانے اور تنقید سے ہم سبھوں کو متاثر کیا ہے اور زندہ کرداروں سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔

ان کی تنقید کی زبان میں بھی ایک نوع کی دل کشی ہے اور ان کے تنقیدی مضامین اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ کسی بھی بہتر افسانہ نگار کے افسانے اور ناولوں کی ہیئت، موضوع اور اسلوب کی تفصیل میں نمایاں ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف بنگال کی سطح پر اپنی شناخت مستحکم کر چکے تھے بلکہ ان کی قدر ومنزلت بنگال سے باہر بھی تھی۔ اس لیے ان کے مضامین کی پذیرائی علی گڑھ اور دہلی میں بھی ہوتی تھی۔ وہ نہایت قد آور شخصیت کے حامل تھے۔ اگر آپ آج کل کے اساتذہ، بالخصوص یہاں کے پروفیسران حضرات اور نئی پود کے ادیب وشاعر اور افسانہ نگار نیز ان کی کم تر درجہ کی تخلیق اور درس وتدریس کا جائزہ لیں تو القاب میں ماہر، عالم، دانش وا ور سفرنامہ نگار کا سابقہ اور لاحقہ مل جائے گا لیکن انیس رفیع جیسا فن کار مشکل سے نظر آئے گا۔ ان کے تقابل میں ان کا ہنر اور جوہر کھل کر سامنے آجائے گا۔ انھوں نے اپنے تنقیدی معروضات سے یہ ثابت کیا کہ حسن معنی اور تہہ در تہہ مفاہیم تک پہنچنا کس قدر جوکھم کا کام ہے۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ اپنے دور کے افسانوں میں وہ صف اول کے افسانہ نگار تھے لیکن تنقید نگاروں میں بھی ان کا قد نہایت بلند تھا۔

مجھے استاد محترم کو الوداع کہتے ہوئے دکھ ہورہا ہے تاہم اس بات سے بڑی طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے بعد، ادب، افسانے اور تنقید کی دنیا میں اندھیرا نہیں، اجالا ہی پھیلے گا۔ ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور تنقید نگار اپنی تخلیقات اور تحریرات میں زندہ رہتا ہے اور ایک مخلص انسان قبر کے اندھیروں میں نہیں بلکہ بقول مولانا روم، دلوں میں زندہ رہتا ہے۔ کلکتہ کے ہوٹلوں میں، چائے خانوں، اپنے دوستوں کی ہمدمی میں، ان کے بہار کے سفر میں جب فیروز عابد کے فرزند کی شادی ہورہی تھی، ہم دیر رات تک ادب اور فن کی باریکیوں اور شاعری کے رموز واسرار پر گفتگو کرتے رہے۔ ایک بار شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ، ان کے گھر پر شہناز نبی، خواجہ نسیم اختر، ابوذر ہاشمی وغیرہ کے ساتھ بڑی زبردست محفل جمی تھی۔ فاروقی صاحب سے ادب اور فن پر بہت سارے سوالات کیے گئے تھے اور انھوں نے بھی خوب خوب حصہ لیا تھا اور ہم سبھوں کی بڑی یادگار ضیافت بھی کی تھی۔ اسی طرح ان کی تحریر اور تقریر سے بھی فیض اٹھاتے ہوئے ادبی اور فکری گفتگو میں اجالے کا احساس ہوا کرتا۔ اردو افسانے اور تنقید کی نئی نسل ان سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد انداز کے افسانے اور تنقید سے ہم سبھوں کو متاثر کیا ہے اور زندہ کرداروں سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے عصر کے تمام حوالوں سے بنگال کی سطح پر ادب، فکشن اور تنقید کو نہایت ثمر دار کیا۔ یہ قصہ بہت طویل ہے لیکن یہاں بھی غالب ہی کے ایک شعر کو نقل کر کے استاد محترم انیس رفیع کے ہمراہ اس طویل سفر کو مختصر کرتا ہوں۔

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

■

Zahir Anwar
10/1, Ahiri Puker 1st Lane
P.O. Ballygange
Kolkata - 700019
Mobile : 9831260504
zhr.anwar@gmail.com

محمد حامد علی خاں

آہ! انیس رفیع

7 جون 2025 کو کلکتہ سے ایک مخلص کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے انھیں بعد سلام جوں ہی عیدالاضحیٰ کی مبارکباد دی انھوں نے برجستہ کہا کہ شب کے دو بجے انیس رفیع محبوب حقیقی سے جا ملے۔ کیا ہی مسکاتے ہوئے انسان تھے۔ بڑے خلیق، میانہ سا قد، دراز زلف، بلند پیشانی، گول کلین شیو چہرہ، ناک پہ ٹھہرا ہوا سیاہ فریم کا چشمہ، کسی پہ نگاہ ٹھہری کہ آگے کے سفید دانت صاف دکھائی دیتے۔ بہت ہی سبک آواز نمائندہ الفاظ سے مخاطب ہوتے، چھوٹوں کے کاندھوں پر شفقت کا ہاتھ ضرور دھرتے۔ ادبی گفتگو شروع کرتے تو پوری متانت کے ساتھ رواں رہتے۔ انھیں شکایت کسی سے نہیں تھی۔ حالات کے جبر کا حصہ بتا کر نکل جاتے لیکن ان کے ہم عصروں نے اکثر انھیں نظرانداز کرنے کی کوشش کی، جبکہ انیس رفیع اردو افسانے کا وہ اہم نام رہا ہے جسے صاحب علم ادیبوں نے پہچانا اور ان کے فن سے گفتگو کی۔ ایسے لوگوں میں پروفیسر محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور پروفیسر قمر رئیس اہم ہیں۔ انیس رفیع کا نظریہ فن ملک و سرحد سے پرے انسان دوستی کو افسانہ بنانے کا ہنر ہے جس میں اساطیری توضیحات بھی ہیں اور 1970 کے بعد کی تخلیقی، انحرافی اور توسیعی حسیات و ادراک بھی۔ انیس رفیع کے افسانوں نے جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کا سفر ہی نہیں کیا بلکہ تجربہ کیا ہے، انیس رفیع نے فن کے معیار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اس لیے اپنے تقریباً باسٹھ سالہ افسانوی سفر میں کچھ زائد از ڈیڑھ سو (150) افسانے لکھے۔ مثلاً ان کے صرف تین افسانوی مجموعے 'اب وہ اترنے والا ہے' (1984)، 'کرفیو سخت ہے' (2003)، اور 'گداگر سرائے' (2016) شائع ہوئے۔ ان میں شامل افسانوں کی تعداد ہر چند کہ 75 ہے۔ یعنی پہلے افسانوی مجموعے میں 18 افسانے، دوسرے میں 22 اور تیسرے میں 35 افسانے شامل ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ افسانے رسائل و جرائد اور تالیفات میں بکھرے ہیں۔

انیس رفیع کا افسانوی سفر 1963 سے شروع ہوتا ہے جب مولانا آزاد کالج، کلکتہ میں Pre University کے درجہ میں تھے اور ان کا پہلا افسانہ 'ہیرو۔ نہلے پہ دہلا' کالج میگزین میں شائع ہوا تھا جو پروفیسر نیاز احمد کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہ دراصل Provoked افسانہ تھا جو دوستوں کے اکسانے پر لکھا گیا تھا۔ دوسرا افسانہ اسی سال 'پائل' ویکلی، بمبئی میں شائع ہوا۔ اس طرح انیس رفیع کے یہاں خود اعتمادی آتی گئی اور پروفیسر نیاز احمد ہی کی حوصلہ افزائی پر ان کا تیسرا افسانہ 'شاہکار' شاعر، بمبئی میں 1963 میں شائع ہوا۔ 'شاہکار' دراصل ایک پینٹر اور ایک ماڈل کے نامکمل عشق کی حقیقی داستان تھا لیکن یہ کوئی پیشہ ور پینٹر نہ تھا بلکہ انجینئرنگ کا طالب علم اور پینٹنگ کا عاشق تھا اور انیس رفیع کے حلقہ احباب میں شامل تھا۔ اسی زمانے سے سنجیدہ ادب کے قاری ان کی طرف متوجہ ہوئے اور پروفیسر محمد حسن نے اپنے رسالے 'عصری ادب' کے لیے انیس رفیع سے افسانے کی فرمائش کی اور 'عصری ادب' کے شمارہ نمبر 8 میں ان کا افسانہ 'پولی تھن کی دیوار' شائع ہوا۔ اس شمارے میں کل چار افسانے شامل تھے جن میں دو افسانے 'اداس بدن'، 'سیکنڈ ہینڈ کمرے کا مریض' شفق کے تھے تو 'منظر و پس منظر' فیروز عابد کا لیکن انیس رفیع ترتیب افسانہ میں اوّل تھے۔ اس وقت سید بہاء الدین احمد اس رسالے کے مدیر اور ڈاکٹر محمد حسن کا نام نگراں کے طور پر شامل تھا۔ اس کے بعد انیس رفیع 'شب خون' کی بزم میں شامل ہوئے۔ پھر ملک و بیرون ملک کے تمام رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگے۔ انیس رفیع کے یہاں جو توسیعی حسیات ہے وہ پہلے انھی کی زبانی ملاحظہ ہو:

'اب وہ اترنے والا ہے' اور 'کرفیو سخت ہے' کے بعد میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ افسانے ترسیل کی ناکامی، علامتوں کے زوال، تجریدیت، لایعنیت، مابعد جدیدیت کی تھیوریز پر بحث و مباحثے سے گزرتے ہوئے 'گداگر سرائے' تک آپہنچے ہیں۔ اس مجموعے کو منصۂ شہود پر لانے کی خواہش محض اس لئے ہے کہ ان کی بازخوانی ہو سکے۔ میری تمام لغزشوں کے باوجود آپ کی حوصلہ افزا اور قدر افزا نگاہ نے فن افسانہ سے دو دو ہاتھ کرنے کی جرأت عطا کی۔ اگر یہ آپ کی قرأت اور نظر کے معیار پر پورے اترتے ہیں تو زہے نصیب۔ اگر نہیں اترتے تو سزا کی صورت، کوئی ہو تو، تجویز فرمائیں۔''

(سرِ تحریر، مشمولہ 'گداگر سرائے' 2016، ص 8)

توجہ طلب امر یہ ہے کہ انیس رفیع نے اپنے پہلے اور دوسرے افسانوی مجموعوں پر کوئی حرفِ چند وغیرہ شامل نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی دوسرے کا مقدمہ وغیرہ شامل کیا تھا۔ شاید ایسی تحریریں ان کے نزدیک فن اور قاری کے درمیان جملہ معترضہ ہوں کیونکہ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

انیس رفیع کے پہلے افسانوی مجموعہ 'اب وہ اترنے والا ہے' کا افسانہ 'ترمیم شدہ اوکٹوپس'، ایمرجنسی کے زمانے کا ہے جو 1975 میں شائع ہوا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ اوکٹوپس (Octopus) نہایت ہی خوفناک قسم

کا جانور ہے جو پانی اور خشکی دونوں میں پایا جاتا ہے اس کے آٹھ لچیلے بازو ہوتے ہیں۔ فن کار اس کے ذریعہ اقتدار وقت کے اس قانون کی طرف اشارے کرتا ہے کہ Article-56 کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کس طرح عام شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔

اسے ہم علامتی اور اساطیری کہانیوں کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ 'اب وہ اترنے والا ہے' شعبدہ باز سیاست دانوں کا قصہ ہے۔ انیس رفیع کا یہ افسانہ 'عصری آگہی' کے شمارہ 03 جلد 02 میں بھی شائع ہوا ہے۔

'وش پان کی کتھا' بھی ان کے پہلے مجموعے میں شامل ہے جس کے عنوان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کہانی ہندو اسطوریات پر مبنی ہے یا ہندو علم الاصنام سے متعلق ہے۔ جس کے مطابق بھگوان شیو نے سمندر منتھن کر کے کئی قطرے وش کے حاصل کیے اور پی گئے جس سے ہر چند کہ ان کا کنٹھ نیلا پڑ گیا لیکن زندہ رہے اور اپنی وش پان تپسیا سے خود کو بھگوان منوا گئے۔ اسی طرح اس افسانے میں بھی ایک شخص اسی ذہنی کرب میں مبتلا ہوتا ہے اور خود کو ایسے مقام پر فائز کرنا چاہتا ہے کہ اس کے خیالات کے دھارے میں ایک فوج شامل ہو جائے لیکن یہ ہو نہ سکا اور اس کی جان پر بن آئی۔ اس طرح یہ ایک سبق آموز اسطوری کہانی ہے۔

'سبوتاژ' ان نام نہاد انقلابی لوگوں کا علامتی افسانہ ہے جو بلند بانگ نعروں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں لیکن زیادہ دیر اور دور تک دھوپ کی تپش یا بارش کے تھپیڑے برداشت نہیں کرتے تو اپنے قدم پیچھے کرتے ہوئے پوری قوم اور کئی خاندانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کا افسانہ 'غروب سے پہلے' ایک باغی گاؤں میں ہوئے فوجی کومبنگ آپریشن (Operation Combing) کی روداد ہے۔

'اندر قلعہ' انیس رفیع کا طویل افسانہ اور ایک تاجر عورت کی کہانی ہے لیکن فن کار یہاں Preservation of Old Heritage کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اس کہانی کو پسند کرتے ہوئے اور طوالت کا خیال کرتے ہوئے 'عصری آگہی' کے ناولٹ نمبر میں شامل کیا تھا کیونکہ اس کہانی میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ناولٹ کا خاصہ ہیں۔ انیس رفیع کی یہ کہانی ان کے مجموعہ 'گداگر سرائے' میں شامل ہے۔

'ترتیب' عالمی نظام کی نئی ترتیب کا قصہ ہے جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ساتویں دہائی تک تاریخی اعتبار سے ایک جدید عالمی نظام کے قیام کا زمانہ رہا ہے۔ دو قطبی عالمی نظام کی جگہ کثیر قطبی عالمی نظام قائم ہو رہا تھا جس کے پس پشت اشتراکی نظریے کار فرما تھے۔

انیس رفیع خالص تخلیقی فن کار تھے۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ گہرا تھا اسی لیے وہ اچھے تنقید نگار بھی تھے اور تحقیق کی شد بد بھی رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے خاصی تعداد میں تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ 'تخلیقی فن کار انیس رفیع کی تنقیدی بصیرتیں' صبا نوشاد نے ترتیب دیا ہے۔

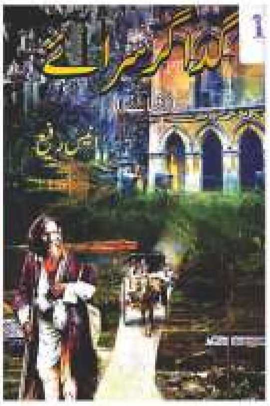

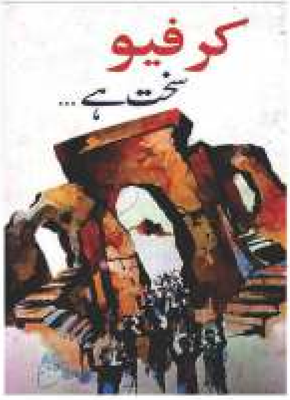

انیس رفیع کا امتیاز خاص یہ بھی رہا کیا کہ انھوں نے کوئی ادبی ٹولی نہیں بنائی۔ انسان سے محبت کی، اس کے مسائل کا تجزیہ کیا، فن کے معیار کو بحال رکھا۔ وہ قاری کے لیے ارتکاز پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور علامتی یا استعاراتی کہانیوں کو بیانیہ روانی کے ساتھ لکھتے ہیں۔

انیس رفیع نے 5 جنوری 1945 کو اپنے وطن موضع سلیم آباد پھلہرا، ڈاکخانہ: اجرا، ضلع ویشالی، بہار میں آنکھیں کھولیں، ان کے والد مجیب الرحمٰن خاں مظہر نے ان کا نام انیس الرحمٰن خاں رکھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم ثانوی درجے تک اپنے وطن میں ہی ہوئی اور 1954 میں کلکتہ چلے گئے کیونکہ ان کے والد کلکتہ کے بڑے چمڑا کاروباری تھے اور اپنا وسیع مکان بھی تھا۔ آٹھویں جماعت تک کی تعلیم CMO ہائی اسکول کلکتہ میں حاصل کی پھر ایم۔ ایل۔ جبلی انسٹی ٹیوشن کلکتہ سے دسویں جماعت مکمل کر کے 1960 میں ہائر سکنڈری تعلیم مغربی بنگال، کلکتہ سے مکمل کی۔ 1965 میں کلکتہ یونی ورسٹی سے بی۔ اے آنرز (پولیٹیکل سائنس) میں اوّل آئے۔ اور اسی یونی ورسٹی سے ایم۔ اے پولیٹیکل سائنس میں کامیابی حاصل کر کے ایل ایل بی کی سند بھی حاصل کی۔ 1969 میں انیس رفیع کا تقرر بحیثیت لیکچرار J.L.College حاجی پور میں ہوگیا۔ لیکن کلکتہ کی کھلی فضا میں انھوں نے جو خواب دیکھے تھے حاجی پور میں اس کی تعبیر دکھائی نہیں دی تو UPSC کے ذریعہ Programme Exetutive AIR منتخب ہو گئے اور جون 1975 میں J.L.College سے مستعفی ہو کر گورکھپور جوائن کر لیا۔ پانچ سال کے قریب گورکھپور میں رہنے کے بعد جون 1980 میں ان کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو، کلکتہ ہو گیا۔ پھر 1985 میں ان کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ میں ہوا۔ 1989 میں اسسٹنٹ کنٹرولر آف پروگرام ہو کر نئی دہلی گئے لیکن دہلی کے دو سالہ قیام کے بعد ہی ان کا تبادلہ دوردرشن، کلکتہ میں ہوگیا۔ یہیں سے 1997 میں Promotion پاکر Station Director دوردرشن آسام، ڈبروگڑھ بھیج دیئے گئے۔ کچھ وقفے کے لیے مظفر پور دوردرشن میں بھی رہے۔ اس طرح 31 جنوری 2005 کو ملازمت کی مدت کار مکمل کر کے سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد کچھ دنوں کے لیے IGNOU میں کاؤنسلر رہے اور 2008 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ماس کمیونیکیشن میں وزیٹنگ فیلو رہے۔ تو کلکتہ کو وطن ثانی بنا لیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ انیس رفیع کی شادی پٹنہ کے مشہور Dentist ڈاکٹر عبدالرشید خاں اکزیبیشن روڈ، پٹنہ کی صاحبزادی نوشابہ خانم سے ہوئی تھی جن سے دو اولاد نرینہ اور ایک بیٹی ہیں۔ بیٹی آسٹریلیا میں ڈاکٹر ہیں جبکہ دونوں بیٹے خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

■

Prof. Md. Hamid Ali Khan
Department of Urdu
B.R.A. Bihar University
Muzaffarpur- 842001 (Bihar)
Mob: 09431073132
Email:-hamidalikhan546@gmail.com

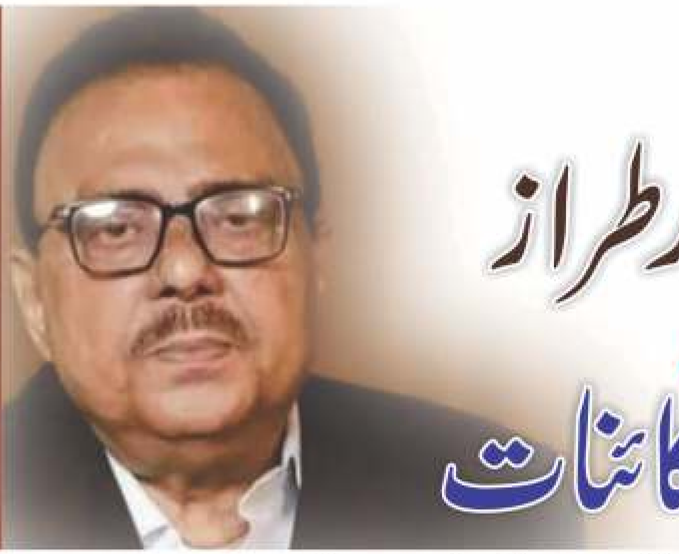

سلیم انصاری

راشد طراز کی شعری کائنات

راشد طراز کی شاعری پر گفتگو کرنے سے قبل یہ وضاحت ضروری ہے کہ میری ان سے کوئی بالمشافہ ملاقات نہیں ہے۔ میں ایک عرصہ سے رسائل و جرائد کے توسط سے ان کی شاعری سے لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے کئی شعری مجموعے بھی عنایت کیے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی ضخیم کلیات 'شعرِ خاکِ منتظر' مجھ تک پہنچی تو مجھے ان کی شاعری کے نہ صرف تفصیلی مطالعے کا موقع ملا بلکہ اپنی مجموعی رائے قائم کرنے میں بھی آسانی ہوئی۔ ان کی کلیات سے ہی مجھے پتہ چلا کہ تقریباً 20 برس کے عرصہ میں ان کے آٹھ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے تخلیقی عمل میں تواتر اور سنجیدگی ہے۔ خاکِ منتظر کے مطالعے سے مجھ پر یہ بھی منکشف ہوا کہ ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے، جس پر زندگی کے مختلف رنگوں سے بنائی ہوئی خوبصورت تصویریں روشن ہیں، جن میں کہیں بھی ابہام یا دہراؤ کا عمل نہیں ہے اور میرے نزدیک کسی بھی تخلیق کار کے لیے یہ ایک بڑی بات ہے۔ راشد طراز کی شاعری کے مطالعے کے دوران شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو کے روایتی یا کلاسیکی شعری سرمایے کا گہرائی کے ساتھ سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اور تخلیقی اظہار کے لیے اپنا ڈکشن وہیں سے مستعار لیا ہے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کے ڈکشن میں تراکیبِ لفظی نئی اور منفرد ہو، لہجہ ان کا اپنا ہو اور اسلوب شعر جدیدیت سے آگے کا منظر پیش کرتا ہو۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ راشد طراز کی شاعری حیرت اور استعجاب کی شاعری ہے، زندگی کی گہری اور دبیز دھند میں امید افزا روشنی کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں ٹوٹے ہوئے گمشدہ خوابوں کی تعبیروں کی تلاش کا جذبہ موجود ہے۔ ان کے یہاں زوال پذیر تہذیبی قدروں کی بازیافت کا عمل شدید ہے۔ یہ سارے عوامل مل کر راشد طراز کی شاعری کا مجموعی منظر نامہ تعمیر کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں برسوں جدیدیت کے علمبردار رسالے شب خون میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں لہٰذا امید کی جا سکتی ہے کہ ان کی بہت ساری غزلیں جدیدیت کے سرخیل ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کی نظروں سے نہ صرف گزری ہوں گی بلکہ انھوں نے evaluate بھی کی ہوں گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے راشد طراز کی شاعری کے بارے میں مثبت رائے قائم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”سب سے پہلے جس چیز نے مجھے راشد طراز کی شاعری کی طرف کھینچا وہ ان کی عدم انفعالیت ہے۔ یعنی ان کے یہاں غزل میں عشق کے جذبے کی کارفرمائی تو ہے لیکن نارسائی، رونے دھونے اور محرومی کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ ان کی غزلوں میں ہجر کے درد کا اظہار تو ہے مگر نا امیدی، رنج اور محزونی کی فضا ان کے یہاں نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ خصوصیت ہے جو راشد طراز کی شاعری کو نہ صرف مختلف فکری اور معنوی دشاؤں میں منعکس کرنے میں کامیاب ہے بلکہ ان کی شاعری کو قابلِ ذکر بھی بناتی ہے۔

راشد طراز بلا شبہ 1980 کے بعد نمایاں طور پر اپنی موجودگی درج کرانے والی ادبی نسل کے ایک بے حد اہم، فعال اور ممتاز شاعر ہیں۔ وہ ایک ایسے باکمال تخلیقی شاعر ہیں جسے پی آر شپ نہیں آتی، وہ کسی ادبی گروہ سے بھی منسلک نہیں ورنہ ان کی شاعری پر اب تک متعدد تحقیقی مقالے اور ریسرچ پیپرز لکھے جا چکے ہوتے، رسائل و جرائد میں خصوصی گوشے اور نمبر نکل چکے ہوتے، ان کی صلاحیتوں کے اعتراف میں مختلف اداروں اور انجمنوں نے قابلِ قدر اعزازات سے سرفراز کر دیا ہوتا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نام نہاد، مفاد پرست اور سکہ بند ناقدین شعر و ادب نے ان کی شعری صلاحیتوں سے دانستہ طور پر چشم پوشی اختیار کی اور خاطر خواہ نوٹس نہیں لیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں جس کا شکوہ کیا جائے مگر افسوس، احتجاج اور ردعمل تو کیا ہی جا سکتا ہے۔

راشد طراز نے اپنی شاعری کے لیے جو فضا تیار کی ہے وہ اگر نامانوس اور اجنبی نہیں تو مانوس بھی نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے اپنی لفظیات کو روایتی یا کلاسیکی شاعری سے مستعار لیا ہے مگر ان لفظوں کی مدد سے استعارات کا جو نظام انھوں نے مرتب کیا ہے، ان سے نہ صرف معنی و مفاہیم کے نئے زاویے روشن ہوتے ہیں بلکہ ان کی شاعری کو نئے ذائقوں سے بھی آشنا کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر علیم اللہ حالی راشد طراز الفاظ کی قوت تاثیر کے قائل بھی ہیں اور اس کو اپنی شاعری میں خوبصورت انداز سے برتتے بھی ہیں۔ الفاظ میں قوت، توانائی بلکہ حدت وغیرہ سبھی کچھ ہوتے ہیں بس انھیں برتنے کا سلیقہ درکار ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ راشد طراز کے یہاں الفاظ کے استعمال میں ایک غیر معمولی ہنرمندی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کو رنگوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر عام اور معمولی نظر آنے والے الفاظ بھی ان کی تخلیقی سوچ سے ہم آمیز ہو کر چہروں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ خواب، آئینہ، چراغ، گھر، زمین، زندگی، سمندر، زخم، زنجیر، دشت، انتظار، امکان، یقین، غبار، ملال اور سفر جیسے عام سے الفاظ ان کے اشعار کو معنویت، گہرائی اور تہہ داری کے نئے موسموں سے آشنا کرتے ہیں۔ یہ الفاظ ان کی شاعری میں بار بار استعمال ہوتے ہیں اور ہر بار زندگی کی جمالیاتی قدروں کی تجسیم و تفہیم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ میں ان کی کلیات 'خاکِ منتظر'

سے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

دوام تیری نظر سے ہے خواب امکاں کو
یقین میرا مقدر ہے تیرے ہونے سے
ہم اہلِ خواب تھے اپنی حدوں میں جیتے رہے
جنون زار کے اظہار تک نہیں پہنچے
و در پہ نقش جو تحریر خواب ہے
روشن جگر کے خوں سے وہ تعبیرِ خواب ہے

خاکِ منتظر کے مطالعے سے ادب کے سنجیدہ قاری پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ راشد طراز نے جن لفظوں کو بطور کلیدی استعارات استعمال کیا ہے وہ ہر دوسری، تیسری غزل میں ایک تواتر کے ساتھ روشن ہوتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے استعارات کے دہراؤ کا یہ عمل ان کے ذہن میں لاشعوری طور پر انجام پاتا ہے، انھیں شاید اس کی خبر بھی نہ ہو۔ خواب ایک ایسا استعارہ ہے جس کا حقیقت سے واسطہ ہے بھی اور نہیں بھی۔ یعنی بغیر خواب دیکھے انسان اپنے مستقبل کا کوئی ٹارگیٹ سیٹ نہیں کرسکتا جب کہ نیند کے دوران دیکھے گئے خواب کی تعبیروں کا اثر مثبت بھی ہوسکتا ہے اور منفی بھی، کئی بار انسان ایسے لایعنی اور absurd خواب بھی دیکھ لیتا ہے جس کی کوئی تعبیر ہی ممکن نہیں ہے، ان سب کے باوجود خواب دیکھنا ایک فطری عمل ہے اور راشد طراز کے یہاں خواب زندگی کی حقیقت کے حصول کا اعلامیہ بھی ہے اور اپنی ذات کے وہم وگمان اور اندیشوں سے رہائی کا ذریعہ بھی۔ وہ انحراف، شکست اور بے یقینی کا الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتے بلکہ ان کی خواہش ہے کہ انھیں زندگی کی مثبت قدروں کا ترجمان سمجھا جائے۔ خواب کی طرح زخم، آئینہ اور چراغ جیسے الفاظ بھی ان کے مافی الضمیر کو پوری طرح ادا کرنے میں کامیاب ہیں۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

کون اپنا ہے یہ اعجاز دکھایا ہے مجھے
زخم نے جینے کا انداز سکھایا ہے مجھے
منتظر آئینہ خانے ہیں نہ جانے کس کے
شہرِ تمثال میں اب تو کوئی چہرہ بھی نہیں
فریب دید ہے یا راستہ چمکتا ہے
پسِ غبار کوئی آئینہ چمکتا ہے
میں جا رہا ہوں بیابانِ آگہی کی طرف
وہاں یقیں ہے اداسی کا آئینہ ہوگا
میری طرف دھواں تری جانب چراغ ہے
دنیا میں کتنا حسبِ مراتب چراغ ہے
میں لوٹ آیا ہوں پھر اپنے خواب زاروں میں
جہاں کے پھولوں میں روشن ہے رنگ و بو کا چراغ
مری نگاہ میں محفوظ ہے جو مثلِ چراغ
وہ خواب بھی اسی ہندوستاں سے آیا ہے
یہ وہ چراغ لہو ہے وفا کے رستے میں
جسے جلایا ہے دل نے دعا کے رستے میں

اشعار کے مزید حوالوں سے گریز کرتے ہوئے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ راشد طراز کی شاعری میں منفرد اور انوکھے استعارات کی اختراع کا عمل فطری اور وہبی ہے۔ آئینہ اور چراغ جیسے استعارے تو قاری کو ایک ایسے جہانِ معنی کی سیر کراتے ہیں جہاں پر شاعر کا ذہن بھی کبھی کبھی مشکل سے پہنچتا ہے۔ انھیں اپنوں کے عطا کردہ زخموں سے روشنی کشید کرکے دوسروں کے راستوں کو روشن کرنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں چراغ اور آئینہ جیسے لفظ فطری طور پر ان کے لاشعور کا حصہ بن گئے ہیں۔ وہ کبھی اپنی آگہی کے بیابان میں یقین وامید کے چراغ روشن کرتے ہیں تو کبھی اپنے خوابوں کے چراغ سے اپنی تنہائیوں کو تابناک بناتے ہیں۔ ان کے یہاں گھر کا استعارہ ان کی تنہائیوں کی پناہ گاہ ہے۔ وہ اپنے چراغ لہو کی روشنی میں اپنے زخموں کو آئینہ کرکے اپنی زندگی کو شعر کرنے کے آرٹ سے خوب واقف ہیں۔ اس طرح دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ راشد طراز کا شعری کینوس بے حد وسیع ہے۔ وہ اپنی شاعری کے لئے خام مواد اپنے اردگرد کے واقعات وحادثات کے علاوہ داخلی تجربات ومحسوسات سے اخذ کرتے ہیں۔ راشد طراز کی شاعری میں کسی بھی طرح کی مذہبی، سیاسی یا نظریاتی وابستگی کی تلاش بے سود ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کی شاعری میں روایتی، جدید اور مابعد جدید شعری رویوں کی نشاندہی بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اچھی شاعری تو بس اچھی شاعری ہوتی ہے جو اپنے عہد کے ادبی حوالوں کا چہرہ ہوتی ہے۔

راشد طراز کی شاعری کے تفصیلی مطالعے نے مجھے حیرت واستعجاب میں ڈال دیا کہ برسوں تک شب خون جیسے جدیدیت کے علمبردار رسالے میں متواتر شائع ہونے کے بعد بھی ان کی شاعری اس علت سے پاک رہی جسے شبخونی جدیدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں مبہم علامتوں اور پیچیدہ استعاروں کے استعمال سے گریز کا سبب چاہے جو بھی ہو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ انھوں نے اپنی سادہ بیانی اور سادگی کو ہی اپنی شاعری کا مثبت حوالہ بنا دیا ہے۔ وہ اپنے گمشدہ خوابوں کی تعبیریں ہی تلاش نہیں کرتے بلکہ ان سے زندگی کی دبیز دھند کے لیے روشنی کشید کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں عشق وحسن، اور ہجر ووصال کے نازک احساسات رقم ہوئے ہیں وہیں ان کے یہاں جبر واستحصال، سیاسی نظام کے عدم استحکام، فرد اور معاشرے کے درمیان ٹوٹتے رشتے اور تہذیب کے زوال کا نوحہ بھی ہے۔

یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے راشد طراز نے جو ڈکشن اختیار کیا ہے وہ براہِ راست ہے اور سادگی سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں منفرد اور انوکھی تراکیبِ لفظی کو تراشنے کا عمل شدید ہے جن کے سبب ان کی شاعری معنویت کی سطح پر روشن اور تابناک ہو جاتی ہے۔ ان تراکیب میں ان کی کلیات کے عنوان خاکِ منتظر کے علاوہ تنہائی کی تصویر بنانا، سائے کے ہمراہ چلنا، خامشی کا چہرہ، روشنی کی زبان، اجالے کی حمایت، آئینۂ چراغ، آسودۂ پندار، بازی گرانِ شہر، قیمتِ پندار، آئینۂ ذات، چراغ ہجر اور خوابوں کا اجنبی ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ساری تراکیب لفظی، فطری اور غیر شعوری طور پر راشد طراز کی شاعری کا حصہ ہیں اور ان کے شعری ارتقا میں ممد ومعاون بھی۔ ان کی کلیات 'خاکِ منتظر' میں نئی اور نادر ردیف میں بھی کئی غزلیں شامل کی گئی ہیں جن سے ان کی تخلیقی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

راشد طراز کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے جو قارئین دریافت کیے ہیں وہ سنجیدہ ہیں اور نہ صرف عصری شعور وآگہی رکھتے ہیں بلکہ انسانی زندگی کے نشیب وفراز سے بھی واقف ہیں۔ انھوں نے شاعری کا جو لہجہ تراشا ہے وہ براہِ راست ذہن ودل میں اتر جانے والا ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ راشد طراز کا شعری سفر جاری ہے اور ان کے تخلیقی سوتے شاداب ہیں لہٰذا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل میں 'خاکِ منتظر' سے آگے کا شعری منظر نامہ پیش کریں گے۔

■

Saleem Ansari
HIG-3 , Anand Nagar
Adhartal
Jabalpur-482004 (MP)
ansarisaleem320@gmail.com

صبا نسیم

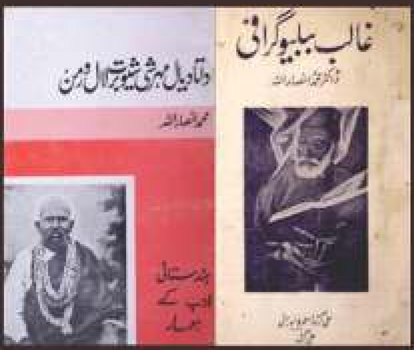

محمد انصار اللہ کی ادبی خدمات

محمد انصار اللہ (1936-2017) ان محققین میں سے ہیں جنھیں اردو زبان و ادب کے قدیم سرمائے سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ انھوں نے 1967 سے 1996 تک شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچرر، ریڈر اور پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ درس و تدریس کے ساتھ ہی انھوں نے تحقیق و تدوین، تاریخ و تنقید، لسانیات، ترجمہ اور لغت نویسی جیسے موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

محمد انصار اللہ کی پہلی قابل ذکر کتاب 'اردو کے حروف تہجی' 1972 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا حصہ بعض اہم مباحث پر محیط ہے مثلاً اردو نے فارسی رسم خط کیوں اختیار کیا؟ اردو تحریر پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اردو رسم خط میں حروف تہجی کی نوعیت کیا تھی؟ ماضی میں حرف کی ساخت کس طرح تبدیل کی گئی؟ نئی آوازوں کے لیے نئے حروف کیونکر وضع کیے گئے؟ حرف وضع کرنے کا طریقہ کیا رہا اور ترمیم و اضافے کے لیے کن اصولوں کی پابندی کی گئی؟ کیا موجودہ حروف میں سے بعض کو ترک کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ دوسرے حصے میں اسی موضوع پر میرزا روشن ضمیر کے رسالے 'سہ ضابطۂ ہندی' کے متن کو مختصر تعارف کے ساتھ شامل کیا ہے۔ اردو میں نئے حروف کس طرح وضع کیے گئے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد انصار اللہ نے لکھا ہے:

''اردو اپنی لسانیاتی خصوصیات کی بنا پر بھی عربی یا فارسی سے مختلف ہے اس زبان کی تمام آوازوں کے اظہار کے لیے عربی یا فارسی کے حروف کفایت نہیں کر سکتے تھے۔ نئے حروف کا وضع کیا جانا ناگزیر تھا۔ لیکن ان نئے حروف کی صورت فارسی کے حروف سے مختلف مقرر کرنا مناسب نہ تھا۔ فارسی میں بھی جب نئے حروف بنائے گئے تھے تو نقطوں اور مرکز کے اضافے سے کام چلا لیا گیا تھا، اردو والوں نے بھی اصولاً نقطوں کی کمی بیشی سے ہی اپنی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کی۔''1

اردو زبان کی اپنی کچھ ضرورتیں تھیں جو عربی فارسی حروف سے پوری نہیں ہو سکتی تھیں مثلاً اعلان نون اور ادغام نون کا مسئلہ، یائے معروف اور یائے مجہول کا مسئلہ وغیرہ۔ انیسویں صدی کے ربع ثالث میں جاکر یائے معروف اور یائے مجہول کو الگ الگ حروف کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح عربی اور فارسی میں ہائے مخلوط کا کوئی تصور نہیں ملتا لیکن ہندوستانی الفاظ میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ انصار اللہ کے مطابق دہلی میں اس کی اہمیت کو بہت بعد میں تسلیم کیا گیا جب کہ لکھنؤ میں اس کی اہمیت کا احساس شروع سے تھا۔ اسی لیے تحریر میں ہائے مخلوط سے پیدا ہونے والے مسائل کی طرف انیسویں صدی کے ربع ثانی میں توجہ کی جانے لگی اور کچھ عرصے بعد ہائے مخلوط سے بننے والے مرکب حروف کی الگ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔

تین مقامی آوازیں جو اردو نے اپنے ارتقا کے دوران اختیار کی ہیں 'ٹ'، 'ڈ' اور 'ڑ' کی ہیں۔ مختلف زمانے میں 'ٹ'، 'ڈ'، اور 'ڑ' کی آوازوں کے لیے اردو رسم خط میں جو صورتیں اختیار کی گئیں محمد انصار اللہ نے ان کی بھی نشاندہی کی ہے مثلاً ابتدا میں 'ت'، 'د' اور 'ر' لکھ کر ہی ان مقامی آوازوں کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہ صورتیں عہد محمد شاہی تک ملتی ہیں۔ جلد ہی ان کی جداگانہ صورت کے تعین کی ضرورت محسوس کی گئی اور تین نقطے بنائے گئے۔ پدماوت اور فضلی کی کربل کتھا کے نسخے (مختار الدین احمد) میں یہی صورت ملتی ہے۔ اس نسخے کی کتابت شاہ عالم کے عہد سے پہلے نہ ہوئی ہوگی۔ تین نقطے میں دقت یہ پیش آئی کہ 'ٹ' اور 'ڑ' کی صورت 'ث' اور 'ژ' سے مشابہ ہوگئی اس لیے مزید تبدیلی یہ کی گئی کہ ایک اور نقطے کا اضافہ کر دیا گیا۔ پدماوت (نسخۂ انجمن نوشتۂ 1686) میں 'ٹ' پر چار نقطے (ٹ) بنائے گئے ہیں۔ دہلی میں یہ سلسلہ بہت بعد تک جاری رہا۔ غالب کی آخری عمر تک کی تحریروں میں یہ صورت ملتی ہے۔ مزید آسانی کے لیے اوپر کے دو نقطوں کو ملا کر مختصر خط کی صورت میں لکھا جانے لگا۔ 'ڈ' اور 'ڑ' کے اوپر دو نقطے زائد معلوم ہوئے تو ان کو حذف کر دیا گیا۔ اورنگ زیب کے زمانے تک یہی صورت برقرار رہی۔ فورٹ ولیم کالج نے ان حرفوں کو نئی صورت دی یعنی نقطے ہٹا کر مختصر 'ط' بنایا اور یہی طریقہ آج مروج ہے۔

اردو کے حروف تہجی کی بابت یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک ہی آواز کے لیے ایک سے زائد حروف ہیں جیسے:

ا ع ء

ث س ص

ذ ز ض ظ

جس کی وجہ سے تحریر میں دقت پیش آتی ہے اور غلطی کا امکان بڑھ جاتا ہے اس لیے مسعود حسین خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ کسی ایک کو برقرار رکھتے ہوئے باقی کو ترک کر دیا جائے۔ محمد انصار اللہ اس تجویز کے سخت خلاف ہیں:

''یہ تجویز بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ان مختلف حرفوں کی آواز ایک نہیں ہے ہاں مماثل ضرور ہے۔ لیکن مماثل ہونا اور ایک ہونا ایک بات نہیں ہے۔ اختلاف خواہ کتنا ہی لطیف ہو بہر حال اختلاف ہے اور اس کا اعتبار کیا جانا چاہیے۔لطیف ترین فرق کا بھی اظہار خوبی ہے نہ کہ عیب اس لیے ان مماثل آوازوں والے حرفوں پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''[2]

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آوازوں سے بہت سے الفاظ اردو میں داخل ہوئے ہیں ان الفاظ کا اپنی اصل زبانوں میں ایک گردانی نظام ہے جس کے ذریعے بہت سے الفاظ بنتے ہیں اور جس سے زبان میں ثروت مندی آتی ہے اگر مسعود حسین خاں کی تجویز کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے زبان محدود ہو کر رہ جائے گی۔

محمد انصار اللہ کی دوسری کتاب 'پدماوت کی مختصر فرہنگ' (1972) ہے جس میں انھوں نے ملک محمد جائسی کی کتاب 'پدماوت' کی فرہنگ تیار کی ہے۔ مقدمے میں محمد انصار اللہ نے ملک محمد جائسی کے سوانحی حالات اور ان کی تصانیف کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ساتھ ہی اس زمانے کی لسانی صورت حال کا جائزہ لے کر پدماوت اور اودھی زبان کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

کتاب 'قاعدۂ ہندی ریختہ' (عرف رسالہ گلکرسٹ) کو انصار اللہ نے اپنے معلوماتی مقدمے اور تفصیلی حواشی کے ساتھ 1973 میں مرتب کیا۔محمد انصار اللہ کو اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ مہر الٰہی کی مدد سے حاصل ہوا۔ اس نسخے کا انداز کتابت قدیم ہے کیونکہ یہ نسخہ بنارس میں لکھا گیا اس لیے اس علاقے کی بولی اور لب و لہجے کے اثرات اس میں نمایاں ہیں۔محمد انصار اللہ نے اپنے ایڈیشن میں جدید قواعد املا کی پیروی کی ہے اور قدیم املا کی خصوصیات کو حواشی میں بیان کر دیا ہے لیکن ضرورت کے مطابق متن میں بھی املا یا تلفظ کی اصل صورت کو قائم رکھا ہے۔

'قاعدۂ ہندی ریختہ' انیسویں صدی کے اوائل کی تصنیف ہے اور موجودہ معلومات کے مطابق 1820 میں پہلی بار شائع ہوئی۔خلیل الرحمٰن داؤدی نے 1972 میں اس کے کئی مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ایک نیا ایڈیشن شائع کیا۔ان کے مطابق یہ کتاب میر بہادر علی حسینی کی تصنیف ہے۔داؤدی اور دوسرے محققین نے مولوی کریم الدین کے بیان سے استفادہ کرتے ہوئے یہ بات لکھی ہے جنھوں نے اسے میر بہادر علی حسینی سے منسوب کیا ہے۔انصار اللہ نے اس سلسلے میں اپنا تحقیقی موقف پیش کیا ہے۔ان کے مطابق محض کریم الدین کی شہادت کی بنا پر اس کتاب کو میر بہادر علی کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا کیونکہ تا حال رسالہ گلکرسٹ کے ایسے قدیم مطبوعہ نسخے موجود ہیں جن کے سرورق پر صراحت کے ساتھ گلکرسٹ کا نام اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپا ہے اور میر بہادر علی حسینی کا نام ضمناً بھی اس کتاب میں کہیں نہیں آیا۔

انھوں نے بعض قدیم کتابوں پر کام کیا جو اب تک محتاج تحقیق تھیں اور بہت سے اہم حقائق کی پردہ کشائی کر کے پچھلے محققین کے نظریات پر سوال اٹھائے۔ تاریخ زبان کے سلسلے میں انھوں نے ہندوستان کی سیاسی و تمدنی تاریخ کو پیش نظر رکھا اور اودھی کو اردو کا ماخذ قرار دیا۔حالانکہ اس نظریے کو ابھی تک قبول نہیں کیا گیا ہے اور یہ مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

محمد انصار اللہ نے تاریخ اقلیم ادب (1979) کے نام سے اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ بھی مرتب کی ہے۔اس تاریخ کو مرتب کرنے کے پیچھے انصار اللہ کا مقصد ایک ایسی تاریخ لکھنے کا تھا جو تحقیقی اعتبار سے جامع ہو اور جس میں تاریخ کی دوسری کتابوں کی طرح تحقیقی خامیاں نہ ہوں۔انھوں نے اس تاریخ کو خود ہی چھپوایا لیکن دو حصے مکمل ہونے کے بعد کسی وجہ سے وہ اس کام سے بددل ہو گئے اور اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ ایک طرف تو محمد انصار اللہ نے یہ دعویٰ کیا کہ طلبہ کے لیے جو ادبی تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ تحقیقی اعتبار سے ناقص ہیں اس لیے وہ نصابی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی تاریخ تیار کر رہے ہیں جس میں معتبر اور تازہ ترین تحقیقات کو اختصار کے ساتھ پیش کر دیا جائے لیکن دوسری طرف انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کتاب میں کہیں بھی اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے نہ ہی حواشی اور کتابیات کا حوالہ دیا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کی تحقیقی اہمیت مجروح ہو گئی ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ محمد انصار اللہ نے کلب حسن خاں نادر کی کتاب 'تلخیص معلیٰ'، عبد الغفور خاں نساخ کے دو رسالے 'قطعۂ منتخبہ' اور 'زبان ریختہ'، مقصود کا بارہ ماسہ موسوم بہ 'برہمن کی کہانی' اور ملا داؤد کی 'چنداین' وغیرہ کو بھی مرتب کیا ہے۔ ان کتابوں پر ان کے مقدمے اور حواشی ان کے وسیع مطالعے اور محققانہ انداز فکر کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ 'تلخیص معلیٰ' میں شیخ امام بخش ناسخ اور میر اوسط علی رشک کے مجوزہ اصلاح زبان کے اصول درج کیے گئے ہیں۔اس کتاب کو انصار اللہ نے 1975 میں انجمن ترقی اردو پاکستان اور 1976 میں علی گڑھ سے شائع کیا۔اسی طرح انھوں نے عبدالغفور نساخ کے 'رسالہ زبان ریختہ' کو، جس میں نساخ نے زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے عہد کے شعرا کی ایک ایک غزل نمونے کے طور پر درج کی ہے، 1977 میں علی گڑھ سے شائع کیا۔ملا داؤدی کی چنداین (سنہ تصنیف 779ھ/ 1377) لسانیاتی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔انصار اللہ نے اس کے متن کی تصحیح کی۔اس میں شامل الحاقی کلام کو الگ کیا اور اس کے ہر شعر کا ترجمہ بھی کر دیا ہے نیز حواشی میں مشکل الفاظ کی وضاحت کر دی ہے۔یہ کتاب 1996 میں ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ سے شائع ہوئی۔

محمد انصار اللہ نے اپنی تحقیق کا مرکز اردو زبان کو بنایا اور اس کے آغاز و ارتقا سے متعلق ایک مخصوص نظریہ پیش کیا۔انھوں نے بعض قدیم کتابوں پر کام کیا جو اب تک محتاج تحقیق تھیں اور بہت سے اہم حقائق کی پردہ کشائی کر کے پچھلے محققین کے نظریات پر سوال اٹھائے۔ تاریخ زبان کے سلسلے میں انھوں نے ہندوستان کی سیاسی و تمدنی تاریخ کو پیش نظر رکھا اور اودھی کو اردو کا ماخذ قرار دیا۔حالانکہ اس نظریے کو ابھی تک قبول نہیں کیا گیا ہے اور یہ مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

محمد انصار اللہ کی تمام کتابوں میں ان کے مخصوص لسانی تصور کی وضاحت ملتی ہے۔ان کے مطابق تحقیقی نقطہ نظر سے شہر دہلی کو اردو کا مولد کہنا صحیح نہیں کیونکہ اوّل تو اس روایت کو اہمیت دینے میں بزرگان دہلی کا جذبۂ تفاخر بھی شامل ہے اور دوم یہ کہ مسعود حسین خاں نے اپنے نظریے کے لیے محض دہلی اور اس کے مضافات کی بولیوں کو ہی بنیاد بنایا ہے۔جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اردو کے آغاز کے سلسلے میں وہ اس بات سے تو متفق ہیں کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ سنسکرت کو اردو اور باقی ہندوستانی زبانوں کا ماخذ تسلیم نہیں کرتے۔اودھی کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ عام لوگوں کی بولی رہی ہے۔اس کی قواعد سنسکرت سے بہت مختلف ہے اور اس کا سلسلہ سنسکرت کے بجائے ملک کی قدیم بولی سے ہوسکتا ہے۔ زبان اردو کی قواعد کو بھی سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ مغربی ہندی کے تصور کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ اردو اور کھڑی بولی کے متعلق انصار اللہ کا خیال ہے کہ اردو اور کھڑی بولی کا تعلق 'آ' کی شکل رکھنے کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔انھوں نے ایک نقشے کے ذریعے افعال کی کیفیت ظاہر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ افعال کی حد تک واحد مذکر کی حالت میں ہی 'آ' کی آواز ملتی ہے۔جمع مذکر، واحد مونث اور جمع مونث کی حالتوں میں 'آ' کی آواز بالکل نہیں ہے۔حرف، اسما اور ضمائر کے ساتھ بھی یہی صورت حال ہے۔ انھوں نے اردو قواعد سے متعلق گفتگو کی ہے اور اردو قواعد کے مسائل کو اودھی قواعد کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے:

''اردو قواعد کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں اکثر الجھے ہوئے معاملات کو مستثنیٰ یا خلاف قیاس کہہ دینے پر اکتفا کر لی گئی ہے مثلاً چڑیا اور کتیا مونث ہیں باوجود یہ کہ ان کے آخر میں الف موجود ہے۔اِن کو مستثنیات میں شمار کیا گیا ہے لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ 'چڑا' اور 'کتا' کے الف آخر کو جو علامتِ تذکیر ہے ،یاے معروف سے جو علامت تانیث ہے بدلیں تو 'چڑی' اور 'کتی' حاصل ہوگا۔پورب والے اکثر اسما کے آخر میں الف زاید لاتے ہیں۔ چنانچہ لڑکی سے لڑکیا، گھوڑے سے گھوڑیا اور بکری سے بکریا بنا لیتے ہیں، اسی طور پر چڑی سے چڑیا اور کتی سے کتیا ہو جاتا ہے۔تذکیر و تانیث میں اس الف زاید کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔3

انصار اللہ کے مطابق علمائے لسانیات نے بعض روایتوں پر اعتماد کر کے اپنی تلاش و تحقیق کو دہلی و نواح دہلی تک ہی محدود رکھا۔جس کی وجہ سے وہ اردو کے سلسلے میں سب سے اہم بولی یعنی اودھی کو نظر انداز کرتے رہے اس لیے اودھی کے شاعروں کو بھی 'مضافات دہلی' کی بولیوں کا شاعر سمجھ لیا گیا۔

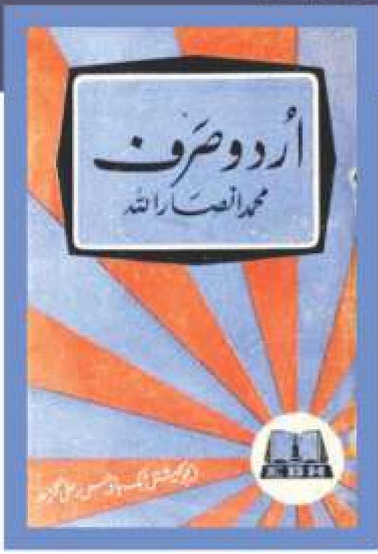

ان کے مطابق علمائے لسانیات نے بعض روایتوں پر اعتماد کر کے اپنی تلاش و تحقیق کو دہلی و نواح دہلی تک ہی محدود رکھا۔جس کی وجہ سے وہ اردو کے سلسلے میں سب سے اہم بولی یعنی اودھی کو نظر انداز کرتے رہے اس لیے اودھی کے شاعروں کو بھی 'مضافات دہلی' کی بولیوں کا شاعر سمجھ لیا گیا۔انھوں نے اپنی بیشتر کتابوں میں اودھی کو اردو کا ماخذ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں موقع بہ موقع اردو پر اودھی یا پوربی کا اثر دکھایا ہے۔مثلاً تاریخ اقلیم ادب (1979) ص 18 پر انھوں نے دہلی کی زبان کے متعلق لکھا ہے:

''اس قدیم زمانے میں پوربیوں کی اتنی بڑی تعداد کے اثر سے لسانی اعتبار سے گویا دہلی بھی پوربیوں کا شہر ہو گیا تھا''4

حالانکہ دہلی کی قدیم زبان کے نمونوں سے ایسی معتبر شہادتیں سامنے نہیں آئیں ہیں کہ وہاں کی زبان پر پوربی کے غلبے کو تسلیم کیا جا سکے۔اسی کتاب میں سولھویں صدی کے تحت انھوں نے ص 59-58 پر اودھی کے سنت روی داس کی شاعری کا نمونہ دے کر اسے اردو ادب کا حصہ خیال کیا ہے جب کہ ان کے علاوہ کسی نے بھی روی داس کی شاعری کو اردو نہیں کہا ہے۔محمد انصار اللہ نے اودھی کو اردو کا ماخذ ثابت کرنے کے لیے جو دلائل پیش کیے ہیں ان پر گیان چند نے بعض اعتراض کیے ہیں: مثلاً:

''سب سے زیادہ قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی پورب پسندی سے گشتہ ہو کر اودھی کے شعرا کو بھی اردو میں شامل کر لیتے ہیں۔ان کی زبان کو نام دیتے ہیں ہندوی۔انھوں نے ملک محمد جائسی، کبیر، تلسی داس، ملا داؤد مصنف چنداین، شیخ عثمان مصنف چترا ولی وغیرہ سب کو اردو کا شاعر کہا ہے۔اگر تلسی داس اور کبیر اردو کے شاعر ہیں تو وہ اتنے عظیم ہیں کہ انھیں وجہی، ابن نشاطی اور نصرتی وغیرہ سے زیادہ جگہ دینی چاہیے۔اگر اودھی کو اردو میں شامل کرتے ہیں تو برج راجستھانی ،بھوج پوری اور بندیلی وغیرہ کے شعرا کو کیوں نہیں۔ اس طرح اردو کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور وہ ہندی میں ضم ہو جائے گی اور ہندی کی ایک بولی یا شیلی (اسلوب) ہو کر رہ جائے گی۔اردو نے صرف کھڑی بولی اور اس سے پیدا ہونے والی دکنی کو اپنایا ہے۔ دوسری بولیوں کو اپنے حصار میں نہیں لیا۔''5

یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان کی ساخت اور داخلی اوصاف کی بنیاد پر اودھی اردو زبان سے بڑی حد تک مختلف ہے لہٰذا اردو سے اس کا ادبی رشتہ تو ہوسکتا ہے، لسانی نہیں تاہم محمد انصار اللہ نے مزید تحقیق کے لیے ایسا مواد ضرور فراہم کر دیا ہے جو ابھی تک ہماری دسترس سے باہر تھا۔

حواشی

1 محمد انصار اللہ ،اردو کے حروف تہجی، 1972،لیتھو پرنٹرس، علی گڑھ،ص 34
2 ایضاً،ص 49-48
3 محمد انصار اللہ، قاعدۂ ہندی ریختہ، 1973،لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ،ص 40
4 محمد انصار اللہ، تاریخ اقلیم ادب، 1979،لیتھوکلر پرنٹرس علی گڑھ،ص 15
5 گیان چند جین، اردو کی ادبی تاریخیں، 2000،ص 617

Dr. Saba Naseem
Milkipura
Mahoba-210427 (U.P)
Email id: nsaba0848@gmail.com

محمد زبیر

پروفیسر انور ظہیر انصاری کا ادبی سفر

مئوناتھ بھنجن مشرقی اتر پردیش کا ایک صنعتی شہر ہے۔ پارچہ بافی اس شہر کی اہم شناخت ہے۔ یہ علم و ادب اور تہذیب وثقافت کا مرکز بھی ہے۔ اردو کے معروف شاعر فضا ابن فیضی (1922-2008) اور اثر انصاری (1923-2007) کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ جدیدیت کے رو نما اور رسالہ 'شب خون' کے بانی شمس الرحمٰن فاروقی (1935-2020) کا آبائی وطن ضلع مئو کا قصبہ کوڑیا پار ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر انیس ادیب، ڈاکٹر منور انجم، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اور ڈاکٹر شکیل احمد جیسے ادیبوں کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ انھی ادیبوں اور اہل قلم میں ایک نام پروفیسر انور ظہیر انصاری کا بھی ہے جنھوں نے اپنے علم وفن سے اردو ادب کی خوب آبیاری کی ہے۔

پروفیسر انور ظہیر انصاری اردو ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ وہ اتر پردیش کے شہر مئو ناتھ بھنجن میں یکم اکتوبر 1953 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مشتاق منیر تھا۔ انور ظہیر نے مقامی اسکولوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور گورکھ پور یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد دلی کا رخ کیا اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ایم اے، ایم فل اور ایڈوانس ڈپلوما ان ماس میڈیا ان اردو کی اسناد حاصل کیں۔ 85-1984 میں آل انڈیا ریڈیو اور دہلی دور درشن نیوز سیکشن میں ملازمت کی اور شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے یو جی سی پروجیکٹ سے بھی وابستہ رہے۔ بقول انور ظہیر انصاری "زندگی کے چند ادوار میں سے JNU کا زمانہ شاید میری زندگی کا سب سے خوش گوار اور روشن زمانہ رہا ہے اور اس کا کریڈٹ محمد اسعد (دری یونٹ آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی) کو جاتا ہے جن کی وساطت سے میں جے این یو تک پہنچ سکا۔"[1]

پروفیسر انور ظہیر انصاری نے 1986 میں دہلی کی ملازمت ترک کر دی اور بڑودہ گجرات چلے گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی۔ فروری 1986 میں ایم ایس یونیورسٹی آف بڑودہ میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ 1990 سے بورڈ آف اسٹڈیز، شعبۂ اردو، فارسی اور عربی، ایم ایس یونیورسٹی آف بڑودہ کے ممبر رہے اور سبکدوش ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یوں تو ان کو ریڈر شپ 1998 میں ملنی تھی لیکن بوجوہ چھ سال بعد 2004 میں ملی اور پروفیسر شپ 2012 میں ایم ایس یونیورسٹی آف بڑودہ سے ان کی وابستگی تقریباً تین دہائیوں تک رہی۔ 2015 میں پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد بھی اس یونیورسٹی کو پروفیسر انور ظہیر انصاری کی مزید ضرورت تھی اس لیے نئی پوسٹنگ ہونے (2017) تک وہ ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان تیس برسوں میں انھوں نے کم و بیش دو نسلوں کی ذہنی آبیاری کی ہے۔

پروفیسر انور ظہیر انصاری کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے کل تین مقالے لکھے گئے۔ ان میں ولی کی شخصیت اور شاعری پر مسیح الزماں انصاری نے، کیفی اعظمی کی حیات و نگارشات پر نسرین شیخ نے اور دیپک بدکی کی تخلیقات پر شیخ صفیہ بانو نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اردو کے ساتھ ہندی زبان پر بھی بڑی گہری پکڑ تھی، یہی سبب ہے کہ ہندی اردو کہانیوں پر لکھی گئی تھیسس کے کو گائڈ بھی رہے۔

ایک اہم اور انوکھی بات یہ ہے کہ خود انھوں نے اپنی پی ایچ ڈی اسی یونیورسٹی سے مکمل کی ہے اور وہ بھی کسی گائڈ اور نگراں کے بغیر۔ انھوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ساحر کی شعری و ادبی تخلیقات پر لکھا ہے۔ ساحر پر تحقیقی وتنقیدی کتاب 'ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے' ان کی پی ایچ ڈی کا ہی مقالہ ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مضامین پر مشتمل کتابیں 'شعورِ ادب' (2007)، 'اردو کا شعری اثاثہ اور نئے وارث' (2013) اور دیپک بدکی کی حیات اور ادبی خدمات پر بھی ایک کتاب 'ورق ورق آئینہ' (2009) کے نام سے شائع ہو چکی ہے ان کے علاوہ منشی سید عباس علی کی کتاب 'قصۂ غم گین' کا انھوں نے ہندی میں ترجمہ بھی کیا، یہ کتاب ایم ایس یونیورسٹی ہسٹری ڈپارٹمنٹ نے شائع کیا ہے۔

درس و تدریس کے دوران گجرات اسٹیٹ ٹکسٹ بکس بورڈ، گاندھی نگر کے زیر اہتمام نویں اور بارہویں جماعت کی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور تبصرے کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ 1992 اور 1995 میں نویں اور بارہویں جماعت کی کتابوں کے لیے انھوں نے بحیثیت مبصر اور 1993 اور 1994 میں دسویں اور گیارہویں جماعت کی کتابوں کے لیے بحیثیت مولف کام کیا۔ علاوہ ازیں سی بی ایس سی بورڈ سے متعلق کتب کی تدوینی کمیٹی این سی ای آر ٹی نئی دہلی

کی تقریباً سات کتابوں کے ایڈیٹوریل بورڈ سے وابستہ رہے اوراین سی پی یو ایل نئی دہلی کی تخلیقی کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔

پروفیسرانور ظہیر انصاری ہندوستان کی کئی یونیورسٹیز میں اکسپرٹ ممبر بھی رہے۔ تقریباً تیس ایم فل اور پی ایچ ڈی تھیسس اکزامن کر چکے ہیں، ان کے علاوہ کئی یونیورسٹی کے بورڈ میں اکسپرٹ ممبر بھی رہے۔ پروفیسر شپ کے زمانے میں جے پی جے ٹی یونیورسٹی جھن جھنو راجستھان نے انھیں اپنے یہاں پی ایچ ڈی گائڈ مقرر کیا تھا اوراس سلسلے کا پہلا پی ایچ ڈی رجسٹریشن احمد آباد کی شاہ نور نے لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ دوسری یونیورسٹیز میں Extensive lecture اور Refresher courses میں بھی متعدد بار بلائے گئے۔ مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں سے آخری وقت تک وابستہ رہے اور کام کو بخوبی انجام دیتے رہے پھر بھی ان کا کہنا ہے کہ میں تو اس ساگر میں ایک بوند کی طرح ہوں، بے حیثیت اور بے مقام۔

درس وتدریس سے وابستگی کے دوران تحقیقی وتنقیدی مضامین تواتر سے شائع ہوتے رہے۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری کے مختلف موضوعات پر مطبوعہ مضامین کی تعداد 60 سے زائد ہے جن میں گجرات اور اردو ادب، پروفیسر وارث علوی، گجرات میں تصوف کی روایت، اردو زبان کا سیکولر کردار (ترقی پسند حوالے سے)، تذکروں کی تنقیدی اہمیت، موسیقار اعظم نوشاد کی فکری وفنی جہتیں، مولانا ابوالکلام آزاد، علی سردار جعفری ، اختر الایمان، مجاز لکھنوی، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، فراق گورکھ پوری، داغ دہلوی، شہریار، مولانا رومی ، فضا ابن فیضی اور ولی دکنی وغیرہ اہم ہیں۔ اصناف ادب سے متعلق بھی انھوں نے متعدد مضامین سپرد قلم کیے، مثلاً اردو غزل، مثنوی، مرثیہ، سہرے، دوہے، حمد یہ نعتیہ شاعری ایسے کتنے مضامین ہیں جو کتاب نما دہلی، آج کل دہلی، ایوان اردو دہلی، اردو دنیا دہلی، سب رس حیدرآباد، نیا دور لکھنؤ، ترسیل سالنامہ (کشمیر یونیورسٹی، سری نگر)، خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ، سابر نامہ احمد آباد، گلبن احمد آباد اور لکھنؤ، رنگ و بو حیدرآباد، نوائے ادب ممبئی، ہندوستانی زبان ممبئی، اردو نامہ ریسرچ اور ریفریڈ جرنل ممبئی، ترسیل ممبئی، رنگ دھنک و بہار، انتساب سرونج، توازن مالے گاؤں جیسے متعدد موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ مختلف ریاستی، قومی اور بین الاقوامی سیمناروں میں پڑھے گئے مقالوں کی تعداد تقریباً 72 ہے۔

پروفیسر انور ظہیر انصاری کی متعدد کتابیں شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔ ان کی اولین کتاب 'ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے' ان کا تحقیقی مقالہ ہے، یہ کتاب پہلی بار 2004 میں شائع ہوئی جسے اہل علم نے خاصا پسند کیا کیونکہ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو ساحر کے فکر وفن کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب پر اردو کے متعدد ناقدین ادب نے اپنے تاثرات پیش کیے جو کتاب کے فلیپ پیج پر درج ہے۔ ان میں سے چندکو یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

> پروفیسر انور ظہیر انصاری ہندوستان کی کئی یونیورسٹیز میں اکسپرٹ ممبر بھی رہے۔ تقریباً تیس ایم فل اور پی ایچ ڈی تھیسس اکزامن کر چکے ہیں، ان کے علاوہ کئی یونیورسٹی کے بورڈ میں اکسپرٹ ممبر بھی رہے۔

''ساحر پر آپ کی کتاب ملی اندازہ ہوا کہ اچھے لکھنے والوں کا کلام تا دیر زندہ رہتا ہے اور وقتی رجحانات سے بلند تر ہوتا ہے۔ کتاب پوری پڑھ ڈالی آپ نے واقعی بڑی محنت اور دیانت داری اور واقفیت سے کتاب لکھی ہے۔'' (پروفیسر محمد حسن)

''جستہ جستہ کتاب دیکھی تو خوشی ہوئی کہ ساحر کے مطالعے میں وقیع مواد جمع کیا۔ پختہ طرز تحریر، معیاری تحقیق، روشن استدلال، کتاب میں ساحر لدھیانوی کی سوانح، ادبی شخصیت اور شاعری کی مختلف جہات کا علمی گہرائی سے احاطہ کیا گیا ہے۔'' (پروفیسر قمر رئیس)

''آپ نے ریسرچ کے مرحلے میں بڑی محنت کی ہے۔ ساحر پورا کا پورا موجود ہے زندگی سے لے کر شاعری کا سفر جس طرح شاعر نے طے کیا ہے اس کا تجزیہ خوب ہے۔'' (پروفیسر وہاب اشرفی)

ان ناقدین کے تاثرات نے کتاب کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 2018 میں شائع ہوکر اہل ادب سے داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں صرف چار ابواب ساحر کی سوانح اور شخصیت، ساحر کی نثر نگاری، ساحر کی غزل گوئی اور ساحر کی فلمی شاعری شامل تھے۔ لیکن دوسری اشاعت میں دیگر اصناف سخن کے عنوان سے ایک باب کا اضافہ ہوا ہے جس میں ساحر کے مرثیے، ساحر کے سہرے اور ساحر کی مثنویوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اردو دنیا ساحر کو فلمی شاعری اور غزل گوئی کے حوالے سے جانتی ہے تاہم انھوں نے مرثیے، مثنوی اور سہرے بھی لکھے ہیں۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری ساحر لدھیانوی کی سہرا نویسی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''ساحر نے دو سہرے لکھے ہیں اور دونوں ہی غزل کی ہیئت میں ہیں۔ پہلا سہرا بعنوان 'خانہ آبادی' (ایک دوست کی شادی پر) اولین مجموعہ کلام تلخیاں میں شامل ہے اور ساحر کے ابتدائی دور کی تخلیق ہے اور دوسرا بعنوان 'پیار کا تحفہ' (اپنے جگری دوست لیش چوپڑہ کی شادی کے موقع پر) 27 اگست 1970 کو کہا گیا ہے۔ غیر مطبوعہ ہے۔''[2]

ان میں سہرا 'پیار کا تحفہ' چھ اشعار پر مشتمل ہے جس میں شادی کی رسوم وروایات اور زندگی کے نشیب وفراز کے علاوہ شادی کی خواہشوں اور دل کی امنگوں کا احساس ہر جگہ نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کارگر ہوگئی احباب کی تدبیر اب کے
مانگ لی آپ ہی دیوانے نے زنجیر اب کے
جو سدا حسن کی اقلیم میں ممتاز رہے
دل کے آئینے میں اتری ہے وہ تصویر اب کے
اجنبی خوش ہوئے، اپنوں نے دعائیں مانگیں
اس سلیقہ سے سنواری گئی تقدیر اب کے

سہرا ایک خالص دیسی صنف ہے لیکن اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی اس کی ہیئت کا تعین ہو سکا ہے۔ تاہم اردو کے بہت سے قلم کاروں نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری نے بھی صنف سہرا میں اپنے قلم کا جوہر دکھایا ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور رشتے داروں کی شادیوں کے موقعے پر سہرا لکھا ہے اور پڑھا بھی ہے۔ ان کے سہرے سے

ماخوذ چند مصرعے پیش ہیں۔

تکتی تھی راہ جس کی یہ سمجھیں بہار کی
لو سامنے کھڑی ہیں وہ گھڑیاں قرار کی
آنگن میں آگئی ہیں نگاہیں وہ پیار کی
لاکھوں دیے نگاہ کے راہوں میں جل گئے
پلکوں پہ کتنے خواب خوشی کے مچل گئے 3

پروفیسر انور ظہیر انصاری کے متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعے ادبی حلقوں میں مقبول ہوچکے ہیں۔ پہلا 'شعور ادب' کے نام سے 2007 میں شائع ہوا تھا۔ بعدازاں 'اردو کا شعری اثاثہ اور نئے وارث' 2013 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں غیر مطبوعہ کے ساتھ مطبوعہ مضامین بھی شامل ہیں۔ بقول انور ظہیر انصاری ''میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ مجھے اردو زبان وادب سے متعلق جتنا اور جیسا کام کرنا چاہیے اس سے پوری طرح شاید عہدہ برآ نہیں ہوسکا ہوں تاہم میری کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ مقدور بھر اردو کی خدمت کرسکوں۔''4

اس کے بعد ان کا تیسرا مجموعۂ مضامین 'سرسید سے شہریار تک' 2018 میں شائع ہوا۔ اس میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں۔ جس میں سرسید، علامہ اقبال، چکبست لکھنوی، تلوک چند محروم، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، وارث علوی اور شہریار جیسے معروف ادیب اور قلم کاروں کو جگہ دی گئی ہے۔ قبل ازیں ان قلم کاروں پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور اب بھی لکھا جارہا ہے لیکن وارث علوی ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم لوگوں نے لکھنے کی جسارت کی ہے۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری نے وارث علوی کے شعورِ نقد سے بحث کرتے ہوئے بڑی کارآمد اور اہم گفتگو کی ہے۔ دراصل وارث علوی کی تنقید محض تنقید نہیں بلکہ ان میں طنز ومزاح کے پہلو بھی شامل ہیں۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کو گویا اس طرح پیش کرتے ہیں جو قاری کو مسکرانے پر مجبور کرنے کے ساتھ ان کے ذہن ودل پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ وہ کسی گروہی مفادات اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی کے منکر تھے۔ بایں سبب وارث علوی نے ادبی حلقوں میں بہت جلد اپنی شناخت قائم کرلی۔ پروفیسر انور ظہیر انصاری نے وارث علوی کے تنقیدی امتیازات کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کی بے باکی اور غیر جانب دارانہ رویے کو بڑے دلچسپ پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''انھوں نے جہاں کہیں ناانصافی دیکھی احتجاج کیا، وہ ایسا اس لیے کرسکے کہ خود کو کسی مخصوص نظریے کا کبھی پابند نہیں کیا، روایت کے اسیر نہیں ہوئے اور روایت کے مطابق اپنے تحفظ کے لیے محافظ دستہ بھی نہیں کھڑا کیا بلکہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اپنی راہ الگ نکالی، جس کے موجد بھی وہی ہیں اور خاتم بھی وہی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وارث علوی اتنی بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ کچھ بھی لکھنے سے قاصر رہتے۔''5

پروفیسر انور ظہیر انصاری کو زبان و بیان پر اچھی گرفت ہے۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کو پیش کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے جن موضوعات کو اپنے فن کا حصہ بنایا اس کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

پروفیسر انور ظہیر انصاری کو زبان و بیان پر اچھی گرفت ہے۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کو پیش کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے جن موضوعات کو اپنے فن کا حصہ بنایا اس کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ اچھے شاعر بھی ہیں لیکن انھوں نے شاعری کی جانب کم توجہ دی۔ ان کا اصل میدان تنقید ہے اسی لیے وہ شاعری سے زیادہ تنقید کو اہمیت دیتے ہیں۔ انھی کے بقول ''شعری صلاحیتیں تو مجھ میں برائے نام ہی ہیں لیکن اپنی شاعری کے ذریعے کوشش یہی کرتا ہوں کہ اجتماعی حوالے سے ہی بات کروں کیوں کہ انفرادی رویے کو تسلیم کرتے ہوئے بھی میں اجتماعی زندگی کی ترجمانی کو اولیت اس لیے دیتا ہوں کہ میں بھی ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں لوگوں میں سے ایک ہوں جو معاشرتی اور تہذیبی زندگی کو خوش حال اور فعال دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ آخر میں پروفیسر انور ظہیر انصاری کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جو ان کی شعری صلاحیت کے مظہر ہیں۔

وقت کے ہم راہ چلنا سیکھ لے
زندگی کا رخ بدلنا سیکھ لے
اشک پلکوں پر سجائے ہیں بہت
رو چکے اب مسکرانا سیکھ لے
تاریکیاں ہیں شب کی پیامِ سحر تجھے
جہد وعمل کو چھوڑ نہ جی کو نڈھال کر
ہم نے رفیق سمجھا، رفاقت نباہ دی
اور اس کو یہ گماں کہ سبھی زیرِ سایہ ہیں
زندگی کی دھوپ تو پل بھر کی ہے ڈھل جائے گی
تیرے کرموں کی مگر پرچھائیاں رہ جائیں گی

پروفیسر انور ظہیر انصاری زبان وبیان میں خاصا درک رکھتے ہیں۔ ان کی زبان میں سادگی اور سلاست بھی ہے اور ستھراپن اور دل کشی بھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کی تحریریں نہ صرف گنجلک ہونے سے محفوظ رہتی ہیں بلکہ اپنے موضوعات پر مکمل گرفت بھی رکھتی ہیں۔ زبان وادب کی خدمت کرتے ہوئے 31 اکتوبر 2024 کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔

حواشی

1. شعور ادب از انور ظہیر انصاری، ص 10
2. ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے، ص 285
3. ساحر لدھیانوی حیات اور کارنامے، ص 284
4. اردو کا شعری اثاثہ اور نئے وارث، ص 7
5. سرسید سے شہریار تک، ص 202

■

Dr. Mohammad Zubair
Assistant Professor
Rizvi College of Arts, Science &
Commerce, Bandra (W)
Mumbai-400050
Mob: 9022951081
m.zubair.mau@gmail.com

مصنف: ڈیوڈ کرسٹل
مترجم: نصیر احمد خاں

لسانیات کے فوائد

لوگوں کو عام اصطلاح میں یہ بتا دینے کے بعد کہ لسانیات کا تعلق کن چیزوں سے ہے، اکثر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ آخر اس طرح زبان کے مطالعے کا مقصد کیا ہے؟ یا یوں کہیے کہ یہ مطالعہ کیوں کارآمد ہے۔ ایسے سوالوں کے جواب دینے کے کئی طریقے ہیں۔ ایک کوہ پیما کی کتاب سے مثال دیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں زبان کا مطالعہ اس لیے کرتا ہوں کہ اس کا وجود ہے، جو دلچسپ ہے، وغیرہ۔ اس ضمن میں شاید سب سے اہم وجہ یہی ہے۔ ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عام لوگوں اور پڑھے لکھے لوگوں میں زبان کی ماہیت کے بارے میں عموماً پائی جانے والی ناواقفیت کو دور کرنے کے لیے ہم زبان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سوال کو گھما کر اس طرح بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ سولھویں صدی کے ادب یا قدیم تاریخ کے مطالعے سے کیا فائدہ ہے؟ یہاں دلیل کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان کو مقصود بالذات مان کر اس کا مطالعہ کرنا بھی کم فائدے مند نہیں ہے۔ لیکن خواہشمندوں کی دلچسپی یہ سمجھنے میں ہے کہ سماج کے مختلف پہلوؤں کے لیے لسانیات کی عملی قدر و قیمت کے تعلق سے ایک ماہر لسانیات کیا کردار ادا کرتا ہے اور جیسے ہی کوئی شخص اس سلسلہ استدلال کو سمجھنا شروع کر دیتا ہے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں متعدد ایسے سوالات بھی موجود ہیں جو بالخصوص ان لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکتے ہیں جو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رہے ہوں، مثلاً کوئی شخص جس نے لسانیات کا ڈگری یا کسی دوسری تعلیمی سطح تک مطالعہ کیا ہے، وہ لسانیات سے کیا کام لے سکتا ہے یا یہ کہ ایسے تربیت یافتہ آدمی کے لیے کیا سہولتیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ یہ مشکل سوال ہیں جن کا قطعی جواب دینا آسان نہیں ہے

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں لسانیات کی تعلیم کو محض ایک تربیت سمجھنا چاہیے اور بس۔ یعنی ایک ایسی ذہنی تربیت جس کا معیار اس سطح کی دوسری اعلیٰ تربیتوں کے برابر ہو۔

کیونکہ ابھی نسبتاً بہت کم لوگوں نے اس مضمون میں خصوصی تربیت حاصل کی ہے۔ بہر حال عام سطح پر ایسے سوالوں کے تین طرح سے جواب دیے جا سکتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں لسانیات کی تعلیم کو محض ایک تربیت سمجھنا چاہیے اور بس۔ یعنی ایک ایسی ذہنی تربیت جس کا معیار اس سطح کی دوسری اعلیٰ تربیتوں کے برابر ہو۔ اس اعتبار سے لسانیات میں بی اے کرنے کی بالکل وہی حیثیت ہے جو دوسرے کسی مضمون میں بی اے کی ہو سکتی ہے۔ سماجی، صنعتی یا عوامی زندگی میں بہت سے پیشوں کے لیے یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ ایک شخص کے پاس کوئی ڈگری، ڈپلوما یا ایسی اور کوئی سند ہونی چاہیے۔ یہ جتنی زیادہ اعلیٰ سطح کی ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ تربیت حاصل کرنے والے مضمون کی نوعیت کیا ہے کیونکہ ایک طالب علم کو اس کے نئے مضمون میں غالباً شروع ہی سے تربیت دی جائے گی۔

مثال کے طور پر کسی آجر کو فنون کلیہ (Arts) کی ڈگری زیادہ سے زیادہ یہ ضمانت دے سکتی ہے کہ اس میں متعلقہ موضوعات میں لیاقت کا ایک مخصوص معیار موجود ہے۔ یہ سند اس بات کی بھی ضمانت دے گی کہ طالب علم نے موضوع کا مطالعہ ایک حد تک گہرائی میں جا کر کیا ہے اور اس مطالعے میں اس نے اپنی صلاحیت اور سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے وغیرہ۔ اس اعتبار سے لسانیات بھی وہی حیثیت اور وہی افادیت رکھتی ہے جو مطالعہ کیا جانے والا کوئی دوسرا علمی مضمون رکھتا ہے کسی شخص کو خاص طور پر یہ فکر نہیں ہوتی کہ یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد اسے اس مضمون سے مزید کام لینا ہے۔

تاہم اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ لسانیات کے مطالعے کو کس طرح آگے بڑھائے اور اس تربیت کو جو اس نے زبان کے بارے میں حاصل کی ہے اُسے

کس طرح اپنی عملی زندگی میں استعمال کرے؟ یہاں بھی صورت یہی ہے کہ لسانیات دوسرے مضامین سے مختلف نہیں ہے۔ بہرحال اس سوال کے دو ممکن جواب ہو سکتے ہیں، جن کا انحصار اس بات پر ہے کہ مضمون کے خاص پہلو پر زور دیا جا رہا ہے یا اطلاق پر۔ جہاں تک لسانیات میں خالص دلچسپی کا تعلق ہے، ابتدائی تربیت کے بعد یہ یقینی طور پر ممکن ہے کہ لسانیات میں تحقیقی کام کیے جائیں جیسا کہ ہم دوسرے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ اس میدان میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ لسانیاتی اہلیت کو بروئے کار لانے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر تحقیقی کام کریں یا ایسا کوئی عہدہ حاصل کریں جہاں تحقیقات کے لیے وقت مل سکے یا جہاں ملازمت کی یہ شرط ہو کہ کسی قسم کا تحقیقاتی کام کیا جائے۔ یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کی نوکریاں خواہ وہ برطانیہ میں ہوں یا دوسرے بیرونی ممالک میں، اسی زمرے میں آئیں گی۔ زبان کے مختلف پہلوؤں پر متعدد تحقیقاتی منصوبے مختلف ممالک کی حکومتوں کی سرپرستی میں یا بڑے صنعتی اداروں کے تعاون سے چل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مشینی ترجمے یا بچوں میں پڑھنے کی اہمیت کو ترقی دینا وغیرہ، اعلیٰ تعلیم میں بہت سے ایسے غیر لسانیاتی منصوبے بھی موجود ہیں جن میں تربیت یافتہ ماہر لسانیات تحقیقاتی جماعت کا ایک اہم اور مؤثر کن ہوتا ہے، مثلاً کمپیوٹر سے متعلق کام عمرانیات نفسیات اور بالخصوص تعلیم وغیرہ۔ جہاں تک لسانیات سے فائدہ حاصل کرنے کا تعلق ہے کوئی بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس قسم کے 'خاص' تحقیقی کاموں کی آسامیاں نسبتاً کم ہیں اور تقرر کے لیے مطلوبہ معیار کافی اونچے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اطلاقی لسانیات کی مختلف صورتوں میں ہمیں اپنی لسانیاتی اہلیت سے فائدہ اُٹھانے کے اصل مواقع مل سکتے ہیں۔ ہم اس باب کے باقی حصہ میں اسی معیار کے اہم میدانوں میں سے چند پر بحث کریں گے۔

اطلاقی لسانیات نے میری مراد کسی غیر لسانیاتی میدان میں لسانیاتی طریق کار اور اس کی تحقیقی اور تجزیے کی تیکنکوں کے اصولوں کا استعمال ہے۔ اس اعتبار سے لسانیات گویا کسی اور مقصد کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ ہے، بذات خود وہ کچھ نہیں۔ ایسے بہت سے میدان خالی پڑے ہیں جہاں اب بھی کام کرنے کی بہت سی گنجائش باقی ہیں۔ لسانیاتی تحقیق کا کارآمد استعمال جن میدانوں میں ہو سکتا ہے یقیناً ان میں سب سے اول اور اہم زبان کی تدریس اور اس کا سیکھنا ہے، خاص طور سے بیرونی زبانوں کی تعلیم اطلاقی لسانیات کی اصطلاح کو بعض اوقات بیرونی زبان کی تدریس کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس میدان میں لسانیات کی افادیت کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ اسے ایک بدیہی حقیقت سمجھنا چاہیے کہ کوئی شخص اس وقت تک کسی زبان

لسانیاتی اہلیت کو بروئے کار لانے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر تحقیقی کام کریں یا ایسا کوئی عہدہ حاصل کریں جہاں تحقیقات کے لیے وقت مل سکے یا جہاں ملازمت کی یہ شرط ہو کہ کسی قسم کا تحقیقاتی کام کیا جائے۔

کو نہیں پڑھا سکتا جب تک کہ اس زبان کے تمام پہلوؤں سے وہ واقف نہ ہو مگر حقیقتاً ایسا ہوتا نہیں۔ زبان سے واقف ہونا اور زبان کے بارے میں سب کچھ جاننا دو مختلف باتیں ہیں۔ کسی زبان میں روانی سے بات چیت پر قدرت رکھنا اس بات کی ضمانت نہیں کہ ہم اُسے دوسروں کو پوری طرح سمجھا اور سکھا بھی سکتے ہیں۔ یہ غیر پیشہ ورانہ رویہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہم اکثر ایسے لوگوں سے ملتے رہتے ہیں جنھیں کسی زبان کے بارے میں بہت سے غلط حقائق بتائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو پڑھانے والا مناسب طور پر تربیت یافتہ نہیں تھا یا ایسے لوگ جنھوں نے مایوس ہو کر زبان کا مطالعہ ہی ترک کر دیا کیونکہ انھیں فراہم کی گئیں معلومات باقاعدہ مرتب نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں مناسب تربیت کی بہت اہمیت ہے۔ یہاں تربیت سے مراد کسی زبان کے ایسے حقائق سے باخبر ہونا ہے جنھیں کسی مخصوص نظریے کے دائرے میں پیش کیا گیا ہو، ان کے باہمی تعلق کی وضاحت کر دی گئی ہو، ان حقائق میں سے کسی ایک کی اہمیت کے بارے میں تحقیق کے نئے نئے کاموں سے واقفیت ہو۔ ان حقائق کو کسی مخصوص نصاب کا پابند کر کے، اُسی کے مطابق انتخاب کرنے اور درجہ بندی کرنے کی صلاحیت ہو، جو تدریسی کتابیں دستیاب ہیں ان پر تعمیری تنقید کرنے کی اہمیت ہو اور پہلے سے سیکھی ہوئی زبان اور جواب سیکھی جا رہی ہے ان کے درمیان کا فرق بھی معلوم ہوتا کہ مشکل نکات کا نہ صرف بآسانی اندازہ لگایا جا سکے بلکہ ان کے لیے ذہن کو تیار بھی کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اس تربیت میں شامل کی جا سکتی ہیں۔

زبان کے تعلیمی اداروں میں اب اس ضرورت کا زیادہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ زبان اور خاص طور پر بولی جانے والی زبان کے استاد مناسب طور پر تربیت یافتہ ہونے چاہئیں۔ برطانیہ نیز بیرونی ممالک میں بھی لسانیات کی طرف ذہنی میلان رکھنے والے استادوں کے لیے بہت سے مواقع ہیں۔ ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے انگریزی زبان کی تدریس اس شعبے کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ برٹش کونسل اور اسی طرح کی دوسری تنظیمیں دوسرے ملکوں میں انگنت انگریزی کے استادوں کی لسانیاتی تربیت کا انتظام کرنے میں عظیم کردار ادا کر رہی ہیں۔ لسانیات میں انڈر گریجویٹ کو اس کے اجرا سے کئی سال قبل اطلاقی لسانیات یا بحیثیت بیرونی زبان انگریزی کی تدریس کے کورس جاری ہیں۔ ان کی اسناد کہیں زیادہ عام ہیں اور انھیں مزید وسعت دی جا رہی ہے۔ یہ دلچسپی کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ انگریزی زبان بین الاقوامی ترسیل کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ یہ بہت سے ملکوں کی سرکاری اور تعلیمی زبان ہے اور یقیناً دنیا کی ان زبانوں میں سب سے بڑی ہے جنھیں ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھا جاتا ہے۔ مکتب کی تعلیم سے لے کر اونچی سطحوں تک تربیت یافتہ اور ماہر استادوں کی مانگ برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی تناسب سے ایسی درسی کتابوں کی مانگ برابر بڑھتی جا رہی ہے جو لسانیات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں۔ انگریزی زبان کے سینکڑوں نصاب موجود ہیں مگر ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جن میں انگریزی کے بارے میں پچھلے بیس سال میں کی گئی لسانیاتی تحقیقات کو پیش

نظر رکھا گیا ہو۔ انگریزی کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے کم و بیش وہی بات یوروپ کی دوسری ہر بڑی زبان پر بھی صادق آتی ہے۔

ہمارے ملک برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انگریزی بولنے والوں کو دوسری غیر ملکی زبان کی تعلیم دینے کے لیے لسانیات اب آہستہ آہستہ اسکولوں میں بھی داخل ہوتی جارہی ہے۔ اب اسکولوں کے اکثر ہیڈ ماسٹر لسانیات کی تربیت کو مشکوک نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اب لسانیات کو زبان کی تعلیم و تدریس کے معیاروں کو بہتر بنانے میں معاون سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات قبل از وقت نہیں ہے۔ ہم لوگ اسکول میں پڑھنے والے طالب علم کی اس صورت حال سے واقف ہیں جو اسکول کی پڑھی ہوئی فرانسیسی کو پہلی بار فرانس جاکر استعمال کرتا ہے۔ وہ نہ اپنی بات سمجھا پاتا ہے اور نہ خود دوسرے کی سمجھ سکتا ہے۔ اب لوگوں کو اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ یہ صورت حال اس بات کی علامت ہے کہ ہماری بیرونی زبانوں کی تعلیم میں کوئی بنیادی خامی ہے۔ یہاں یہ امید رکھنا کہ لسانیات ہماری کچھ مدد کرسکتی ہے، بے جا نہ ہوگا۔ اسکولوں اور اعلیٰ تعلیمی سطحوں پر اجنبی زبانوں مثلاً روسی یا چینی پڑھانے کے لیے بڑے پیمانے پر استادوں کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ ایسی زبانوں میں وسیع تربیت کو ہم عمومی لسانیات کے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسکولوں میں زبانوں کے عمل خانوں (Laboratories) کا بڑھتا ہوا استعمال صحیح سمت میں ایک اور قدم ہے۔ یہاں ایسے خیال سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ بیش قیمت آلات کی موجودگی ہی ہمارے سوالوں کا جواب ہے۔ زبان کے عمل خانے لسانیاتی اصولوں کی مکمل تربیت کا بدل نہیں ہوسکتے۔ یہ عمل خانے بہرصورت صرف اتنے ہی کارآمد ہوسکتے ہیں جتنا ٹیپ کیے ہوئے مواد کا استعمال۔ اگر ٹیپ کا مواد ناقص ہے تو کسی قسم کی بھی میکانکی مہارت طالب علم کی گفتگو کی روانی کے معیار کو بہتر نہیں بناسکتی۔ ٹیپ کے لیے اچھا مواد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زبان کی پیچیدگیوں اور ان مسائل سے پوری طرح باخبر ہوں جو لسانیاتی بنیادوں اور تدریسی معیاروں کے مطابق ساختوں کی درجہ بندی کرتے وقت سامنے آتے ہیں۔ اس کے لیے پھر ایک لسانیاتی جہت کی ضرورت ہے۔

ابھی تک لسانیات کو زبان کی تعلیم و تدریس کے دوسرے اہم پہلو یعنی کسی کی پہلی یا مادری زبان کی تعلیم میں باقاعدہ استعمال ہونے کا موقع نہیں ملا ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں اس کے باوجود کہ انگریزی زبان میں امتحانوں کے موجودہ طریقے پر بڑی تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور مختلف تنظیمیں اس سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کرتی رہی ہیں (پچھلے صفحات ملاحظہ ہوں)۔ برطانیہ کے اسکولوں میں لسانیات کو بحیثیت مضمون متعارف کرانے یا اسکولوں میں پڑھائی جانے والی زبان کے سلسلے میں لسانیاتی تصورات کو بروئے کار لانے میں

اب لسانیات کو زبان کی تعلیم و تدریس کے معیاروں کو بہتر بنانے میں معاون سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات قبل از وقت نہیں ہے۔ ہم لوگ اسکول میں پڑھنے والے طالب علم کی اس صورت حال سے واقف ہیں جو اسکول کی پڑھی ہوئی فرانسیسی کو پہلی بار فرانس جاکر استعمال کرتا ہے۔

بہت کم پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ کام اُستادوں کی ثواب دید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حال میں ہائی اسکول کے آخری سال میں انگریزی کے استعمال کا جو امتحان متعارف کرایا گیا ہے اس کا کوئی تعلق لسانیات سے نہیں ہے۔ اسی طرح اس بات پر بھی ابھی تک غور نہیں کیا گیا کہ لسانیات کو اسکولوں میں منظم طور پر کس طرح متعارف کرایا جائے، اگرچہ انگریزی کی تعلیم و تدریس کی قومی انجمن National Association for a teaching of english جیسی تنظیموں میں اس موضوع پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس سلسلے میں دو تکمیلی راستے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ لسانیات کو اس کی ذاتی حیثیت سے نصاب کے ایک اضافی جزو کے طور پر متعارف کرایا جاسکتا ہے اور اُسے شاید 'عام' یا 'وسیع' مطالعے کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یقیناً اس طرح انگریزی یا کسی دوسری زبان میں طالب علم کی استعداد میں اضافہ کرنا مقصود نہیں ہوگا بلکہ صرف اس بات کی کوشش ہوگی کہ طالب علم کو بالعموم ایک زبان اور بالخصوص اپنی زبان کی ساخت اور صلاحیتوں سے شعوری واقفیت ہوجائے۔ یہ چیز طالب علم کے اندر کسی مخصوص زبان کو استعمال کرنے کی زیادہ صلاحیت پیدا کرسکتی ہے لیکن اس طریق کار کا 'اصلاحی' اثر اس کا بنیادی مقصد نہیں ہوگا۔

دوسرے یہ ضروری نہیں کہ لسانیات ایک خاص مضمون کی حیثیت سے متعارف کرادی جائے بلکہ کسی خاص زبان کے نصاب میں اسے جگہ دی جانی چاہیے۔ پھر زیرِ مطالعہ زبان کی ماہیت پر اس کی حیثیت بنیادی طور پر ایک معلوماتی نصاب کی ہوجائے گی اور اُسے خصوصاً اس لیے نہیں پڑھا جائے گا کہ کوئی اس پر دسترس حاصل کرے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ چیز یعنی زبان پر قدرت حاصل کرنا اس کے ضمنی نتائج میں سے ایک ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ طریقہ ایک طرح سے ذہنی تنظیم و تربیت کی حیثیت سے قابل قدر ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ لاطینی زبان کے مطالعے کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے، اگر ضرورت ہو تو ایسے نصاب میں کوئی اصلاحی جز بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ زبان کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جنھیں عام طور پر مخصوص زبانوں کے نصابوں (Therapeutic) میں نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ انھیں متعارف کرا کے نسبتاً سریع اثر اصلاحی نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً بولی اور لکھی جانے والی زبان کے مختلف اسالیب کی معلومات۔ تاکہ طالب علم زیادہ بہتر طریقے سے ایسی مختلف صورتوں جیسے گفتگو، عام مباحث یا مکتوب نگاری وغیرہ کے موزوں ذریعہ اظہار سے واقف ہوسکے۔ اس کے علاوہ اسکولوں میں لسانیات کے لیے اور بھی امکانات ہیں؟ جیسے پرائمری اسکولوں میں بلند خوانی اور پڑھنے میں روانی سکھانا وغیرہ۔ آجکل اس قسم کے بہت سے میدانوں جیسے تحقیقاتی منصوبوں کی تلاش جاری ہے لیکن ان کاموں میں ابھی بہت کم ایسی ترقی ہوئی ہے کہ انھیں عام طور پر متعارف کرایا جاسکے۔

اکثر لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ لسانیاتی معلومات کی موجودہ خلا کو پُر کرنے کے لیے کسی نہ کسی

لسانیاتی تحقیق میں بہرحال مشینوں کے استعمال پر ہمیں اپنے تخیل کو بہت زیادہ اونچا نہیں اُڑنے دینا چاہیے۔ سائنس داستانوں کی دنیا جہاں مشینی آدمیوں (Robots) سے سوال جواب ہوتے ہیں، اسے حقیقت کا روپ دینے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔

طرح کے نصاب ہونے چاہیے۔ یونیورسٹیوں نے اس بات کو پوری طرح تسلیم کرلیا ہے۔ Sixth Form کی کانفرنس اور اسی طرح کے دوسرے موقعوں پر خود پڑھنے والے بھی اس خیال کی طرز پوری طرح راغب نظر آتے ہیں۔ امریکہ میں بھی اسکولوں میں لسانیات کے تجرباتی نصاب کامیاب ہوئے ہیں لیکن اسکولوں میں اُس وقت تک نئے نصاب داخل کرنا ممکن نہیں ہے۔ جب تک کہ انھیں پڑھانے کے لیے استاد نہ تیار ہو جائیں۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ بہت سے ٹریننگ کالج اب لسانیات کے نصاب چلارہے ہیں اور ہم توقع کر سکتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصے میں ایک نیا ماحول پیدا ہو جائے گا مگر ہمارے پاس آج بھی نصابی اور بنیادی تعارفوں والی کتابوں کی کمی ہے اور جب تک یہ تیار نہ ہو جائیں، لسانیات اسکول کے نصاب کا ایک معین حصہ نہیں بن سکے گی۔

زبان کی تعلیم و تدریس کے مختلف پہلوؤں سے قطع نظر اطلاقی لسانیات کی اور بھی متعدد جہتیں ہیں جن کی طرف اشارے کیے جاسکتے ہیں مگر ان کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے موجودہ کتاب سے کہیں زیادہ بڑی کتاب درکار ہوگی، ترجمہ، خصوصاً مشینوں کے ذریعے ترجمہ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ ہم مترجم کے کام کے لیے اس وقت تک مشین تیار نہیں کر سکتے جب تک کہ اُسے معلومات کی ایک بڑی مقدار مہیا نہ کر دی جائے مشین کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اُسے ان دونوں زبانوں کی ساخت کے بارے میں سب کچھ بتادیا جائے جن میں اُسے ربط پیدا کرنا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ کس طرح ایسے متبادل اور مترادف الفاظ معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ جن کی موجودگی کا ہمیں علم ہے۔ یہ ایک ایسا پس منظر ہے جس کا بڑا حصہ صرف ماہر لسانیات ہی فراہم کرسکتا ہے۔ ایک اور میکانکی کام میں ماہر لسانیات کی ضرورت پڑتی ہے یعنی تار ترسیل (Tele Communication) اور اس کے نظام کی دوسری مختلف شکلیں، مثال کے طور پر ٹیلیفونی ترسیل کے لیے صوتیات انتہائی اہم ہے۔ تاروں کے ذریعے آواز بھیجنے میں رقم خرچ ہوتی ہے اگر کوئی ایسی آواز کی مقدار کو کم کر دے جنھیں تاروں کی مدد سے بھیجنا ہے تو یقیناً بڑی بچت ہوگی۔ اس سلسلے میں لسانیاتی مسئلہ یہ طے کرنا ہے کہ بات چیت کے کون سے عناصر قابل فہم اور قابل قبول ہیں اور کون سے نہیں۔ اس طرح جہاں تک ترسیل کا تعلق ہے بہت سے غیر ضروری عناصر کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن یہ طے کرنا بڑے پیمانے پر تحقیق چاہتا ہے۔ اس پر ابھی تجربے ہو رہے ہیں۔

میکانکی تکنیکوں کے بارے میں لسانیاتی معلومات کے بہت سے دوسرے استعمال کے طریقوں پر بھی سوچا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض پہ مشکل تمام شروع بھی ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ بہروں کے لیے ایک نئے قسم کا بصری آلہ تیار کیا جائے جو سمعی صوتیات کی مدد سے حاصل کی ہوئی معلومات پر مشتمل ہو۔ ایسی مشین تو پہلے ہی سے تیار ہو چکی ہے جو تکلمی آوازوں کی تصویر تیار کرسکتی ہے گو کہ یہ تصویر بڑی پیچیدہ ہے اور اس کو یہ پڑھنا بھی مشکل ہے۔ اس مشین کو صوت اسپیکٹروگراف (Sound Spectrograph) کہتے ہیں۔ اگر مختلف آوازوں کی تصاویر آسانی سے پہچانی جانے والی اور ترتیب وار شکلوں کے سلسلوں میں آسکیں تو ہم تکلم کو براہ راست تحریر میں لا سکتے ہیں۔ ہم ایک ایسی دستی مشین کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں جس میں مائیکروفون (Microphone) اور ایک پردہ لگا ہو اور مائک پر بات کرنے کے بعد پردوں پر تصویر آجائے۔ اس طرح ایک بہرا شخص نئے 'حروف تہجی' کو سیکھنے کے بعد گفتگو کو براہ راست پڑھ کر فوراً سمجھ سکتا ہے۔ اس تیکنیک کو یقیناً کاروباری منصوبوں میں استعمال کرنے کے لیے کافی بڑے تحقیقاتی کام کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں ابھی بہت کم کام ہوا ہے۔ اصولی طور پر اس کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

لسانیاتی تحقیق میں بہرحال مشینوں کے استعمال پر ہمیں اپنے تخیل کو بہت زیادہ اونچا نہیں اُڑنے دینا چاہیے۔ سائنس داستانوں کی دنیا جہاں مشینی آدمیوں (Robots) سے سوال جواب ہوتے ہیں، اسے حقیقت کا روپ دینے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔ ابھی ہمارے پاس گفتگو کے اجزا کو مرتب کرنے کی ایسی معلومات ناکافی ہیں جن سے ہم اُسے حقیقت میں تبدیل کرسکیں۔ مثلاً ایسی چھوٹی مشینوں کو بنانے کے تیکنیکی مسائل جسے آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکے۔ یہاں تک کہ کمپیوٹر کے ذریعے بلند آواز میں ہدایت کا کام بھی ابھی کامیابی کے ساتھ تکمیل کو نہیں پہنچا ہے ہم ابھی کمپیوٹر سے یہ بھی توقع نہیں کرتے کہ وہ ہماری بات کا انھیں الفاظ میں جواب دے۔

■

ماخذ: لسانیات کیا ہے؟ **مصنف:** ڈیوڈ کرسٹل، **مترجم:** نصیر احمد خاں، **دوسری طباعت:** 2010، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

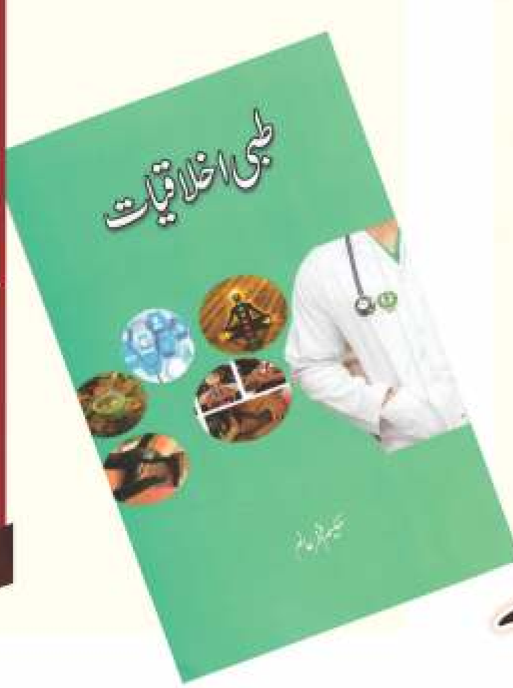

قدیم تہذیبوں میں طبی اخلاقیات کا تصور

حکیم فخر عالم

حمورابی کے طبی ضوابط

سب سے پہلے تمدن سے آشنا ہونے والے دنیا کے خطوں میں ایک نہایت قابل ذکر نام بابل کا ہے۔ یہاں کے حکمرانوں میں حمورابی چھٹا بادشاہ تھا، اس کا زمانہ حکومت 1750-1792 ق م کا ہے۔ یہ بابلی بادشاہوں میں ضابطۂ قوانین کے حوالہ سے خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس کے عہد کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ہر شعبۂ حیات کے لیے قوانین وضع کیے اور ان کے مؤثر نفاذ کو یقینی بنایا۔

حمورابی نے آہنی اور سنگی ستونوں پر شاہی فرمان کی صورت میں قوانین کندہ کروا کے شہر کے مختلف حصوں میں نصب کروائے تاکہ لوگ انھیں پڑھ کر عمل پیرا ہوں۔ حمورابی کے ان قوانین میں شہریوں کے حقوق اور ملکی نظام کی روشنی میں حدود و قیود کا تذکرہ ہے۔ ان کے آثار فرانس کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔ ان میں 280 ضابطوں کا ذکر ہے، ان قوانین میں طب کے بعض ضوابط بھی ملتے ہیں۔ اب تک کے دستیاب حوالوں میں یہ دنیا کے قدیم ترین طبی ضابطے ہیں۔[1]

ضابطہ نمبر 215 سے 225 تک کا تعلق طبی پیشہ سے ہے، اس میں خاص طور پر طبیب کی فیس، اس کی ذمہ داریوں اور کوتاہی کی صورت میں عائد جرمانوں کا تذکرہ ہے، طبیب کی فیس کے سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ یہ مریض کی سماجی حیثیت کے لحاظ سے متعین کی گئی تھی، یہ ضوابط درج ذیل ہیں:[2]

215. اگر ڈاکٹر کسی آزاد شہری کے کسی شدید زخم کا علاج دھات کے چاقو سے کرے اور اس آزاد شہری کو تندرست کر دے یا کسی آزاد شہری کی آنکھ کے ڈھیلے پر دھات کے چاقو سے عمل جراحی کرے اور اس کی آنکھ بنا دے تو وہ اسے دس شیکل چاندی فیس دے۔

216. اگر وہ مریض کسی عامی کا بیٹا تھا تو اسے پانچ شیکل چاندی فیس دی جائے۔

217. اگر وہ مریض غلام تھا تو غلام کا مالک ڈاکٹر کو دو شیکل چاندی ادا کرے۔

218. اگر کوئی ڈاکٹر کسی شخص کے کسی شدید زخم کا علاج دھات کے چاقو سے کرے، جس سے اس شخص کی موت ہو جائے یا چاقو سے کسی شخص کے ڈھیلے پر عمل جراحی کرے اور اس سے اس شخص کی آنکھ بیکار ہو جائے تو اس ڈاکٹر کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔

219. اگر کوئی ڈاکٹر کسی عامی کے غلام کے کسی جدید زخم کا علاج دھات کے چاقو سے کرے، جس سے اس غلام کی موت واقع ہو جائے تو وہ غلام کی جگہ غلام دے۔

220. اگر وہ اس غلام کے ڈھیلے میں چاقو سے شگاف دے، جس سے اس کی آنکھ بیکار ہو جائے تو وہ اس غلام کی قیمت کے نصف کے برابر چاندی ادا کرے۔

221. اگر کوئی ڈاکٹر کسی آزاد شہری کی ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑ دے یا اس کا سڑا ہوا گوشت ٹھیک کر دے تو مریض ڈاکٹر کو پانچ شیکل چاندی فیس ادا کرے۔

222. اگر وہ مریض کسی کا غلام ہے تو غلام کا مالک ڈاکٹر کو دو شیکل چاندی فیس دے۔

223. اگر بیلوں اور گدھوں کا معالج (سالوتری) کسی بیل یا گدھے کے شدید مرض کا علاج کرے اور اسے ٹھیک کر دے تو بیل یا گدھے کا مالک سالوتری کو 1/4 شیکل چاندی فیس ادا کرے۔

224. اگر وہ بیل یا گدھے کے شدید زخم کا علاج کرے اور اس سے جانور مر جائے تو سولوتری جانور کی قیمت کا ایک چوتھائی بیل یا گدھے کے مالک کو ادا کرے۔

بقراط کی وصیت

طبیب کے لیے مطلوب اوصاف و خصائل پر مشتمل بقراط نے 'ترتیب الطب' کے نام سے ایک وصیت لکھی تھی۔ اس کا متن درج ذیل ہے:

''طب کے طالب علم کو اپنی ذات میں آزاد اور مزاج میں عمدہ ہونا چاہیے۔ کم عمر ہو، قد و قامت معتدل اور اعضا متناسب ہوں۔ فہم و ادراک بہتر، گفتگو عمدہ، اصابتِ رائے کا مالک، عفیف، پاکدامن اور بہادر ہو، زر پرست نہ ہو، غصہ کے وقت نفس پر قابو رکھتا ہو، غصہ حد سے زیادہ نہ کرتا ہو۔ بلید اور کند ذہن نہ ہو۔ مریض کا غم گسار ہو اور اس کے حق میں مشفق ہو۔ تلخ کلامی اور بدزبانی کو برداشت کرتا ہو، کیوں کہ کچھ لوگ ہمارے سامنے ایسے بھی آئے ہیں جو برسام اور سوداوی وسوسہ کے مریض تھے، ہمیں ان کو برداشت کرنا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ گالی گلوچ کرنا ان مریضوں کا شیوہ نہیں ہے، ان میں یہ بات خارجی طور سے پیدا ہو گئی ہے۔

سر منڈائے تو اس میں اعتدال ملحوظ رکھے، نہ اسے بالکل ہی منڈا دے، نہ اس طرح چھوڑ دے کہ گیسو بن جائے، ہاتھ کے ناخن حد سے زیادہ نہ تراشے، نہ انھیں اس طرح چھوڑ دے کہ انگلیوں کے کناروں پر دراز ہو جائیں۔ کپڑے سفید، صاف ستھرے اور ملائم ہوں۔ رفتار میں عجلت نہ ہو، کیونکہ یہ طیش کی دلیل ہے۔ نہ سست رفتار ہو کیوں کہ اس سے ضعفِ نفس کا اظہار ہوتا ہے۔ مریض کے یہاں آئے تو آلتی پالتی مار کر بیٹھے اور سکون و وقار کے ساتھ اس کے حالات معلوم کرے۔ قلق اور اضطراب کی حالت میں نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ پوشاک، یہ شکل و صورت اور ترتیب نہایت افضل ہے۔''3

قدیم ہندوستان میں طبی اخلاقیات

طب ویدک میں اخلاقیات کی تعلیم زمانۂ قدیم ہی سے نصاب کا لازمی جز رہی ہے۔ چرک، سشرت اور بھاؤ پرکاش وغیرہ کی تصنیفات میں پیشہ ورانہ قدروں کا مفصل بیان اور ایک وید کی مطلوبہ اہلیت، طرز بود و باش اور سماجی و معاشرتی رویوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ایک اچھا وید وہ شخص سمجھا جاتا ہے جو نظری اور عملی معلومات کا حامل ہونے کے ساتھ، آیوروید کے آٹھوں مضامین کا علم اور شاستروں کا گیان رکھتا ہو، ویدک طالب علم کے لیے جذباتیت، غصہ، حرص و طمع، کبر و نخوت، بغض و حسد، کذب و افترا، مکر و فریب، تساہل پسندی اور اس قسم کی دوسری بری عادتوں کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک وید سے راست بازی، زہد و تقویٰ اور خدا ترسی کی امید کی جاتی ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس فن کو خدمت کا وسیلہ سمجھتے ہوئے حاملینِ مذہب، غربا اور نادار مرضا، مسافروں اور اعزہ و احباب وغیرہ کا مفت علاج کرے گا۔ ویدک اخلاقیات میں قصابوں، چڑی بازوں، نچلے طبقہ کے لوگوں اور مجرموں کے علاج سے منع کیا گیا ہے۔ ویدک اخلاقیات کے مطابق ہر کس و ناکس طب ویدک کا علم حاصل نہیں کر سکتا، محض برہمن، کھتری یا ایسا ویش ہی اس کی تحصیل کا مجاز ہے، جو بہترین دل و دماغ رکھتا ہو۔ وید کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ مال و زر کی طمع اور شہرت و ناموری کی خواہش سے بے نیاز ہو کر صرف جذبۂ ترحم اور جذبۂ انسانیت کے تحت معالجاتی خدمت انجام دے۔4

کسیاپا سمہتا (Kasyapa Samhita) میں وید کے اوصاف و خصائل کے تعلق سے نصیحت کی گئی ہے کہ وہ صاف ستھری اور سفید پوشاک زیب تن کرے، بالوں کو سنوارے، اگر دراز ہوں تو گرہ بند کر لے۔ راستہ چلتے وقت ہر طرف نظر رکھے اور آگے بڑھتا رہے۔ جب کسی سے ملے یا اس سے کوئی ملنے آئے تو تخاطب میں پہل کرے۔ ہر ایک کے ساتھ دوستانہ اور مشفقانہ برتاؤ کرے۔ بغیر بلائے کسی مریض کے گھر نہ جائے۔ جب جائے بھی تو صرف مریض پر دھیان دے، کسی اور پر نظر نہ رکھے۔ گھر کی خادماؤں اور دیگر

> طب ویدک میں اخلاقیات کی تعلیم زمانۂ قدیم ہی سے نصاب کا لازمی جز رہی ہے۔ چرک، سشرت اور بھاؤ پرکاش وغیرہ کی تصنیفات میں پیشہ ورانہ قدروں کا مفصل بیان اور ایک وید کی مطلوبہ اہلیت، طرزِ بود و باش اور سماجی و معاشرتی رویوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

خواتین سے ہنسی مذاق نہ کرے اور نہ انھیں غیر شائستہ انداز میں مخاطب کرے۔ ان سے زیادہ بات نہ کرے اور نہ تو زیادہ اپنائیت کا اظہار کرے۔ پیشگی اطلاع کے بغیر مریض کے گھر نہ جائے۔ کسی کے گھریلو راز کا افشا نہ کرے اور نہ ہی وہاں کی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے۔ اگر مریض کی حالت نازک ہو یا بحرانی علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو اس کی اطلاع مریض کو نہ دے۔ ایسے مریض جن کی موت کم و بیش یقینی ہو یا جن کو لا علاج مرض ہو یا ایسے مریض جن کے علاج کے لیے ضروری سہولتیں مہیا نہ ہوں تو ان کے معالجے سے احتراز کرے۔ مریض کا مشاہدہ و معائنہ بہت غور سے کرے۔ مریض کی جسمانی کیفیت، عمر اور مرض وغیرہ کی تفصیلی معلومات حاصل کرے۔ ضروری ادویہ اور علاج و معالجہ سے متعلق ساز و سامان اپنے ساتھ رکھے۔ ہم پیشہ طبیبوں سے کسی قسم کی رقابت نہ رکھے، بلکہ بوقت ضرورت ان سے رائے مشورے کے بعد دوائیں تجویز کرے۔ اگر کوئی شخص یا طبیب اس کے طریقۂ علاج پر تنقید کرے تو اس پر غور کرے اور اپنے علم و تجربہ کی روشنی میں اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ بات ہمیشہ صاف ستھری لاگ لپیٹ کے بغیر کرے۔ گفتگو پُر مغز، شیریں، شائستہ اور شستہ ہو۔ مختلف فیہ مسائل پر گفتگو سے اجتناب کرے۔ گفتگو ایسی کرے جو آفاقی طور پر طے شدہ اصولوں پر مبنی ہو۔

جو طبیب ان اصولوں پر کاربند رہتا ہے اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا ہے تو گویا اس کی زندگی تقویٰ کی ہے، یقیناً ایسے شخص کو دنیوی اور اخروی کامیابی نصیب ہوگی۔5,6

حوالہ جات

1 Tharwat Mohammaed Halwani, Medical laws and ethics of Babylon as read in Hammurabi's Code (History), The Internet Journal of Law, Health Care and Ethics. Vol.4,2006

2 مالک رام (2012) حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ص 52-51

3 ابن ابی اصیبعہ (1990)، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ج 1 (اردو ترجمہ)، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی، ص 71-70

4 Hakeem Abdul Hameed, Medical Ethics in Medieval Islam , Studies in Philosophy of Medicine, Vol. No. 2, June 1977. pp.108-124

5 Kasyapa Samhita (Vimana Samhita) (Chapter No.1) Translatedby Dr. D.V Subba Reddy, Published by Chaukamba Sanskrit Series, Banaras. p. 60

6 Medical Ethics in Ancient India by D.V Subba Reddy, Indian Journal of Dermatology & Venerelogy: Oct-Dec. 1961, pp .198-99

■

ماخذ: طبی اخلاقیات، مصنف: حکیم فخر عالم، پہلی اشاعت: 2023، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تصویری صحافت

حقیقت کی خاموش زبان

عبدالرزاق

تصویروں اور انسان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے تصویریں بنانا، لکھنے یا بولنے سے بھی پہلے سیکھا۔ وہ تصویریں اس لیے بناتا تھا تاکہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکے، کیونکہ خیالات اکثر ہمارے دماغ میں تصویروں کی شکل میں آتے ہیں۔ ہم زبان کا استعمال انھی خیالات کو بیان کرنے کے لیے کرتے ہیں، اگر ہم اپنے خیالات کو دوسروں تک نہ پہنچائیں تو وہ صرف ہمارے ذہن تک محدود رہتے ہیں اور کوئی دوسرا انھیں سمجھ نہیں پاتا۔ زبان، دراصل مختلف نشانیوں یا علامتوں کا ایک مجموعہ ہے، جو انسان نے اپنے احساسات، جذبات اور تجربات دوسروں تک پہنچانے کے لیے بنائیں۔ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا گیا، لوگوں کا ایک دوسرے پر زیادہ انحصار ہونے لگا، تو ان نشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ الفاظ بن گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ کون سا لفظ کس جذبے یا احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی کو زبان سیکھنا کہتے ہیں۔ جب انسان کو اپنی باتیں، جذبات اور تجربات کو محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے ان نشانیوں کو لکھنا شروع کیا۔لیکن اس سے بھی پہلے، انسان نے اشیا کی تصویریں بنانا سیکھا۔ وہ چیزیں جو وہ روز دیکھتا تھا جیسے درخت، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، جانور اور پرندوں کی تصویریں بنانا انسان کے لیے آسان اور قدرتی عمل تھا۔اسی لیے ہمیں پرانی تہذیبوں کے آثار میں ان چیزوں کی تصویریں ملتی ہیں، جیسے گائے، بیل، گھوڑے، کتے، پھول، چاند اور سورج وغیرہ۔

ان سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے لفظوں کو لکھنے سے بہت پہلے تصویروں کے ذریعے اپنی بات بیان کرنا شروع کر دی تھی۔اس بارے میں سب سے پرانے ثبوت فرانس میں ایک غار کی دیواروں پر ملے ہیں، جہاں کچھ جانوروں، پھولوں اور درختوں کی تصویریں کندہ ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ تصویریں ہزاروں سال پرانی ہیں۔ان غاروں میں رہنے والے لوگ ان تصویروں کے ذریعے وقت کا حساب رکھتے تھے، کیونکہ ان کے پاس نہ گھڑیاں تھیں اور نہ ہی کیلنڈر۔ وہ یہ دیکھ کر اندازہ لگاتے تھے کہ کون سا موسم ہے جیسے برفباری کے بعد کون سے جانور نظر آتے ہیں، یا موسم بدلنے پر کون سے پودے اور پرندے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے، اسے دیواروں اور پتھروں پر نقش کر دیتے، تاکہ آنے والے دنوں میں بھی ان تجربات کو یاد رکھا جا سکے۔

انسان کو تصویریں بنانے کی خواہش کی قدرتی صلاحیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ آج بھی اگر ہم کسی ایسے بچے کو جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا، چاک، پینسل یا رنگ دے دیں، تو وہ بھی کچھ نہ کچھ تصویریں بنانا شروع کر دیتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تصویر بنانا اصل میں ذہن میں موجود کسی منظر یا چیز کو کسی سطح پر جیسے کاغذ، پتھر یا دیوار پر اتارنے کا عمل ہے۔اس کے لیے کسی خاص تعلیم یا زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسا کہ الفاظ لکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ بات ہمیں دیہاتوں یا دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی روزمرہ زندگی سے بھی پتہ چلتی ہے، جہاں آج بھی بچے، عورتیں اور مرد اپنے گھروں کی دیواروں یا برتنوں پر جانوروں، پرندوں اور پھولوں کی تصویریں اور نقش و نگار بناتے ہیں۔ یہ ان کی فطری تخلیقی صلاحیت کا اظہار ہے۔ لیکن جب انسانی معاشرہ ترقی کرتا گیا اور مہذب دنیا نے کاموں کی تقسیم شروع کی تو تصویریں بنانے کا کام بھی مخصوص لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف پیشے وجود میں آتے گئے۔ کوئی کھیتی باڑی کرنے لگا، کوئی لوہار بن گیا، کوئی مکان بنانے لگا، اور کسی نے عبادت کا کام سنبھال لیا۔ اسی طرح، جو لوگ کسی چیز کو دیکھ کر آسانی سے اس کی تصویر بنا سکتے تھے، وہ تصویریں بنانے لگے۔ یوں رفتہ رفتہ 'آرٹسٹ' یا فنکار وجود میں آیا، جو آج کے دور میں تصویر اور فن کا ماہر مانا جاتا ہے۔

تصویری صحافت (Photo Journalism) صحافت کی ایک ایسی شاخ ہے جس میں تصاویر کو خبر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تصاویر خبری، تحقیقی، تجزیاتی یا تاثراتی نوعیت کی ہو سکتی ہیں۔ ان کا مقصد محض خوبصورتی دکھانا نہیں بلکہ خبر کو بصری شکل میں پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری یا ناظر محض تصویر دیکھ کر پوری کہانی سمجھ سکے۔

خبروں کو تصویروں کے ذریعے پہنچانے کا آغاز سب سے پہلے 1842 میں انگلینڈ کے 'الیسٹریٹڈ لندن نیوز' نامی اخبار نے کیا تھا۔ اس کے بعد امریکہ میں بھی تصویری اخبارات اور رسائل چھپنے لگے۔ 1839 میں ولیم ہنری فاکس نے ایک طریقہ ایجاد کیا جس سے منفی (نیگیٹو) سے مثبت (پازیٹو) یعنی اصلی تصویر بنانا آسان ہو گیا۔ لیکن اس وقت تصویریں ویسے کی ویسی چھاپنے کے لیے 'ہاف ٹون' طریقہ کافی دیر بعد عام

ہوا۔ یہ ایسا طریقہ تھا جس سے تصویریں آسانی اور سستے میں چھپنے لگیں۔ امریکہ میں ایک شخص ہینری جے نیوٹن کی مشہور تصویر 'جھونپڑیوں کا شہر' 4 مارچ 1880 کو 'نیویارک گرافک' اخبار میں چھپی، جو کہ اس نئے طریقے سے چھپی ہوئی پہلی تصویر تھی۔ لیکن فوٹو جرنلزم کو اصل اہمیت تب ملی جب امریکہ-اسپین جنگ، پہلی جنگ عظیم، اور اسپین کی خانہ جنگی جیسے واقعات ہوئے۔ ان جنگوں کے دوران کچھ مشہور فوٹوگرافر جیسے میتھیو بریڈی، جمی ہیئر، جے سی ہیمنٹ اور رابرٹ کاپا نے ایسی شاندار تصویریں کھینچیں جو آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ بن گئیں۔

ابتدائی دور میں اخباروں سے وابستہ فوٹوگرافروں نے اس شعبے کو بہت بڑھایا۔ مگر 20ویں صدی کے تیسرے عشرے میں فوٹو جرنلزم کو بدنامی بھی ملی۔ کچھ اخبارات جیسے 'ڈیلی گرافک'، 'ڈیلی مرر' اور 'ڈیلی نیوز' نے جھوٹی تصویریں چھاپیں، یعنی ایسی تصویریں جو مختلف فوٹوز کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ایسے عمل کو آج کے دور میں قبول نہیں کیا جاتا کیونکہ تصویر کو لوگ سچ مانتے ہیں، اور یہی بات فوٹو جرنلزم کو طاقت دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک تصویر نے امریکی صدر ابراہم لنکن کو 1860 میں الیکشن جتوانے میں بہت مدد دی۔ یہ تصویر فوٹوگرافر میتھیو بریڈی نے کھینچی تھی۔ اس وقت لنکن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دیہاتی اور جاہل شخص ہے، لیکن اس ایک تصویر نے سب باتوں کا جواب دے دیا۔ ایک اور تصویر جس میں میری لینڈ کے سینیٹر ملارڈ ٹائڈنگز کو ایک کمیونسٹ لیڈر کے ساتھ دوستانہ بات کرتے دکھایا گیا تھا، وہ بھی جھوٹی (کمپوزٹ) تصویر تھی، اور اس تصویر کی وجہ سے وہ الیکشن ہار گئے۔ یہ بات عام ہوگئی کہ کیمرا جو دکھاتا ہے، وہ حقیقت ہے، اور فوٹوگرافر خود ایک گواہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اچھی اور سچی تصویروں کی مانگ اخبارات اور رسالوں میں بڑھنے لگی، جس کی وجہ سے فوٹو تقسیم کرنے والے ادارے (سنڈیکیٹ) بننے لگے۔ امریکہ نے اس میں سب سے پہلے قدم اٹھایا۔ 'نیویارک ٹائمز' کا 'وائڈ ورلڈ'، 'ہرسٹ انٹرنیشنل نیوز فوٹوز'، 'اے سی ایم ای' اور 'یو پی' جیسے ادارے 20ویں صدی کے شروع میں قائم ہوئے۔ 1926 میں 'ایسوسی ایٹڈ پریس' نے نیوز سروس شروع کی اور 1935 میں فوٹو سروس بھی۔ تھوڑے ہی وقت بعد ریڈیو سروس بھی شروع ہوئی۔ آج ہمیں سادہ اور رنگین دونوں تصویروں کے لیے ٹیلی گراف اور ریڈیو کے ذریعے سہولت حاصل ہے۔

فوٹو جرنلزم صرف فوٹوگرافی کی ترقی کی وجہ سے اس مقام تک نہیں پہنچی، بلکہ پرنٹنگ اور نقل بنانے کی ٹیکنالوجی نے بھی اس میں اہم کردار ادا کیا۔ 1880 میں جھونپڑیوں کا شہر والی تصویر 'ہاف ٹون' طریقے سے پہلی بار چھپی، جسے بعد میں بہتر بنایا گیا۔ آج 'کراس لائن اسکرین' کا طریقہ ہے، وہ فریڈرک یوگین آئکس اور لیوی برادران کی کوششوں سے ممکن ہوا۔ کسی بھی چھپی تصویر کا معیار اس کی پرنٹنگ، کاغذ، سیاہی وغیرہ پر منحصر ہوتا ہے۔ فوٹو جرنلزم میں صرف کیمرے کی نہیں بلکہ اسے چلانے والے شخص کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یا تو وہ فطری صلاحیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، یا اسے

> تصویری صحافت (Photo Journalism) صحافت کی ایک ایسی شاخ ہے جس میں تصاویر کو خبر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تصاویر خبری، تحقیقی، تجزیاتی یا تاثراتی نوعیت کی ہوسکتی ہیں۔

کیمرے، لینس، زوم، اور دوسرے آلات کے استعمال کی مکمل تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ اچھے اور سچے فوٹو پیش کر سکے۔

ایک فوٹوگرافر کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کس زاویے (Angle) اور کس نظریے سے کس قسم کے کیمرے اور فلم کا استعمال کرنا ہے۔ اُس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ کسی بھی منظر کا صحیح اور فیصلہ کن لمحہ (Decisive Moment) پکڑ سکے۔ خبروں کے لیے تصویریں لیتے وقت اندازہ لگانا، یعنی پہلے سے سوچ لینا کہ کیا ہونے والا ہے، یہ سب سے اہم بات ہے۔ ایک اچھا فوٹوگرافر صرف کیمرے کا بٹن دبانے والا نہیں ہوتا، بلکہ اُس میں اتنی سمجھ اور اندرونی بصیرت (Insight) ہونی چاہیے کہ وہ جو کچھ خود دیکھتا ہے، وہی کچھ تصویروں کے ذریعے دوسروں کو بھی دکھا سکے۔ وہ تبھی یہ سب کر سکتا ہے جب اُس میں ایک فنکار کی مہارت ہو اور ایک ماہر کاریگر کی خوبیاں بھی ہوں۔ حالانکہ کیمرے کی کچھ اپنی حدود ہوتی ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کیمرہ چلانے کے فن میں ماہر ہو تو وہ ان حدود کو بھی پار کر سکتا ہے۔ جس طرح ایک مصور (Painter) اپنے برش، رنگ اور موضوع کو سوچ سمجھ کر منتخب کرتا ہے، ویسے ہی ایک فوٹوگرافر بھی حالات، مناظر اور موضوعات کو اپنے نظریے سے چنتا ہے اور ان کے لیے مناسب آلات استعمال کرتا ہے۔ انسان کی آنکھ بہت کچھ دیکھتی ہے، اور وہ روشنی، سایہ اور رنگوں کے ذریعے ہر منظر کا مطلب الگ انداز سے سمجھتی ہے۔ اس لیے کیمرہ چلانے کے ہنر کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فوٹوگرافر کی نظر بہترین منظر پر جا کر ٹھہرے۔ اگر آپ کے پاس کتنا ہی مہنگا اور جدید کیمرہ ہو، لیکن اگر آپ کی نظر (یعنی آپ کی آنکھ) تیز، جذباتی اور زندگی سے بھرپور لمحے کو پہچاننے میں ناکام ہے، تو آپ فوٹوگرافر تو بن سکتے ہیں، لیکن ایک اعلیٰ درجے کے فوٹو صحافی (Photo Journalist) نہیں بن سکتے۔

آج کی دنیا میں ایک فوٹو صحافی (Photo Journalist) کی بہت اہم ذمہ داری ہے۔ امریکہ کے سابق صدر آئزن ہاور نے ایک بار کہا تھا کہ 'دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگوں کے درمیان میل جول اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں فوٹو جرنلسٹ کا بڑا کردار ہوتا ہے۔'' تصویروں کی زبان دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے آسان سمجھی جاتی ہے۔ تصویریں سچ کو ویسا ہی دکھا دیتی ہیں جیسا وہ ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ کسی بھی قیمت پر ایک فوٹو جرنلسٹ کو جھوٹی یا گمراہ کن تصویریں نہیں دینی چاہئیں۔ ایسے فوٹو بھی نہیں دینے چاہئیں جو سماجی یا سیاسی مسائل کو ہوا دے سکتے ہوں یا انتشار پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہوں۔

ایک فوٹو صحافی کو چاہیے کہ وہ اپنا کام خاموشی سے اور بغیر کسی دکھاوے کے کرے۔ اگر وہ تصاویر لیتے وقت بہت زیادہ نمایاں ہو جائے یا حرکت کرے، تو اس سے اصل حالات میں بگاڑ آ سکتا ہے۔ میں نے کچھ فوٹوگرافروں کو دیکھا ہے جو مظاہرہ کرنے والوں کو نعرے لگانے کے لیے اکساتے ہیں تاکہ تصویریں

زیادہ جوشیلی یا ڈرامائی لگیں۔ لیکن ایسے موقعوں پر فوٹو صحافی کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے اور ایسی حرکتوں سے بچنا چاہیے، کیونکہ اس کا کام صرف حقیقت کو دکھانا ہے، نہ کہ اسے بدلنا یا بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ فوٹو صحافی کو تصویریں لینے کے لیے کبھی بھی کوئی خاص انتظام یا تھوڑا سا ڈرامائی انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے، لیکن جو کچھ بھی کیا جائے، وہ سماج (معاشرے) کی بھلائی کے لیے ہونا چاہیے۔ مشہور تصویری صحافی نول جیسوال ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''1939 میں جب بہار میں قحط پڑا تھا، تو میں ایک ایسے جنگل سے گزر رہا تھا جہاں سڑکیں نہیں تھیں۔ مجھے ایک سماجی کارکن نے بتایا کہ راستے سے کچھ دو تین میل اندر ایک خاندان اپنے بوڑھے رشتہ دار کو بھوکا مرنے کے لیے جھونپڑی میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ جب میں وہاں پہنچا، تو دیکھا کہ وہ کمزور سا بوڑھا آدمی اندھیری جھونپڑی کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے تصویر لینا ممکن نہیں تھا۔ تب میں نے سماجی کارکنوں کی مدد سے اس بوڑھے کو جھونپڑی کے باہر دھوپ میں آنگن میں لا کر لٹا دیا، جہاں اس کے بچوں نے مہوے کے کچھ پھول اس کے کھانے کے لیے رکھے تھے۔ میں نے اس منظر کی تصویر لی، جسے کئی اخبارات نے خوشی سے شائع کیا۔''

(پوٹو پتر کارتا، نول جیسوال، ص122)

خاص بات یہ تھی کہ انگلینڈ کے ایک اخبار نے اس تصویر کو اشتہار کے طور پر استعمال کیا تاکہ عوام سے قحط زدگان کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا سکے اور ان کی مدد کی جا سکے۔

لہٰذا اگر کسی خبر یا منظر کو مؤثر بنانے کے لیے اس طرح کی تخلیقی کوشش کی جائے، اور اس کا مقصد اچھا ہو، تو اسے غیر اخلاقی نہیں کہا جا سکتا۔ چاہے فوٹو جرنلسٹ کسی روزنامے سے وابستہ ہو یا ہفتہ وار اخبار سے، وہ اپنے کام کے ذریعے ایک صحافی یا کالم نگار کی طرح اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ واقعے کی جگہ پر خود موجود ہوتا ہے۔ پروفیسر مہدی حسن لکھتے ہیں کہ:

''ایک اخباری فوٹوگرافر میں ایک رپورٹر ہی کی طرح خبر کو سونگھنے اور محسوس کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔ بلکہ فوٹوگرافر کو اپنے کام میں اتنا ماہر اور تیز ہونا چاہیے کہ کوئی ایسا موقع آتے ہی وہ فوری طور پر عمل کر سکے۔ رپورٹر تو کسی واقعہ کو اپنی یادداشت کے سہارے تحریر کر سکتا ہے لیکن فوٹوگرافر نے اگر کوئی خاص لمحہ ضائع کر دیا تو وہ دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔''

(تصویری صحافت، پروفیسر مہدی حسن)

اخباری فوٹوگرافر محض ایک کیمرہ تھامے شخص نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک باشعور مشاہد اور فعال صحافی بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: ''ایک اخباری فوٹوگرافر میں ایک رپورٹر ہی کی طرح خبر کو سونگھنے اور محسوس کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ فوٹوگرافر کو بھی اس واقعے کی تہہ تک پہنچنے، اس کی معنویت کو سمجھنے اور اس کے حساس پہلوؤں کو محسوس کرنے کی اتنی ہی صلاحیت ہونی چاہیے جتنی ایک رپورٹر میں ہوتی ہے۔ تاہم، ایک فوٹوگرافر کی ذمہ داری اس لحاظ سے زیادہ نازک ہو جاتی ہے کہ اس کے پاس کسی منظر کو محفوظ کرنے کے لیے صرف ایک لمحہ ہوتا ہے۔ رپورٹر بعد میں بھی واقعے کو یاد کر کے، لکھ کر یا تحقیق کے ذریعے اپنا کام مکمل کر سکتا ہے، لیکن اگر فوٹوگرافر سے وہ ایک خاص لمحہ چھوٹ گیا تو وہ لمحہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ ایک اچھی تصویر صرف تکنیکی مہارت سے نہیں بنتی بلکہ اس کے لیے 'دیکھنے والی آنکھ' اور 'سوچنے والا ذہن' بھی ضروری ہے۔ کیمرہ تو محض ایک آلہ ہے، لیکن وہ تصویر جو دل کو چھو جائے یا کوئی داستان سنا جائے، صرف وہی فوٹوگرافر کھینچ سکتا ہے جو لمحے کی اہمیت کو پہچان کر فوراً ردِعمل دے۔ اس لیے فوٹو جرنلزم صرف ایک فن نہیں بلکہ لمحوں کو زندہ رکھنے کی وہ صلاحیت ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ:

''اخباری فوٹوگرافر کے لیے بھی تصویروں میں غیر جانبداری کا مظاہرہ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اخباری رپورٹر یا کسی دوسرے اخبار نویس کے لیے ضروری ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ فوٹو گرافر کے لیے رپورٹ سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ اپنا کام غیر جانبداری اور پیشہ ورانہ دیانت داری سے سرانجام دے اس لیے کہ تصویر پر لوگوں کو تحریر سے زیادہ اعتماد ہوتا ہے مثل مشہور ہے کہ ''آنکھوں دیکھی کانوں سنی سے زیادہ معتبر ہوتی ہے''، تصویر کسی بھی اخبار رسالے، کتاب اشتہار یا پمفلٹ کے قاری کے لیے کسی وقوعے کا آنکھوں دیکھا حال ہوتی ہے۔ لہٰذا کوشش یہ کرنی چاہیے کہ تصویر ایسے زاویے اور اس انداز سے نہ بنائی جائے جو لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دے، اس کے علاوہ کیمرہ ٹرک یا 'ڈارک روم تکنیک' سے تصویر میں جوڑ توڑ کرنا یا کسی واقعہ کو غلط رنگ میں پیش کرنا انتہائی بددیانتی پر مبنی ہے۔''

(تصویری صحافت، پروفیسر مہدی حسن)

فوٹو جرنلزم ایک ایسا شعبہ ہے جو نہ صرف خبروں کو بصری انداز میں پیش کرتا ہے بلکہ دیکھنے والے کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑتا ہے۔ تصویر صرف ایک فریم نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک لمحے کی سچائی، ایک واقعے کی گہرائی اور کئی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ایسے میں فوٹو جرنلسٹ کی سب سے بڑی ذمہ داری سچ کو بغیر کسی تحریف کے پیش کرنا ہے، اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اس کے کام میں غیر جانبداری اور دیانتداری کا پہلو نمایاں ہو۔ غیر جانبداری کا مطلب یہ ہے کہ فوٹوگرافر ذاتی، سیاسی یا مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر صرف حقیقت کو کیمرے کی آنکھ سے قید کرے۔ وہ کسی خاص نظریے کی تائید یا مخالفت کے لیے تصویر نہ کھینچے بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے، اُسے ویسا ہی دکھائے جیسا وہ ہے۔

اسی طرح دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ فوٹوگرافر تصویر کو ایڈیٹنگ یا تکنیکی چالاکی کے ذریعے مسخ نہ کرے۔ فوٹو جرنلسٹ کا کردار دراصل ایک گواہ کا ہوتا ہے ایسا گواہ جو زبان سے نہیں بلکہ کیمرے سے گواہی دیتا ہے۔ اس گواہی میں اگر سچائی، توازن اور غیر جانبداری نہ ہو تو پھر صحافت محض پروپیگنڈہ بن جاتی ہے۔ دیانتدار فوٹوگرافر وہی ہوتا ہے جو ذاتی فائدے، شہرت یا نظریاتی مفاد کے لیے سچ کو قربان نہ کرے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ فوٹوگرافر اپنے ذاتی جذبات پر قابو رکھتے ہوئے مظلوم و ظالم دونوں کے چہرے دکھا سکے۔ کیونکہ صحافت کا مقصد انصاف دلانا نہیں بلکہ حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے، انصاف تو قارئین، ناظرین اور تاریخ کو کرنا ہے۔ آخر میں، ایک سچی اور غیر جانبدار تصویر وقت کے سینے پر وہ نقش چھوڑتی ہے جو برسوں تک لوگوں کے ذہنوں میں زندہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوٹو جرنلسٹ کا کیمرہ ایک مقدس امانت ہے، جسے ایمانداری اور غیر جانبداری سے استعمال کرنا اس کے پیشے کا اولین تقاضا ہے۔

■

Abdul Razzaque
Dept of Urdu
Delhi University
Delhi- 110007
Mob.:8574614504
abdul.rij!gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ و ما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں

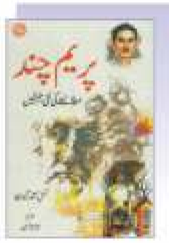

مصنف: کمل کشور گوئنکا، مترجم: محمد صغیر حسین

صفحات: 283، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد اکرام

6A-89، گلی نمبر 9، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

انسانی زندگی کے تقریباً سبھی شعبہ جات میں تحقیق و تفتیش اور تلاش و جستجو کا عمل ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک جاری و ساری ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بشری تقاضوں سے ہم آہنگ روزمرہ کی تمام ضروریات کو آسان اور بہتر بنانا ہے۔ زبان و ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ادب میں مطالعہ اور تحقیق و تجزیے کی روایت بہت پرانی ہے، زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک نئی تحقیقات اور نت نئے تجربوں کا سلسلہ برقرار ہے۔ پریم چند (پ: 31 جولائی 1880، و: 8 اکتوبر 1936) جیسے فکشن نگار کا نام یہاں بطور خاص لیا جاسکتا ہے جن کی حیات اور تخلیقات کو اردو ہندی دونوں زبانوں کے ناقدین اور محققین نے اپنی تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔ پریم چند اچھے ادیب، عمدہ صحافی، ڈراما نگار اور مترجم کی حیثیت سے مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں انھیں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ ہندی زبان و ادب میں پریم چند شناسی میں کمل کشور گوئنکا کا نام بہت عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں کی ایک تاریخ ترتیب دی اور ان کی نادر و نایاب تخلیقات کو جو عام ناقدین و محققین کی رسائی سے دور تھیں، دریافت کر کے اسے شائع بھی کرایا۔ ساہتیہ اکادمی سے شائع شدہ 'پریم چند کہانی رچناولی' (چھ جلدیں) اور 'نیا مانسرووَر' (آٹھ جلدیں) ان کی ان تھک کوشش اور تحقیقی جدوجہد کا ثبوت ہیں۔ پریم چند پر ان کی مشہور کتاب 'پریم چند کی کہانیوں کا کال کرمانوسار ادھیین' کے لیے انھیں 2014 میں ویاس سمان جیسے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ڈاکٹر اجے مالوی نے کیا ہے۔ پہلی بار یہ کتاب قومی اردو کونسل سے 2002 میں شائع ہوئی ہے۔ 2023 میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ گوئنکا کے علاوہ ہندی زبان کے قلمکاروں میں پنڈت جناردن جھا 'دوج'، امرت رائے، رام نرائن لال، رام ولاس شرما، نامور سنگھ، اندرناتھ مدان، نند دلارے واجپئی، مدن گوپال، شیو کار مشرا، پرکاش چندر گپت، سدانند شاہی، کمار کرشن وغیرہ کا نام بھی پریم چند شناسی کے حوالے سے بہت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں بھی کئی ناقدین و محققین نے پریم چند کو اپنے مطالعے کا حصہ بناتے ہوئے کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس ضمن میں پریم چند: فکر و فن (قمر رئیس)، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار (ڈاکٹر قمر رئیس)، پریم چند کے خطوط (مدن گوپال)، قلم کا مزدور (مدن گوپال)، پریم چند کی آپ بیتی (مدن گوپال)، پریم چند (عبدالقوی دسنوی)، پریم چند کی کہانیاں (جوگندر پال)، پریم چند ایک نقیب (پروفیسر صغیر افراہیم)، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ (پروفیسر صغیر افراہیم)، پریم چند حیات اور فن (اصغر علی انجینئر)، افسانہ نگار- پریم چند: تنقیدی و سماجی محاکمہ (عظیم الشان صدیقی)، پریم چند (امرت رائے)، پریم چند کہانی کار (جعفر رضا)، پریم چند (پرکاش چندر گپت)، پریم چند کے افسانے: حقیقت نگاری اور دیہی زندگی کے مسائل (خالد حیدر)، پریم چند کی مضمون نگاری (ڈاکٹر خالد انجم)، اردو ناول پریم چند کے بعد (ڈاکٹر ہارون ایوب)، پریم چند: مونوگراف (پرکاش چندر گپت) کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ کئی ناقدین و محققین نے پریم چند کی تخلیقات مرتب بھی کی ہیں۔ ان میں مدن گوپال (کلیات پریم چند)، پریم چند کے منتخب افسانے: بڑے گھر کی بیٹی سے کفن تک (مرتب: شمیم حنفی)، پریم چند کے 15 منتخب افسانے (مرتب: شمیم حنفی)، پریم چند کے

شاہکار افسانے (مرتب: اعجاز خاور)، پریم چند کے سو افسانے (مرتب: آصف نواز)، پریم چند کے سو افسانے (مرتب: پریم گوپال متل)، پریم چند کے منتخب افسانے (ڈاکٹر عبید اللہ خاں)، سوز وطن: پریم چند (مقدمہ و حواشی: علی احمد فاطمی)، پریم چند کی بیس کہانیاں (ڈاکٹر انوار احمد)، پریم چند کے تیرہ افسانے (ڈاکٹر پشپیندر کمار نم) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کمل کشور گوینکا کی نئی کتاب 'پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں' قومی اردو کونسل سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے پریم چند کی پوری زندگی مثلاً تعلیم، ملازمت، شادی بیاہ اور ادبی خدمات کو بہت ہی تحقیق اور عمیق مشاہدے سے قلم بند کیا ہے۔ اردو ورژن سے پہلے ہندی میں اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تمہید میں ان دونوں ایڈیشنوں کا ذکر بھی کتاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کو اردو میں محمد صغیر حسین نے منتقل کیا ہے۔ ترجمے کے باب میں محمد صغیر حسین انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے متعدد اخبارات و رسائل میں ان کے تراجم اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اصل زبان کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

'پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں' میں 31 مضامین (1) پریم چند: حیات اور ادبی خدمات (2) پریم چند کی تاریخ پیدائش (3) چونکا دینے والا ایک خط (4) پریم چند: بیٹی کو اسکولی تعلیم نہ دینے کا سوال (5) بیٹی کملا کی شادی اور جہیز کا مسئلہ (6) کیا پریم چند کا بھوت پریت پر یقین تھا؟ (7) پریم چند کے کچھ غیر دستیاب خطوط (8) پریم چند کے نام خطوط (9) 'ہنس' کے مدیر کے عہدے سے استعفیٰ - ایک نامعلوم کہانی (10) پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ (11) پریم چند کے آخری لمحات (12) پریم چند کا ہندی - اردو ادب (13) اردو کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' - چند نئے حقائق (14) پریم چند کی ہندی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سپت سروج' اور اس کی اہمیت (15) ناولوں کا وقتِ تخلیق و اشاعت (16) 'رنگ بھومی' میں زمین کی حفاظت کے لیے سورداس کی جدوجہد (17) 'کایا کلپ' کی کہانی کی تخلیق اور اس کا مقصد (18) ہوری کی موت - چند سوالات (19) 'گئودان': تحدید مقام کا المیہ (20) پریم چند کے رزمیہ ناول (21) کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' - کس کی اداکاری' کس کی فلم بندی؟ (22) پریم چند: مختصر کہانی کے خالق (23) ہندی میں پریم چند کی غیر شائع شدہ اردو کہانیاں (24) پریم چند اور پنڈت جواہر لال نہرو (25) پریم چند اور اقبال (2) پریم چند اور خاندانی منصوبہ بندی (27) پریم چند: پہلا نفسیاتی ناول نگار (28) پریم چند: ایک نئے شعور فن کا خالق (29) پریم چند اور راجستھان (30) پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں (31) ایک ادیب پر انسائیکلوپیڈیا (قاموس) شامل ہیں۔

مذکورہ سبھی مضامین 81-1979 کے مابین مختلف رسائل و جرائد کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔ کتاب میں شامل بیشتر مضامین قارئین کو نئے زاویے، نئی جہات اور نئی سوچ کے ساتھ مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ کمل کشور گوینکا نے تمہید میں پریم چند کی تخلیقات کے مطالعے اور تجزیے کے ضمن میں ایک اہم نکتے کی جانب یوں اشارہ کیا ہے، کہ ہندی زبان میں پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ اور تجزیہ دو طریقے سے کیا گیا۔ پہلا معروضی اور دوسرا انفرادیت پسندانہ۔ معروضی تجزیے میں ان کی تخلیقات کا مثبت سوچ کے ساتھ مطالعہ کر کے اس کا تجزیہ کیا گیا جب کہ 'انفرادیت پسندانہ' میں مذمت اور مخالفت کا جذبہ حاوی ہے۔ معروضی تجزیہ نگاروں میں پنڈت منن دویدی، پنڈت پدم سنگھ شرما، پنڈت رام داس گوڑ، شیو پوجن سہائے، جینیندر کمار، کالیداس کپور، پنڈت بنارس داس چترویدی، رگھوپتی سہائے فراق وغیرہ کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے، جب کہ دوسری جانب اودھ اپادھیائے، ٹھاکر شری ناتھ سنگھ، پنڈت جیوتی پرساد مشر 'نرمل'، ڈاکٹر ہیم چند جوشی، ایلا چند جوشی، شلی مکھ، نند دلارے باجپئی وغیرہ ہیں جنھوں نے منفی تجزیے کیے ہیں، انھوں نے پریم چند پر چوری اور نقل کا الزام بھی لگایا، جسے پریم چند سے دشمنی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان متعصبانہ تجزیوں کا جواب سب سے پہلے امرت رائے نے دیا، جن کی تقریباً آٹھ یا نو کتابیں شائع ہوئیں۔ بہر حال تمہید کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلا مضمون ہے 'پریم چند: حیات اور ادبی خدمات' اس مضمون میں کمل کشور گوینکا نے پریم چند کی حیات، تعلیم، ملازمت اور ادبی خدمات کا بہت ہی تحقیق اور تفتیش کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ادبی خدمات کے حوالے سے اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی 301 کہانیاں شائع ہوئی ہیں جو 'پریم چند: کہانی رچناولی' کی چھ جلدوں اور 'نیا مانسرووَر' کی آٹھ جلدوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے تین کہانیاں ابھی بھی دستیاب نہیں ہیں۔

کمل کشور گوینکا نے 'پریم چند کی تاریخ پیدائش' میں ذاتی تحقیق کی بنیاد پر پریم چند کی تاریخ پیدائش کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ جولائی 1880 درست ہے مگر 31 جولائی کے مدلل شواہد دستیاب نہیں ہیں، حالانکہ پریم چند کے بڑے بیٹے نے کمل کشور گوینکا کو جو مراسلہ لکھا تھا اس میں 31 جولائی 1980 کا ہی ذکر ہے۔ مصنف نے ان مضامین میں تحقیق کا جو طریقہ اپنایا ہے، اس میں محققین کے اختلافی نظریات کے ساتھ قارئین کو بھی غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

مضمون 'پریم چند کے کچھ غیر دستیاب خطوط' ایک اہم مضمون ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں بہت واضح طور پر لکھا ہے کہ پریم چند پر اتنا کام ہونے کے باوجود آج بھی ان کی بہت سی تحریریں محققین کی گرفت سے دور ہیں۔ گوینکا جی نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ ''جب میں نے 'پریم چند وشوکوش' (پانچ جلدیں) کے منصوبے پر کام شروع کیا تو محسوس کیا کہ پریم چند کے غیر دستیاب ادب کی تلاش کا کام ابھی کئی سالوں تک چلانا پڑے گا۔ میں نے تقریباً آٹھ نو سالوں تک مسلسل تحقیقی کام کرتے ہوئے سیکڑوں صفحات کا نامعلوم ادب تلاش کیا، جس میں سے 16 غیر دستیاب کہانیوں کا مجموعہ پریم چند کے بڑے بیٹے شری پت رائے شائع کر رہے ہیں۔ ان کہانیوں کے علاوہ میں نے پریم چند کے سیکڑوں ایسے خطوط جمع کیے ہیں جو ابھی تک ہماری آنکھوں سے اوجھل تھے۔'' (پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں، ص 41)

مضمون 'پریم چند کی ڈائری کا مطالعہ' میں کمل کشور گوینکا نے ایک اہم انکشاف کیا ہے کہ شری امرت رائے کی کتاب 'پریم چند: قلم کا سپاہی' سے پہلے یہ ہندی اور اردو دنیا کو معلوم نہیں تھا کہ وہ روزمرہ کے واقعات ڈائری میں نوٹ کرتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ پریم چند کے خاص دوستوں نے بھی اس بات کا کہیں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ گوینکا جی لکھتے ہیں کہ ''امرت رائے نے پہلی بار ہندی قارئین کو بتایا کہ 11 فروری سے 24 فروری، 1928 تک کے ڈائری کے صفحات ملے ہیں، جن میں پریم چند نے 'مادھوری' دفتر میں کام کرتے ہوئے روزانہ کاموں کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے۔'' (ایضاً، ص 62)

مضمون 'پریم چند کے آخری لمحات' ایک معلوماتی مضمون ہے۔ اس مضمون میں

پریم چند کے تعلق سے کچھ نئے انکشافات کیے ہیں۔ مصنف کا ماننا ہے کہ پریم چند کی وفات کے بارے میں عموماً ناقدین متفق ہیں۔ اختلاف وقت کے صحیح تعین کا ہے۔ گوئنکا جی نے اس بابت لکھا ہے کہ ان کے انتقال کا صحیح وقت صبح 7:30 اور 8 بجے کے درمیان کا ہے۔ اس بات کو امرت رائے نے 'قلم کا سپاہی' میں بھی ذکر کیا ہے۔

'پریم چند کا ہندی-اردو ادب' ایک حوالہ جاتی مضمون ہے۔ اس مضمون میں پریم چند کی اردو-ہندی تصنیفات کی مکمل فہرست مع سنہ اشاعت مستند حوالوں کے ساتھ شامل کتاب ہے۔ ساتھ ہی وہ تمام کتابیں بھی شامل ہیں جو پریم چند کی حیات اور ان کے انتقال کے بعد پریم چند کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ گوئنکا جی کا ماننا ہے کہ اس طرح کی فہرست ان سے پہلے کسی نے تیار نہیں کی ہے۔

'اردو کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' میں کمل کشور گوئنکا نے 'سوز وطن' کے تعلق سے بہت تفصیلی باتیں رقم کی ہیں۔ پریم چند کا یہ افسانوی مجموعہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے، انگریزوں کی غلامی کے خلاف سب سے پہلے پریم چند نے اس مجموعے کے ذریعے آواز بلند کی تھی۔ سزا کے طور پر مجموعے کی 700 کاپیوں کو جلا دیا گیا۔ اس مضمون میں گوئنکا جی نے کچھ اور نئے حقائق کی دریافت کی ہے مثلاً 'سوز وطن' پہلا مجموعہ جسے انگریزوں نے مصنف کے سامنے جلایا۔ اس مجموعے میں ناشر کا پتہ بھی کسی وجہ سے چھپنے سے رہ گیا تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کا پہلا اعلان اردو ماہنامہ 'زمانہ' کے جولائی 1908 کے شمارے میں ملتا ہے۔ ایک انکشاف یہ بھی ہوتا ہے کہ اس مجموعے کو پریم چند نے ہندی قارئین تک پہنچانے کے لیے ہندی رسالے 'سرسوتی' کا سہارا لیا تھا۔ اس حقیقت کی جانکاری کاشی ناگری پرچارنی سبھا، وارانسی کے کتب خانے میں رکھی 'سوز وطن' کی کاپی سے ملی، جس میں دویدی جی کے دستخط کے نیچے 22 ستمبر 1908 کی تاریخ درج ہے جو کتاب کے موصول ہونے کی تاریخ ہے۔

'پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں' اپنی نوعیت کا منفرد اور معلوماتی مضمون ہے۔ گوئنکا جی نے کتاب کے ٹائٹل سے ہی اپنا موقف واضح کر دیا ہے کہ کسی تخلیق کار کی کوئی تخلیق کسی ایک عہد یا صدی کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ دائمی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ کسی متن کے مطالعے کی بہت سی جہات ہوتی ہیں۔ اسے جتنی بار پڑھیں گے اتنے ہی معانی و مفاہیم سے روشناس ہوں گے۔ پریم چند کے حوالے سے مطالعے کی نئی جہتوں پر اس لیے بھی زور دیا گیا ہے کہ تحقیق کے دوران آج بھی جب پریم چند کی کوئی نئی تحریر سامنے آتی ہے، تو لگتا ہے کہ پریم چند کو اس زاویے سے تو کسی نے سوچا ہی نہیں، یہ سچ ہے کہ پریم چند کے حوالے سے بہت سے ایسے نکات ابھی بھی تشنہ ہیں جن پر آئندہ کچھ اور چونکانے والے انکشافات ہوں گے۔

مذکورہ مضامین کے علاوہ کتاب میں شامل بقیہ مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں کمل کشور گوئنکا نے تحقیق کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ بیشتر تحقیقی نکات شواہد و دلائل سے مزین ہیں، اپنی بات کی توثیق کے لیے انھوں نے بعض اچھے محققین کو بطور ثبوت پیش بھی کیا ہے۔ اگر کسی محقق سے پریم چند کے ادب کو سمجھنے میں سہو ہوا ہے تو اسے غلط ثابت کرنے کے لیے بھی ضروری حوالے پیش کیے گئے ہیں۔

پریم چند اور ان کے ادب کے حوالے سے ڈھیروں کام ہونے کے باوجود بھی بہت سی تحریریں ناقدین اور محققین کی گرفت سے دور ہیں، ضرورت ان کی تمام تحریروں کو یکجا کر کے قارئین سے روبرو کرانے کی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعے سماج کو جو میسیج دے گئے ہیں، وہ موجودہ منظرنامے کے لحاظ سے بھی کافی معاون اور مفید ہیں۔ ضرورت ہے مثبت سوچ اور عمیق مطالعے کی۔

پریم چند کی وفات کے تقریباً 90 برس ہو چکے ہیں، مگر پریم چند اپنی شخصیت اور تخلیقات کی بدولت آج بھی قاری کے ذہن و دماغ میں تازہ ہیں۔ آج بھی جب پریم چند کا نام زبان پر آتا ہے تو ان کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات، پلاٹ، کردار ہمارے ذہنوں میں ہو بہو زندہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں اس سچائی کا بھی اعتراف ضروری ہے کہ موجودہ عہد کی سائنسی ترقیات اور سماج کی دیگر ضروریات و نت نئے مسائل کے مدنظر اب ہمیں پریم چند کی تصویر ذرا دھندلی نظر آنے لگی ہے، باوجودیکہ پریم چند ہماری تخلیقی ترجیحات میں، مطالعات میں سیکڑوں انقلابات کے باوجود زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مجھے کامل یقین ہے کہ پریم چند پر کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کو بھی شہرت و مقبولیت کی نئی اونچائیاں حاصل ہوں گی۔ اس کتاب کے مطالعے سے پریم چند کے تعلق سے بہت ساری غلط فہمیوں کے ازالے کے ساتھ کئی ایسے حقائق سے قارئین روشناس ہوں گے جن سے وہ ابھی تک ناواقف تھے۔ کتاب کا سرورق خوبصورت اور جاذب نظر ہے۔ کتاب کی طباعت و اشاعت کے ذمے داران کی ستائش بہرحال ضروری ہے کہ ان کی محنت، لگن اور دلچسپی سے ہی یہ کتاب منظر عام پر آئی۔

سخنوران گجرات

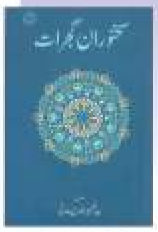

مصنف: سید ظہیر الدین مدنی

صفحات: 319، قیمت: 195 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد یونس انصاری، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو زبان و ادب کی تاریخ و ترقی میں دکن بالخصوص گجرات نے کلیدی رول ادا کیا ہے، جہاں بڑے بڑے عالم و فاضل، بزرگان دین، صوفیا اور شعرا و مصنفین پیدا ہوئے اور اپنے علم و فن کی روشنی سے ملک کے گوشے گوشے کو منور کیا۔ گجرات علم و ادب کے علاوہ دیگر مختلف حیثیتوں سے بھی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جو تجارتی اور جغرافیائی اعتبار سے ملک و بیرون ملک کے افراد کو اپنی جانب متوجہ کرتا رہا ہے۔ عہد عتیق سے ہی دنیا بھر کے لوگ بغرض تجارت و سیاحت یہاں آتے رہے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے سیاسی مقاصد کو سامنے رکھ کر خطے میں قدم رکھے۔ انگریز قوم بھی سب سے پہلے گجرات کی بندرگاہ آئی۔ یہ قوم ملک کے سیاسی نظام میں دلچسپی لینے لگی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ اقتدار پر قابض ہو گئی۔

گجرات ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جو شروع سے ہی تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے لیکن تجارت کے علاوہ یہاں علم و ادب خصوصاً اردو زبان و ادب کے کارناموں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پندرہویں صدی کے نصف آخر سے گجرات میں اردو زبان و ادب کے نقوش مختلف رسائل و کتب میں ملنے لگتے ہیں کہ جب بزرگان دین نے عام مخلوط بولی کو اپنی تحریروں کے ذریعے ادبی شکل عطا کی اور گجری کا نام دیا۔ 17ویں صدی میں خطہ گجرات اردو ادب کی نامور اور ممتاز ہستیوں سے روشناس ہوا جنھوں نے غزل کو انوکھا اور نرالا رنگ و آہنگ بخشا۔ اس دور کی تصنیفات و تالیفات کے

جائزے سے ایک اہم بات سامنے آتی ہے کہ تخلیق کار کسی نہ کسی اہم نظام تصوف کے خانوادے کی نمائندگی کر رہا تھا اور روحانیت کے پرچارک اور انسانیت کے علمبردار کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس عہد میں نظم، مثنوی غزل اور دوہا جیسی اصناف سخن شعرا کی توجہ کا مرکز تھیں۔ گجرات کے حوالے سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ گجرات میں مذہبی، سیاسی اور تجارتی اسباب کے لحاظ سے ایک مخلوط بولی وجود میں آئی جس میں مقامی زبانوں اور غیر زبانوں کے عناصر شامل تھے۔ ان کے امتزاج سے مخلوط بولی کا نہ صرف خمیر تیار ہوا بلکہ مخصوص مزاج پا کر اس نے بولی کا روپ بھی لے لیا۔

گجرات کے بلند و ممتاز شعرا میں ولی دکنی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو شعر و ادب کے فروغ میں ان کا کلیدی رول رہا ہے۔ یہ ولی ہی تھے جنھوں نے دکنی اردو سے شمالی ہند کو روشناس کرایا اور ان کی سعی پیہم کے سبب شمالی ہند میں اردو شعر و سخن کا رواج عام ہوا۔ ولی کے بعد عزلت جیسے بلند پایہ شاعر نے اپنی صلاحیت کا سکہ جمایا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میاں مجھو، میاں منظور، میاں داد خاں سیاح وغیرہ جیسے اہم شعرا کے دم سے گجرات ادبی محفلوں کی آماجگاہ بنا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پھر ایسے شاعر و سخنور پیدا ہوئے جنھوں نے سرزمین گجرات میں شعر و سخن کی محفلوں کو آباد کیا۔ ان میں بعض ایسے شعرا بھی تھے جنھیں دہلی کے اساتذۂ فن سے مشورۂ سخن کا فخر حاصل ہوا۔

سید ظہیرالدین کی تحریر کردہ کتاب 'سخنورانِ گجرات' قومی کونسل کی سلسلۂ مطبوعات کی ایک ایسی ہی کڑی ہے جو دکن بالخصوص گجرات کے نہ صرف شعرا کے ذکر پر محیط ہے بلکہ مصنف نے اس کتاب کے حوالے سے گجرات کے تاریخی حالات کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سے منسوب شعر و شاعری کا تحقیق و تنقید کی روشنی میں جائزہ بھی لیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں مصنف نے چار ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلا باب 1400 تا 1650 کے سیاسی و سماجی پس منظر کا احاطہ کرتا ہے جس میں صوفیا کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے، دوسرے باب میں 1657 سے 1707 تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس باب کے تحت ولی اور ان کے معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کا تیسرا باب 1700 سے 1850 کے شعرا اور ان کے کلام پر مبنی ہے۔ آخری اور چوتھے باب میں ظہیرالدین مدنی نے 1857 سے 1950 تک کے ادبی، سیاسی و سماجی حالات و کیفیات کے ساتھ اس دور کے شعرا سے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کے ہر باب کو مصنف نے تذکرے سے شروع کیا ہے، درمیان میں شعرا کا نمونہ کلام دیا ہے اور پھر سابقہ تفصیلات پر تبصرہ پیش کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں تین ضمیمے بھی دیے گئے ہیں جن میں گجرات کے اہم خاندانوں کے علاوہ نثری کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کی وجہ سے 'سخنورانِ گجرات' شاعری کی حدود سے باہر نکل کر نثر کے زمرے میں بھی داخل ہو گئی ہے۔

'سخنورانِ گجرات' اردو قارئین کے لیے اس لحاظ سے ایک عمدہ کتاب ہے کہ اس میں گجرات کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تجارتی حالات و کیفیات کے ساتھ شعر و ادب سے بھرپور شناسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مصنف نے شعر و ادب کا تفصیلی ذکر کیا ہے جبکہ سیاسی و سماجی حالات کو تمہیدی طور پر بیان کیا ہے تاکہ شعرا کے کلام تک پہنچنے سے قبل ان کے عہد سے واقفیت حاصل ہو جائے کیونکہ ہر فنکار اپنی تخلیقات میں کسی نہ کسی طور پر اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ صاحب کتاب نے 'سخنورانِ گجرات' کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس اعتبار سے اسے ادبی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے گجرات کے شعرا کا جائزہ تاریخی نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر لیا ہے۔ اب تک کتاب کے تین ایڈیشن آ چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1981 میں آیا تھا اور تیسرا ایڈیشن جسے قومی کونسل نے شائع کیا ہے، امسال 2025 میں منظر عام پر آیا ہے۔ کونسل نے کتابت و طباعت کے معیار کا خاص خیال رکھا ہے۔ توقع ہے کہ کتاب کے اس ایڈیشن سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

منشی عبدالقیوم خاں خطاط

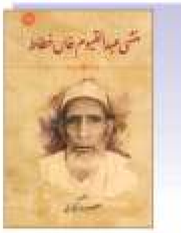

مرتب: معصوم مرادآبادی

صفحات: 202، قیمت: 125 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

اس معلوماتی کتاب کے شروع میں ڈائرکٹر کا پیش لفظ، عرضِ مرتب، احمد سعید ملیح آبادی کا مقدمہ، محسن عثمانی صاحب کا مختصر مضمون اور مصنف کا ابتدائیہ بہ عنوان 'مولانا آزاد کی رفاقت' اس پر مستزاد ہے۔ مرتب نے اس میں جہاں اپنے نانا مرحوم کے احوال سے واقفیت کرا کر 'حقِ نواسیت' ادا کیا ہے، وہیں انھوں نے اردو دنیا پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ ایک گم نام 'گوشہ نشیں شخص' کی اردو سے شیفتگی کو بھی بیان کیا ہے۔

پیش لفظ میں ڈائریکٹر قومی اردو کونسل (شمس اقبال صاحب) نے اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر کونسل سے اس کی اشاعت پر اظہارِ اطمینان کیا ہے تو 'عرضِ مرتب' میں معصوم صاحب نے منشی عبدالقیوم خاں صاحب سے متعلق اجمالی معلومات دے کر اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا ذکر جمیل کیا ہے۔

مقدمہ اردو کے معروف صحافی جناب احمد سعید ملیح آبادی صاحب کا ہے۔ دراصل ان کے والد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی معاون اور دست راست تھے، اور منشی عبدالقیوم خاں صاحب مولانا آزاد کی آڑی ترچھی سطروں کو ایک سمت دینے والے، انھیں خوبصورت بنا کر علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے والے تھے، اس لیے احمد سعید ملیح آبادی نے مقدمہ لکھ کر ان تعلقات کی تجدید کا فریضہ انجام دیا اور بہت سے رازہائے سربستہ سے قارئین کو آگاہ کیا۔

مشہور عالم دین، مفکر دانشور و ادیب محترم پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب کی ایک مختصر تحریر 'مولانا آزاد کی سوانح کا ایک نیا حوالہ' بھی کتاب کے ابتدائی حصہ کا ایک جزو ہے، اس میں موصوف نے منشی عبدالقیوم خاں صاحب کی خوش نویسی کا اعتراف کرتے ہوئے اس نکتہ کو بطورِ خاص ابھارا ہے کہ ''عبدالقیوم خاں صاحب محض الہلال وغبارِ خاطر و ترجمان القرآن کی کتابت تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ ان کے مولانا سے ذاتی مراسم اس نوعیت کے تھے جس نے انھیں آزاد شناسوں کی پہلی صف میں کھڑا کر دیا تھا، منشی عبدالقیوم خاں صاحب، مولانا آزاد کے اندرونِ خانہ سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے، حالتِ عسر و یسر میں مولانا آزاد پر کیا کچھ مالی پریشانیاں آئیں ان سب کی واقفیت بھی منشی صاحب مرحوم کو بخوبی تھی''۔

'ابتدائیہ' میں ہی معصوم مرادآبادی نے سترہ اٹھارہ صفحات پر مشتمل ایک مضمون 'مولانا آزاد کی رفاقت' کے عنوان سے سپرد قلم کیا ہے جس میں انھوں نے مولانا آزاد اور منشی عبدالقیوم خاں صاحب کے تعلقات کے ابتدائی زمانہ پر نانا مرحوم کے حوالہ سے بڑی دل چسپ معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ ان کی تحریر سے بھی یہی تاثر

ابھر کر آتا ہے کہ ”منشی عبدالقیوم خاں صاحب صرف مولانا آزاد کی تحریروں کو جلا بخشنے والے نہیں تھے بلکہ وہ مولانا آزاد کے شب و روز، اندرونی و بیرونی کارکردگیوں کے عینی شاہد بھی تھے۔“ انھوں نے مولانا آزاد کا جس طریقہ سے مشاہدہ کیا، اس سے اردو زبان کے علمی و قلمی حلقوں تک مولانا آزاد کی زندگی کے بہت سے پہلو روشن ہوئے، منشی عبدالقیوم خاں صاحب اور مولانا آزاد کی مراسلت کے حوالے سے (جنھیں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے ’مکاتیب ابوالکلام آزاد‘ میں شائع کر دیا ہے) بہت سے ایسے گوشے اجاگر ہوئے ہیں جن سے محبانِ آزاد ناواقف تھے۔

’غبارِ خاطر‘ مولانا مرحوم کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے، اس کی اشاعت کے پیچھے کیا راز پوشیدہ تھا؟ اس کے متعلق معصوم صاحب نے نانا مرحوم کے ایک مضمون کے حوالہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ”مولانا آزاد نے ’غبار خاطر‘ جیسی شہرۂ آفاق تصنیف اس قرض کو اتارنے کے لیے شائع کرائی تھی جو اُن پر ترجمان القرآن کی اشاعت اور قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے دوران ہو گیا تھا“۔

اس کے ساتھ انھوں نے منشی عبدالقیوم خاں صاحب کے فرزند مولانا محمد عبدالملک جامعی کے مضمون ’ترجمان القرآن کے کاتب منشی عبدالقیوم‘ کے حوالہ سے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ”ترجمان القرآن کی پہلی جلد اور دوسری کے پہلے و دوسرے ایڈیشن، ان تینوں میں ابا کی مالی امداد کو بڑا دخل تھا۔“ آگے رقم طراز ہیں کہ ”ترجمان القرآن کو شائع کرنے کے لیے ابا کے پاس روپیہ نہیں تھا، پہلی بار ابا نے میرے ہم زلف محمد عمر خان سے قرضہ لیا، دوسری بار ایک عزیزہ سے دس ہزار کی رقم لی، اس طرح وہ ترجمان القرآن کے صرف کاتب نہیں ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔“

معصوم صاحب کا خاص کمال یہ ہے کہ وہ خاکہ نگاری ہو یا عام مضمون، جہاں جملوں کی بندش پر پوری دسترس رکھتے ہیں، وہیں ان کی تحریروں میں معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے، جوں جوں قاری ان کی تحریر پڑھتا ہے ’سم سم بابا‘ اپنے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے اور صرف اور صرف پیش نظر مضمون ہی نہیں بلکہ اس کا ’ما لہ و ما علیہ‘ پس منظر و پیش منظر سب کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے، اپنے طرز تحریر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس چند صفحاتی تعارفی تحریر میں معصوم صاحب نے جہاں نانا مرحوم کے حالاتِ زندگی کو اختصار کے ساتھ نذر قارئین کیا ہے وہیں ان کے اعزا، اقربا، رہائش وطن، کلکتہ و دہلی مہاجرت کے ضمن میں معلومات کے ڈھیر لگا دیے ہیں اور سب ایسے حوالوں کے ساتھ جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے ”تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔“

کتاب کا پہلا باب ’منشی عبدالقیوم خاں خطاط کے قلم سے‘ عنوان سے معنون ہے جس کا پہلا مضمون ’مولانا آزاد کی خدمت میں ڈیڑھ سال‘ کا جامہ پہنے ہوئے ہے، مضمون نگار (منشی صاحب مرحوم) نے اس میں مولانا آزاد کے ساتھ اپنے بیتے ایام (اکتوبر 1934 تا مارچ 1936) کے کچھ مشاہدات کو دل جمعی کے ساتھ پُرکشش انداز میں تحریر کیا ہے۔

’مولانا آزاد کا افلاس‘ سے معنون تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد ترجمان القرآن جلد ثانی کی تیاری کے وقت مقروض تھے، کاغذ خریدنے کے لیے روپیہ نہیں تھا، روزمرہ کے اخراجات قرض سے چل رہے تھے جس کی ادائگی ترجمان القرآن جلد دوم کو اکیس ہزار روپے میں فروخت کر کے کی گئی، غبارِ خاطر چھاپنے کی غرض بھی قرض کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا تھی وغیرہ وغیرہ جیسی معلومات سے پُر یہ باب منشی صاحب مرحوم کی ایک خوبصورت نظم ’عطفی کی بلی کا بچہ‘ پر ختم ہوتا ہے جس سے منشی صاحب مرحوم کی شعری صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا باب مولانا آزاد کے ان چودہ خطوط پر مختص ہے جو مولانا نے منشی عبدالقیوم خاں صاحب کے نام 25/ اپریل 1934 سے 23/ اگست 1946 کے درمیان تحریر کیے ہیں۔ یہ خطوط بیشتر تو اپنے ذاتی معاملات (یعنی کتابت) کے لیے منشی صاحب کو کلکتہ بلانے کی دعوت، ان سے ملنے کی خواہش، اپنے نجی پروگرام، منشی صاحب کی کلکتہ سے واپسی کے بعد ’مدینہ‘ اخبار سے وابستگی کے دنوں میں ترجمان القرآن کی اشاعت کی غرض سے بھیجے جانے والے کاغذ اور طباعت کے لیے کچھ ہدایات وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

ان خطوط میں سے دس خط مولانا نے کلکتہ سے ایک خط شملہ، ایک الہ آباد، ایک گل مرگ کشمیر اور ایک دہلی سے تحریر کیا ہے۔ کلکتہ کے خطوط کا دورانیہ پانچ سال سے زائد (25/ اپریل 1934ء تا 31/ مئی 1939) عرصہ پر مشتمل ہے۔ ان خطوط میں مولانا نے منشی صاحب کو ’محبی فی اللہ‘ سے مخاطب کیا ہے، پہلے تیسرے پانچویں خط کے شروع میں ’سلام‘ کا اہتمام کیا ہے، بعد کے خطوط میں سلام سے آغاز کرنے کے بجائے خط کے آخیر میں ’والسلام‘ تحریر کیا گیا ہے۔ آخری چار خطوط میں مولانا کا انداز تخاطب تبدیل ہو جاتا ہے، اب وہ ’محبی فی اللہ‘ کے بجائے صرف ’عزیزی‘ پر اکتفا کرتے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شروع میں مولانا کو منشی صاحب مرحوم سے کچھ تکلفات تھے جو بعد میں بے تکلفی میں تبدیل ہو گئے تھے اور وہ مولانا کے خصوصی متعلقین میں شامل ہو گئے تھے۔

تیسرا باب ’خراجِ عقیدت‘ پر مشتمل ہے جس میں بجا طور پر اولیت مولانا محمد عبدالملک جامعی کے مضمون ’میرے والد محترم‘ کو دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون کا ہر ہر لفظ مرحوم نے دل کی گہرائیوں سے تحریر کیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد منشی عبدالقیوم خاں صاحب کی زندگی کے حالات و کوائف سے کما حقہ واقفیت ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا شاہجہاں پوری نے ان دنوں جب وہ ’مکاتیب ابوالکلام آزاد‘ ترتیب دے رہے تھے، منشی عبدالقیوم خاں صاحب سے رابطہ کر کے خطوط حاصل کیے تھے۔ اگرچہ یہ تحریر صرف چند سطروں پر ہی محیط ہے البتہ اس کے ضمن میں منشی عبدالقیوم خاں صاحب کے وہ مختصر حالات ہیں جو انھوں نے اپنے بارے میں مولانا شاہ جہاں پوری کو بتائے ہیں۔ اس سے منشی صاحب کے ادبی و تحریری ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔

مالک رام صاحب نے اپنی تحریر میں منشی صاحب مرحوم کی خوش نویسی کی تعریف کرتے ہوئے عقیدت مندانِ آزاد کی اس غلط فہمی کو دور کیا ہے جو عام طور پر پائی جا رہی تھی کہ ”ترجمان القرآن کی تیسری جلد مکمل لکھی جا چکی تھی اور اس کی کتابت کا مرحلہ باقی تھا“ مالک رام صاحب نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ”جن دنوں ترجمان القرآن کی تیسری جلد لکھنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا، ان دنوں مولانا آزاد اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث اس طرف توجہ نہیں دے سکے جس کی وجہ سے یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا“۔

کل ملا کر یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ معصوم صاحب نے اپنے نانا مرحوم کا جس شیفتگی کے ساتھ تذکرہ تحریر کیا ہے اُس نے اس کتاب کے اندر پوشیدہ قیمتی مواد کے باعث علم و تحقیق کے متوالوں کے لیے ایک نیا باب روشن کیا ہے، اس کے لیے معصوم صاحب کی جتنی بھی ستائش کی جائے وہ کم ہے۔

خاکے

یادیں باتیں چہرے لوگ

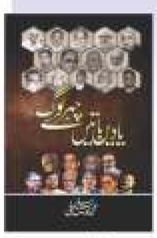

مصنف: محمد اویس سنبھلی

صفحات: 240، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: نعمانی کیئر فاؤنڈیشن، لکھنؤ

مبصر: جمیرا عالیہ، ندوہ کیمپس، ٹیگور مارگ، لکھنؤ، یوپی

محمد اویس سنبھلی کی تصنیف 'یادیں باتیں چہرے لوگ' ان کے تاثراتی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جو رواں برس منظر عام پر آیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے شخصی تاثرات، ذاتی مراسم اور یادوں کا حسین امتزاج ہے۔ اویس سنبھلی کا نام ادبی حلقوں میں کسی شناخت کا محتاج نہیں ہے۔ ہر چند کہ وہ خود منظر عام پر آنا پسند نہیں کرتے لیکن ان کی ادبی وصحافتی سرگرمیاں اور قلمی جولانیاں انھیں عصر حاضر کے ممتاز قلمکاروں میں شمار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کا تعلق ایک علمی خانوادے سے ہے جس کے اثرات ان کی فعال شخصیت اور ادبی تحریروں میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں کل 25 شخصیات پر مضامین شامل ہیں جن سے مصنف کے براہ راست ذاتی تعلقات رہے ہیں یا ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ مضامین محض ذاتی یادداشت نہیں بلکہ اس میں وہ تمام عناصر درجہ اتم موجود ہیں جو اردو ادب میں سوانحی ادب، شخصی خاکہ نگاری اور عہد کے دستاویز کے طور پر قدر پاتے ہیں۔ کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول: خراج عقیدت۔ باب دوم: چراغ روشن ہیں۔

باب 'خراج عقیدت' میں 15 مضامین شامل ہیں۔ ان خاکوں میں حفیظ نعمانی، پروفیسر شارب ردولوی، عرفان عباسی، منور رانا، مشرف عالم ذوقی، وقار رضوی اور رمن لال اگروال جیسی شخصیات کے ساتھ دیگر اہم ادبی شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ مصنف نے تحریروں کو 'وفیاتی تحریر' قرار دیا ہے کیونکہ یہ تمام مضامین ان شخصیات سے متعلق ہیں جو دنیا سے گزر چکی ہیں۔ اگرچہ یہ مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں جا بہ جا فنی وادبی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ان مضامین میں اویس سنبھلی نے ان بزرگان علم و ادب کی صحبتوں کے گہرے اثرات کو نہایت عقیدت و وارفتگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے محض اپنی یادوں کو صفحہ قرطاس میں محفوظ نہیں کیا بلکہ وہ سماجی وادبی پس منظر اور ماحول کو بھی محفوظ کر دیا ہے جو اب عنقا ہو رہا ہے۔

اویس سنبھلی نے اس کتاب میں اپنے ذاتی محسوسات کو سادگی و برجستگی کے ساتھ نہایت خلوص کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہ مضامین اس بات کے غماز ہیں کہ اویس سنبھلی نے صرف نامور اور مشہور شخصیات کو ہی منتخب نہیں کیا بلکہ انھوں نے ادبی پس منظر کے حامل ان افراد پر بھی مضامین لکھے ہیں جنھیں گردش دوراں نے تقریباً فراموش کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسی ادبی کاوش ہے جو قاری کو ماضی کی دلنشین یادوں اور حال کی تابندہ شخصیات سے بیک وقت روبرو کراتی ہے۔ 'یادیں باتیں چہرے لوگ' اس واسطے بھی اہم ہے کہ یہ صرف ایک فرد کی یادداشت یا تاثرات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ بیک وقت کئی ادوار کا احاطہ کرتی ہے جس میں ہم عہد رفتہ کے سیاسی، صحافتی وادبی ماحول کا تحریری مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

باب دوم 'چراغ روشن ہیں' میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے باحیات ادبی افراد کے نام معنون ہے۔ اس حصے میں ۱۰ مضامین شامل ہیں جن میں عصر حاضر کی متحرک ادبی شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مضامین دیانت داری اور غیر جانبداری کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ بقول مصنف، ''زندہ لوگوں پر لکھنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے مضامین میں معلومات اور معروضیت ضروری ہے۔'' اس باب میں شامل اہم شخصیات میں احمد ابراہیم علوی، حکیم وسیم احمد اعظمی، ڈاکٹر صبیحہ انور، ڈاکٹر کشور جہاں زیدی، ڈاکٹر عمیر منظر، معصوم مرادآبادی اور چند دیگر علمی وادبی نام شامل ہیں۔ یہ مضامین موجودہ ادبی منظرنامے کو بالخصوص لکھنؤ کے حوالے سے سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب کے مضامین کو مکمل طور پر خاکہ کے زمرے میں تو نہیں رکھا جاسکتا کیونکہ خاکے میں فرد کی خوبی کے ساتھ خامی، حسن کے ساتھ قبح کا بھی ذکر ہوتا ہے نیز کبھی کبھار خاکہ نگاری میں ہجو یا تنقیص کا پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جب کہ ان تحریروں میں مصنف نے ناقدانہ تندی سے گریز کرتے ہوئے شخصیات کے منفی پہلوؤں کو حتی الامکان نظر انداز کیا ہے اور معروضیت کی پاسداری کرتے ہوئے ان کی حیات وادبی خدمات کو جذباتی و توصیفی انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن ان تاثراتی مضامین میں خاکہ نگاری کے عناصر محسوس ضرور کیے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے ذاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ شخصیات سے متعلق کئی اہم ادبی انکشافات بھی کیے ہیں اور علمی سرگرمیوں کی تفاصیل بھی فراہم کی ہے۔ اس طرح یہ مضامین قارئین کے لیے براہ راست معلومات اور تحریک کا ایک ذریعہ بن گئے ہیں۔ کتاب میں اویس سنبھلی نے جن شخصیات کا بھی ذکر کیا ہے اس میں کسی بھی قسم کا تصنع یا مدح سرائی کا پہلو محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ خاکے ایک ایسے ذاتی تجربے ومشاہدے پر مبنی معلوم ہوتے ہیں جن کی بنیاد احترام، محبت، قلبی تعلق اور حق گوئی پر قائم کی گئی ہے۔

کتاب اپنے اسلوب میں راست اور دلنشین ہے ہر چند کی اویس سنبھلی انکساری وعاجزی سے دعوی کرتے ہیں کہ ان کے پاس الفاظ کا محدود ذخیرہ ہے لیکن مضامین کے مطالعے سے ان کی اپنی بات کی تردید ہوتی ہے۔ یہ کتاب صنفی اعتبار سے خاکہ، انشائیہ اور تاثراتی تنقید کی ایک حیرت انگیز مثال ہے نیز ادبی اعتبار سے بے حد بھرپور ہے۔ سہل اور دلچسپ انداز بیان نے ان مضامین کی دلکشی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ان مضامین کا مقصد صرف اور صرف قارئین کو متعلقہ شخصیات کی خدمات اور کارناموں سے بہرہ ور کرانا ہے اور اویس سنبھلی اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ مضامین مصنف کی ادبی صلاحیت کے ساتھ ان کے پختہ شعور کے بھی عکاس ہیں۔

'یادیں باتیں چہرے لوگ' کا انتساب عصر حاضر کے معروف نقاد جناب حقانی القاسمی کے نام ہے جو بقول مصنف اس کتاب کی اشاعت کا موجب بنے۔ یہ انتساب حقانی صاحب کی ادبی وتنقیدی خدمات کے اعتراف کے ساتھ مصنف کا اپنے اساتذہ اور سرپرستوں کے تئیں احترام کا ثبوت بھی ہے۔ یہ کتاب اہل ذوق کے لیے ایسا گنجینہ ہے جو اردو ادب کی موجودہ صورتحال کو سمجھنے میں ان کی معاون ثابت ہوگی نیز انھیں علم وادب کی پر بہار شخصیات سے واقف کرانے کے ساتھ حسین یادوں کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کا موقع بھی فراہم کرے گی۔

سائنس

ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب و ادیب

شاعر/مصنف: عبدالودود انصاری

صفحات: 244، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ساجد عبید، سی-1، چوتھی منزل

اولڈ جسولہ ولیج، نزد ایڈووکیٹ کمپاؤنڈ، نئی دہلی 25

یوں تو اردو زبان میں کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے، کم وبیش ہر موضوع پر ہمارے قلم کاروں نے کام کیا ہے اور ان کی کافی پذیرائی بھی ہوئی ہے لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ موجودہ دور کا انتہائی اہم ترین شعبہ سائنس وٹکنالوجی کو اردو ادب میں یا تو نظر انداز کیا گیا ہے یا پھر اس میں بخل سے کام لیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں عبدالودود انصاری کی کتاب: 'ہندوستان میں بچوں کا سائنسی ادب و ادیب' (آزادی کے بعد تا حال) کو عام مصنفین کی سوچ یا روایتی سوچ سے الگ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ادب میں سائنس وٹکنالوجی سے متعلق مصنف کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر یہ مصنف کی دوسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے: 'ہندوستانی خواتین کی اردو سائنسی خدمات' نامی کتاب منظر عام پر آ چکی ہے۔ مصنف نے کتاب کے آغاز میں 'اپنی باتیں' میں خود بھی اس تعلق سے اپنے درد کا اظہار کیا ہے۔ حقانی القاسمی کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ مقدار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو میں بچوں کے ادب کا وافر ذخیرہ موجود ہے بلکہ بچوں کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے... کمیت کے اعتبار سے ادب اطفال کی کمی نہیں، کیفیت کے اعتبار سے یقیناً کم ہے... معیار کے اعتبار سے بچوں کے ادب کی بھی ضرورت ہے۔ خاص طور پر سائنس، ٹکنالوجی اور ماحولیات کے ضمن میں بچوں کا ادب کم تخلیق کیا گیا ہے جبکہ انسانیت کا مستقبل سائنس سے وابستہ ہے اور اس پہلو پر بچوں کے ادیبوں کو زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مصنف نے حقانی القاسمی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو کے ساتھ بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی قسمت میں بچوں کے ادب یا بچوں کے سائنسی ادب کی وہ قدر و قیمت نہیں جتنی دوسری زبانوں میں ہے۔ مصنف کا یہ بھی شکوہ ہے کہ بچوں کے سائنسی ادب کے ساتھ المیہ یہ بھی ہے کہ نہ تو سائنسی ادب کی شہرت ہوتی ہے اور نہ خاطر خواہ عزت ہوتی ہے، نہ ہی پذیرائی ہوتی ہے، نہ ہی متعلقہ مصنف کو ریاستی یا قومی ایوارڈ سے سرفراز کیا جاتا ہے کیونکہ اردو کے امین، وارث، دعویدار اور محافظ اردو کا دمیوں کی اس طرف توجہ نہیں ہوتی، ان کی نظر میں شعرا، افسانہ نگار اور ناول نگار اہم ہوتے ہیں جبکہ سائنسی قلم کار اردو قلم کاروں کو صحیح زندگی گذارنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔

مصنف نے اس کالم میں مشہور سائنسی مصنف انیس الحسن صدیقی کے ایک مکتوب کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ آج کل اردو کی کتابوں کی بھرمار ہے لیکن ان کتابوں کو بچوں کو دستیاب کرانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ متعدد اسکولوں اور مدرسوں میں لائبریریاں نہیں ہیں اور ہیں تو وہاں اردو کی تازہ ترین کتابیں نہیں ہیں۔ کاش کہ سائنسی ادیبوں اور ادبی ادیبوں کی تازہ ترین کتابیں اسکولوں اور مدرسوں کی لائبریریوں میں دستیاب ہو جائیں۔ مصنف نے سائنسی فوائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سائنس کے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ آخر میں اپنی کتاب کے تعلق سے وہ اطلاع دیتے ہیں کہ کتاب میں جن سائنسی کتابوں کو شامل کیا گیا ہے وہ آٹھ سے لیکر سترہ سال کے بچے اور بچیوں کی معلومات میں اضافہ کریں گی۔ کتاب میں بعض باحیات مصنفین کے پتے، ای میل درج ہیں جن سے ان کتابوں کی تفصیلات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

سرسری طور پر اگر پوری کتاب کی بات کی جائے تو انتساب ڈاکٹر رفیع الدین ناصر (قومی اعزاز یافتہ معلم) صدر شعبہ نباتات، مولانا آزاد کالج، ڈاکٹر رفیق ذکریا کیمپس، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے نام ہے اور ایک صفحہ مصنف نے اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر منصور عالم (صدارتی انعام یافتہ) سابق صدر شعبہ فارسی، گوہاٹی یونیورسیٹی، آسام کے نام منسوب کیا ہے۔ کتاب میں: اپنی باتیں: کے بعد دوسرے نمبر پر تقریظ کی شکل میں حقانی القاسمی، ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور ڈاکٹر کیپٹن ایم ایم شیخ کے خیالات ہیں۔ بچوں کے سائنسی ادیب کے طور پر کرشن چندر، ظفر پیامی، پرکاش پنڈت، ناصر علی زیدی، محمد سراج انور، اطہر پرویز، اظہار اثر، ابن صفی، عادل اسیر دہلوی، ڈاکٹر محمد شمس الاسلام فاروقی، اندر جیت لال، محشر عابدی، پروفیسر اورلیس صدیقی، ڈاکٹر محمد خلیل، انیس الحسن صدیقی، ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، قیصر سرمست، عبدالودود انصاری، مولانا انصار احمد معروفی، ڈاکٹر احرار حسین، کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ، ودود الحق، ڈاکٹر محمد ابوالکلام، ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی، شاہد رشید، ایم اے کریمی، ایس ایس علی، عزیز احمد عرسی، جنید عبدالقیوم شیخ، ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، ڈاکٹر خورشید اقبال، عزیز احمد ہاشمی، محمد یعقوب خان، فہیم ادیب فاروقی، وکیل نجیب، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، سید اختر علی، پرفیسر اقبال محی الدین، ڈاکٹر عبدالمعز شمس، متین اچل پوری، طہٰ تبسم، ڈاکٹر اعظم شاہ خان، محمد سجاد عالم، ڈاکٹر انور ادیب، اسعد فیصل فاروقی، وسیم احمد فریدی، ڈاکٹر ایم اے قدیر، سلطان آزاد، وزارت حسین، ایم مبین، ایم اے یوسف انصاری، شیخ اقبال حسین آر، ڈاکٹر احسان اللہ احمد، بدیع الزماں اعظمی، محمد رفیق، امتیاز احمد انصاری اور ڈاکٹر سراج اظہر جیسے عظیم سائنسی ادیبوں کا تعارف نامہ ہے جو یقینی طور قارئین کی معلومات میں اضافہ کا ضامن ہے۔ ان میں متعدد سائنسی ادیبوں کی تصاویر جو یقیناً مشکل سے ہاتھ آئی ہوں گی، کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ تعارف نامہ کے بعد سائنس سے منسلک مضامین ہیں جو کافی معلوماتی ہیں۔ صفحہ 221 پر سائنس سے منسلک رسالہ: سائنس: کے پہلے شمارے کے پہلے پیج کی تصویر سے کتاب کی زینت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب نہ صرف طلبا بلکہ عام قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

طب

بچوں کی بیماریوں کا ہومیوپیتھک علاج

مصنف: ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی

صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، ایڈیشن اول: 2025

ناشر: ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی محلہ پرانی بستی، اعظم گڑھ 276404

مبصر: ڈاکٹر نخشب مسعود، 77/2، پلاٹ نمبر 9، بتول پارک، مالیگاؤں (مہاراشٹر)

کتاب اپنے مواد اور موضوع کے لحاظ سے زبردست ہے۔ علمیت، حکمت اور

معلومات کا کار آمد گنجینہ ہے۔ کتاب کے مشمولات کا پتہ کتاب کے سرورق سے ہی سے چل جاتا ہے کہ واقعی کتاب بڑا بچوں کے مختلف ادوار کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ خوش نما پر معنی سرورق کے بعد نظر فہرست پر پڑتی ہے۔ تو یہاں کل 482 عنوانات سے ہم چشم ہوتے ہیں۔

'ہومیوپیتھی کے دیدہ ور قلم کار: ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی' خطۂ اعظم گڑھ کے ماہر و حاذق کہنہ مشق ہومیوپیتھی ڈاکٹر ہیں۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ جن میں 'رئیس میٹریا میڈیکا آف ہومیوپیتھی' اور 'رئیس المعالجات ہومیوپیتھی'، 'فرسٹ ایڈ اور ہومیوپیتھی'، 'رئیس المعالجات، بایوکیمک علاج' اور 'مطالعات و معالجات رئیس' نہایت اہم مفید اور مشہور و مقبول تصانیف ہیں ان کتابوں میں سے بعض کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب کا اہم مقصد صحت مند خاندان، صحت مند معاشرہ اور صحت مند ملک کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کرنا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب میں کئی عنوانات بڑے ہی چونکانے والے ہیں جیسے:

"ماں اور بچے کا رشتہ، الفت یا نفرت پانی سے، انسان کی پہلی چیخ، حاملہ کا غم، بچوں کا چہرہ دیکھنے سے میازم کی پہچان، چہرہ شناس (چہرہ دیکھ کر علاج)، اوٹیزم اب نارمل بچے، اوٹسٹک بچوں کی حرکتیں اور ادویات، دماغی و ذہنی بیماریاں، بولنا دیر سے سیکھیں، مارنے پیٹنے کی خواہش، ڈر جانے سے تکالیف، سانولی رنگت کو نکھارنا، لامذہبیت، مسکولر ڈسٹرافی، لوگوں پر تھوکنے کی عادت، ماسٹربیشن (انگشت زنی، مشت زنی) ان میں کچھ ایسے بھی عنوانات ہیں جو ہمیں کسی دوسری کتاب میں کہیں نظر نہیں آتے۔ ہاں میڈیکل کی نصابی کتابوں میں ان موضوعات پر بھرپور مواد موجود ہے۔ جو ایک سادہ آدمی یا کم پڑھے لکھے آدمی کی پہنچ سے دور ہے۔ لیکن ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی نے ایسے عنوانات قائم کر کے ان بیماریوں کی ادویات کا ذکر اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ یہ اردو میں ایک طرح اضافہ ہے۔

پوری کتاب رہنمایانہ طریقے پر تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب میں موروثی امراض، وبائی امراض، الرجی، اور وائرس انفیکشن اور وبا پر بھرپور طریقے سے نہ صرف روشنی ڈالی گئی ہے۔ بلکہ ان کے اسباب و علل اور سدّ باب پر اور روک تھام کے لیے کن دواؤں کا استعمال کرنا ہوگا علامات کے ساتھ بتلایا ہے۔ ان علامات کو بھی صاف و شستہ اور عام فہم انداز میں بتایا ہے۔ مشکل یا ادق لفظیات کا قطعی استعمال نہیں کیا ہے۔

'بچوں کی بیماریوں کا ہومیوپیتھک علاج' ان کی ایک مکمل کتاب ہے جس میں قرار نطفہ سے لے کر حمل اور بچے کی پیدائش اور عنفوان شباب اور جوانی تک پہنچنے کے تمام مراحل میں درپیش عوارضات و امراض، جذبات و احساسات، محسوسات، سوچ و فکر کی دواؤں کا ذکر نہایت آسان زبان میں پیش کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے اور پختہ یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ایک عام کم پڑھا لکھا آدمی بھی پورا پورا استفادہ کر سکتا ہے اور اپنا اور اپنے خاندان کے بچوں کا بآسانی علاج بھی کر سکتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی فیض پہنچا سکتا ہے۔ ہومیوپیتھی ڈاکٹر بھی اس کتاب کے گہرے مطالعے کے بعد بچوں کے امراض کے ماہر (چائلڈ اسپیشلسٹ) بن جائیں گے ایسی قوی اُمید ہے۔

ترتیب

صفدر امام قادری: فکری و فنی زاویے

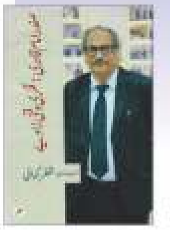

ترتیب و تدوین: ظفر کمالی

صفحات: 640، قیمت: 850 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: اقبال حسن آزاد، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر - 811201

صفدر امام قادری کی اب تک انچالیس کتابیں (درسی کتابوں کو چھوڑ کر) منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں تیرہ تصانیف تحقیق و تنقید، خاکے، شخصی تاثرات، تراجم اور ایک سفرنامہ (بنگلہ دیش کو میں نے دیکھا) پر مشتمل ہیں جبکہ ترتیب و تدوین کی چودہ، ہندی کی چھ، انگریزی کی ایک اور اردو، ہندی اور انگریزی کی مشترکہ طور پر پانچ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ چھ کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ 'صلاح الدین پرویز کا آئیڈینٹیٹی کارڈ' (تحقیق و تنقید) ان کی پہلی کتاب ہے۔ 'آئیڈنٹٹی کارڈ' دراصل پرویز صلاح الدین کا وہ ناول تھا جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ صفدر امام قادری کی یہ کتاب دراصل ایک احتجاج ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی باتیں دوٹوک انداز میں کہی ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق و تنقید کے ضمن میں 'اردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ'، 'ذوق مطالعہ'، 'محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور اور دیگر مضامین'، 'مشاہدات'، 'عہد سرسید کے ادبی و علمی نقوش' شامل ہیں۔ جبکہ 'جانے پہچانے لوگ' اور 'میرے والدین' خاکوں اور شخصی تاثرات پر مبنی تصانیف ہیں۔ علاوہ ازیں 'سید محمد محسن کا مونوگراف'، 'کالموں کا انتخاب'، 'عرض داشت'، 'بنگلا دیش کو میں نے دیکھا' (سفرنامہ) اور عربی ادب کے تراجم 'روشن ہے ریگ زار' ان کے ادبی کارنامے ہیں۔

تحقیق و تنقید کے علاوہ انھوں نے ترتیب و تدوین کے میدان میں بھی اشہب قلم دوڑائے ہیں۔ اس سلسلے میں 'شناخت' (چمپارن میں اردو زبان و ادب کا ارتقا)، 'سماجیاتی تقاضوں کا پس منظر اور اردو کی عملی ترجیحات' (تنقیدی و توضیحی رپورٹ)، 'ساحل سے دور' (شمشاد سحر کا شعری مجموعہ)، 'سر شاخ طلب' (سلطان اختر کی کلیات)، 'پس عرض ہنر' (سلطان اختر کی منتخب غزلیں)، 'دنیا عجب بازار ہے' (مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا انتخاب)، 'مجتبیٰ حسین ...... فن شخصیت اور کارنامے' (منتخب مقالے)، 'دھوپ ایسی تو نہیں تھی پہلے' (راشد انور راشد کا منتخب کلام)، 'اب وہاں رات ہو گئی ہوگی' (باصر سلطان کاظمی کی کلیات)، 'یہ زمیں کچھ کم ہے' (شہریار کا منتخب کلام)، 'صحافت دو صدی کا احتساب' (اردو صحافت کی تاریخ)، 'سرپٹ گھوڑا' (شوکت حیات کا ناولٹ تفصیلی مقدمے کے ساتھ)، 'مفکر اسلام حضرت مولانا سید ولی رحمانی کی سیاسی بصیرت' (منتخب تنقیدی و سیاسی مقالے) اور 'ظفر کمالی...... شخصیت اور فنی جہتیں' (منتخب تنقیدی و تحقیقی مقالے) جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔

پروفیسر صفدر امام قادری کو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے جس کا ثبوت 'کرپوری ٹھاکر کا اسرتی اَنک'، 'گنگا کو اُورل بہنے دو'، 'سماجیاتی آگرہوں کی پرشٹ بھومی' اور 'اردو بھاشا کی ویاوہارک پراتھمکتائیں'، 'بھارتیہ جن تنتر میں حاشیے پر دلت مسلمان'، 'سمے کا سروکار' (اَمل پرکاش کی رچنائیں) اور 'اس چہرے کے نام' (طارق متین کی غزلیں) جیسی کتابیں ہیں۔

انگریزی میں ایک کتاب" Margialization of Dalit Muslims in

"Indian Democracy" منظر عام پر آئی ہے۔

'صفدر امام قادری: فکری وفنی زاویے' کے فلیپ پر بھی ظفر کمالی کی دس رباعیاں شامل ہیں۔اس کتاب کی ترتیب میں سب سے پہلے ظفر کمالی کا 'عرض مرتب' ہے۔ صفدر امام قادری کا تعارف کرواتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''وہاب اشرفی اور لطف الرحمٰن کے انتقال کے بعد بہار میں جن نقادوں نے اپنی پہچان بنائی، ان میں صفدر امام قادری کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ 1991 میں صلاح الدین پرویز پر اپنی کتاب کے ابواب کی اشاعت سے وہ اپنے تنقیدی و احتسابی مزاج کا ثبوت پیش کر چکے تھے اور 1994 میں جب یہ تمام مضامین کتابی شکل میں سامنے آئے، اس سے ان کی تنقیدی شناخت مضبوط ہوئی۔اس کے بعد ان کی تحریریں گاہے بگاہے منظر عام پر آتی رہیں لیکن 2011 میں جب خورشید اکبر نے پٹنہ سے رسالہ 'آمد' کا اجرا کیا تو اس میں صفدر امام قادری نے تواتر کے ساتھ تنقیدی تبصرے لکھنے شروع کیے۔ پہلے ہی شمارے میں ان کی تین تحریریں شائع ہوئیں۔ان میں ایک مضمون 'ہندوستان میں ڈرامے کی عوامی روایت اور نوٹنکی کی زبان' تھا اور دو تبصرے ''فرہنگ لفظیات غالب از سلیم شہزاد اور ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر اور دوسرے مضامین (پروفیسر محمد مجیب کے انگریزی مقالات کا اردو ترجمہ از محمد ذاکر) کے عنوان سے شامل تھے۔رسالہ 'آمد' کے تبصروں سے سنجیدہ ادبی حلقہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ان تفصیلی تبصروں میں جو تجزیاتی طریقہ' کار اختیار کیا گیا اور بڑی جرأت مندی کے ساتھ بے لاگ انداز میں اپنی باتیں کہی گئیں، ان کی دھمک دور تک محسوس کی گئی۔ یہاں تک کہ 2013 میں ان کے تبصروں کا مجموعہ 'نئی پرانی کتابیں' کے عنوان سے شائع ہوا تو اس پر اپنی رائے دیتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے بڑے مزے کی بات لکھی کہ 'کچھ لکھنے والے یہ ہرگز نہ چاہتے ہوں گے کہ ان کی کتاب اتنی غیر جانب داری اور توجہ کے ساتھ پڑھی جائے۔' شمیم حنفی کی رائے سے صفدر کی تنقیدی جرأت مندی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔'' (صفدر امام قادری: فکری وفنی زاویے، ص14-13)

اکیس صفحات پر مشتمل اس بسیط مقدمے میں کتاب میں شامل ہر مضمون پر روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی دقت نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کتاب میں سب سے پہلا مضمون غضنفر کا بعنوان 'صفدر امام قادری: یہی اک شہر میں ایسا بچا تھا' شامل ہے۔اس مضمون میں بھی انھوں نے اپنے مشہور انشائی انداز میں صفدر کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ 'صلاح الدین کا آئیڈنٹٹی کارڈ' پر بالترتیب یوسف ناظم، فاروق احمد صدیقی، عطا عابدی اور نسیم احمد نسیم کے تبصرے شامل ہیں۔

'اردو زبان وادب کی مختصر تاریخ' پر محمد منصور عالم اور 'سید محمد محسن' (مونوگراف) پر علینہ علی ملک کے تبصرے ہیں۔ 'نئی پرانی کتابیں' پر گیارہ تبصرے ہیں۔ان تبصرہ نگاروں میں ریاض الرحمٰن شروانی، سید محمد عقیل، پیغام آفاقی، اظہار خضر، مشتاق احمد، سلمان عبدالصمد، عبدالوہاب قاسمی، الفیہ نوری، آصف ابرار، افشاں بانو، عرش منیر اور محمد مرجان علی کے نام شامل ہیں۔

'ذوق مطالعہ' پر محمد مختار وفا، محمد ولی اللہ قادری اور اشتیاق احمد بھاگلپوری کے تبصرے پیش کیے گئے ہیں۔ 'محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور اور دیگر مضامین' نہایت سنجیدہ موضوع پر مبنی کتاب ہے۔اس پر اپنے نوک قلم کو جنبش دینے والے شفیع جاوید، علی احمد فاطمی اور مشتاق احمد جیسے سینیئرس کے ساتھ محمد ولی اللہ قادری اور افشاں بانو بھی شامل ہیں۔ 'مشاہدات' پر صرف ایک تبصرہ عبدالوہاب قاسمی کا ہے۔

'عرض داشت' پر تبصرہ کرنے والوں میں شفیع جاوید، شوکت حیات، سید افروز اشرفی، صابر رضا مصباحی، محمد حسین، مبارک حسین مصباحی، محمد مرشد اور واحد نظیر شامل ہیں۔

'جانے پہچانے لوگ' صفدر امام قادری کی اہم تصنیف ہے۔اس کتاب میں پندرہ مرحومین کے شخصی خاکوں کے علاوہ 'تعارف' کے طور پر پروفیسر انیس الرحمٰن، غضنفر، جاوید دانش، ڈاکٹر جمال اویسی، سلمان عبدالصمد اور ڈاکٹر کلیم الرحمٰن کاکوی کی تحریریں شامل ہیں۔ 'جانے پہچانے لوگ' پر تبصرہ کرنے والوں میں انیس الرحمٰن، غضنفر، جمال اویسی، اقبال حسن آزاد، محسن خان، خالد عبادی، امام اعظم، قسیم اختر، سلمان عبدالصمد، ابراہیم افسر، عابدہ پروین اور نیلوفر یاسمین شامل ہیں۔

'بنگلا دیش کو میں نے دیکھا' صفدر کا سفرنامہ' بنگلا دیش ہے۔اس کتاب پر درج ذیل خواتین وحضرات نے تبصرے رقم کیے ہیں: جاوید دانش، علی احمد فاطمی، محمد ذاکر حسین، شبانہ جاوید، افضال عاقل، محمد طیب نعمانی، شبنم پروین، شاہد حبیب اور محمد عدنان عالم۔

'روشن ہے ریگ زار' (ثناء اللہ خاں دوگھروی) اور 'یہ زمیں کچھ کم ہے' (شہزاد انجم برہانی) پر ایک ایک تبصرے شامل کتاب ہیں۔

'میرے والدین' پر مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی اور افشاں بانو کے تبصرے شامل اشاعت ہیں۔

'صحافت: دو صدی کا احتساب' ایک اہم موضوع پر تحریر کردہ کتاب ہے۔اس موضوع پر کئی سیمینار بھی منعقد کیے گئے تھے۔صفدر امام قادری نے اس پر ایک مکمل کتاب پیش کی ہے۔اس کتاب پر تسلیم عارف اور محمد ولی اللہ قادری نے تبصرے کیے ہیں۔

شوکت حیات ایک اہم ادیب تھے۔انھوں نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ کچھ تنقیدی شذرات بھی تحریر کیے اور ایک ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' بھی لکھا لیکن ان کی شناخت ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی قائم ہوئی۔شوکت حیات نے اپنے کئی مشہور افسانوں کو یکجا کر کے ایک ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' ترتیب دیا اور معنوی ربط قائم کرنے کے لیے درمیان میں کچھ اضافے کیے ہیں۔ یہ ناولٹ پہلے پہل شب خون میں شائع ہوا تھا۔صفدر امام قادری نے ایک بسیط مقدمے کے ساتھ اس ناولٹ کو شائع کروایا ہے۔ یہ صفدر کا ایک اہم کارنامہ ہے۔اس کتاب پر ولی اللہ قادری نے تبصرہ فرمایا ہے۔

صفدر امام قادری نے ظفر کمالی پر ایک مستقل کتاب 'ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں' بھی تصنیف فرمائی ہے۔اس کتاب پر اے۔ کے۔ علوی نے تبصرہ کیا ہے۔

'کچھ اور مضامین' اس کتاب کا آخری باب ہے جس میں صفدر امام قادری کی نظموں پر تبصرے کے علاوہ صفدر بحیثیت نقاد اور جدید سماج کی تشکیل میں صفدر کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔اس باب میں غزال ضیغم، شہاب ظفر اعظمی، مقصود دانش، ابرار احمد اجراوی، محمد نور نبی انصاری اور محمد عنایت اللہ کی تحریریں شامل ہیں۔

زندگی کا بازار

ریاض توحیدی، ترتیب وپیش کش: انور مرزا

صفحات: 220، قیمت: 350 روپے،

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: نسترن احسن فتیحی، علی گڑھ

ریاض توحیدی کے افسانوی مجموعہ 'زندگی کا بازار' کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

ہمیں ان کی علامتی حس، معاشرتی شعور، اور انسان کی داخلی وخارجی کشمکش کے گہرے ادراک تک لے جاتا ہے۔ اس مجموعے کو انور مرزا نے مرتب کیا ہے، جو بذاتِ خود اردو افسانوی دنیا کا ایک معتبر نام ہیں، اور ان کی مرتب کردہ پیش کش میں ریاض توحیدی کی فکری جہات، اسلوبی تجربات، اور بیانوی ساخت کی گہرائی خاص طور پر نمایاں ہوتی ہے۔

اس افسانوی مجموعے 'زندگی کا بازار' میں شامل 'کالے پیڑوں کا جنگل' جیسے افسانے، علامتی افسانہ نگاری کی روایت کو تازہ دم کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ افسانے ہمیں ریاض توحیدی کی تحریر میں گہری علامتی اور تمثیلی فضا کی جھلک دکھاتے ہیں۔ یہ افسانے صرف ایک خیالی بیانیہ نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی جبر کی منظرکشی ہے۔ ریاض توحیدی نے ان افسانوں کے ذریعے معاشرے میں رائج خوف، غلامی، اور ضمیر فروشی کو علامتی زبان میں بیان کیا۔ ان کے زیادہ تر افسانے شعور کی بیداری، اجتماعی ضمیر کی خلش، اور تاریخی یادداشت کو موضوع بناتے ہیں۔ 'زندگی کا بازار' کے دیگر افسانے بھی اسی طرح انسانی تذلیل، منافقت، جھوٹی اقدار، اور طاقت کے غیر انسانی استعمال پر تنقید کرتے ہیں۔ ریاض توحیدی کے افسانوں کی کردار نگاری میں علامتی قوت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ رمضان چچا، نورانی بزرگ، اور بستی کے سہمے ہوئے لوگ محض افسانوی کردار نہیں، بلکہ تاریخ کے دھارے میں بہتے ہوئے انسانوں کی علامت ہیں۔ توحیدی کے اکثر افسانوں میں کردار اپنے مخصوص حالات میں انسانی مجبوریوں اور مزاحمت دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ریاض توحیدی کے افسانوں میں زبان و بیان کا جمالیاتی پہلو واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانوں کی زبان دلکش، شعری، اور بصری (Visual) ہے۔ آتش چنار، شب خون، جرم ضعیفی، چنگاریاں اور 'راکھ' جیسے الفاظ نہ صرف صوتی حسن رکھتے ہیں بلکہ گہرے معنوی ابعاد بھی پیدا کرتے ہیں۔ مجموعہ میں جگہ جگہ پر صوفیانہ، انقلابی، اور جمالیاتی اسلوب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

انور مرزا نے 'زندگی کا بازار' کو جس اہتمام سے مرتب کیا ہے، اس میں درج ذیل پہلو اہم ہیں۔ اس انتخاب میں تنقیدی شعور نمایاں ہے۔ انھوں نے ریاض توحیدی کے ایسے افسانے منتخب کیے ہیں جو زمانہ شناس، تاریخ آگاہ، اور فکری سطح پر بیدار قاری کے لیے معنی خیز ہیں۔ یہ افسانے وقت کی معنویت سے بندھے ہیں اور قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک تسلسل، فکری ہم آہنگی، اور بیانیاتی ربط پایا جاتا ہے، جس سے قاری معاشرتی حقیقت، انسانی بحران اور فرد کی مزاحمت کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اگر انور مرزا نے کسی مقدمہ یا نوٹ کے ذریعے مجموعہ کا تعارف نہیں کرایا ہے (جو اکثر مرتبین کرتے ہیں)، جس کی وجہ سے ریاض توحیدی کی فکری جہات، اسلوبی تجربات، اور اردو افسانے کی روایتی و جدید جہات کو ربط کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکا ہے۔ بہر کیف پروفیسر قدوس جاوید کے ایک مضمون 'ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری' سے اس کی بھرپائی ہو جاتی ہے۔

ریاض توحیدی کا افسانہ اور ان کا مجموعہ 'زندگی کا بازار' ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آج کے انسان کا چہرہ — خوفزدہ، ساکت، مگر اندر ہی اندر سوالات سے لبریز — صاف نظر آتا ہے۔ کالے پیڑوں کا جنگل ایک مرکزی علامت بن کر اس مجموعہ کی روح اور مزاحمتی بیانیہ کا مظہر ہے۔

انور مرزا نے اس مجموعے کی ترتیب کے ذریعے توحیدی کے افسانوی جہان کو نہ صرف پیش کرنے بلکہ سمجھنے میں بھی مدد دی ہے، اور یہی ایک اچھے مرتب کی پہچان ہے۔

'کالے پیڑوں کا جنگل' محض ایک بیانیہ نہیں بلکہ ایک علامتی (Allegorical) اور استعاراتی (Metaphorical) تحریر ہے، جو اسلوبیاتی سطح پر بہت سی معنوی پرتیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں علامتی اور استعاراتی بیانیہ (Metaphor and Symbolism) واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں اندھیری رات کا خوف، جاہلیت اور غلامی کی حالت کی نمائندگی کرتی ہے۔ رمضان چچا عام انسان کی نمائندگی کرتے ہیں جو ظلم کے خلاف معمولی سی آواز بلند کرتا ہے اور راکھ کر دیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ریاض توحیدی نے تجریدی حقیقت کو مجسم اور بصری انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے بیانیہ میں قصہ گوئی اور تمثیل کا امتزاج واضح ہے، جس میں فینٹسی اور حقیقت کی سرحدیں دھندلا جاتی ہیں۔ اس افسانے کے اسلوب میں اندیشہ، سسپنس، اور جذباتی شدت ہے جو قاری کو ابتدا سے آخر تک گرفت میں رکھتا ہے۔ اس افسانے کے الفاظ کے چناؤ میں صوتی ہم آہنگی (Alliteration) اور تکرار پائی جاتی ہے: 'کالے پیڑوں کی آدمی خور شاخیں' — 'ک' اور 'ش' کی آوازیں خوف اور دہشت کو بڑھاتی ہیں۔ 'پو پھٹنے کے انتظار میں تڑپتی رہی' — 'پ' کی تکرار میں بے چینی اور بے بسی نمایاں ہے۔ افسانے میں امیجری اور بصری تشکیل نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں شدید بصری امیجری استعمال کی گئی ہے: 'آگ کے شعلے'، 'اندھیرے کا سایہ'، 'شب خون'، 'آتش چنار' — سب تصویری تشبیہیں ہیں جو قاری کے ذہن میں مناظر کو زندگی بخشتے ہیں۔ بچوں کا رونا، ماں کا آنچل، رمضان چچا کی لالٹین — جزئیات نگاری (Detailing) تحریر کو زندہ اور متحرک بناتی ہے۔

لسانی تضاد (Linguistic Contrast):

اس افسانے میں زندگی اور موت، روشنی اور تاریکی، امید اور ناامیدی کے درمیان متضاد تصویریں ہیں۔ 'زندہ انسانوں کی چہکتی بستی' اور 'شہرِ خموشاں' — تضاد کے ذریعے حالات کی سنگینی بڑھائی گئی ہے۔ رمضان چچا، تاجہ بیگم، اور نورانی بزرگ جیسے کردار محض افراد نہیں بلکہ اجتماعی نفسیات اور تاریخ کے نمائندہ کردار ہیں۔ بزرگ کا مکالمہ خطیبانہ اور ماضی پر فخر کا اظہار ہے، جس کے ذریعے تاریخی شعور کو جگایا گیا ہے۔ جملوں کی ساخت میں جمالیاتی تناؤ (Tension aesthetic) موجود ہے۔ مثال کے طور پر 'یہ مصیبت تمہاری جرم ضعیفی کی سزا ہے' — فکری جھٹکا پیدا کرتا ہے۔ یا افسانے کا یہ جملہ 'اپنی راکھ میں چنگاریاں تلاش کرو' — حوصلہ افزائی اور بیداری کا استعارہ بن جاتا ہے۔

اس افسانوی مجموعہ میں انور مرزا نے واقعی ایسے کئی افسانے شامل کیے ہیں جن کے عنوانات میں 'کالا' لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے، جیسے:

- کالے پیڑوں کا جنگل
- کالی دھند اور سفید کبوتر
- کالے دیوؤں کا سایہ
- کالا چوہا

یہ تمام افسانے ایک طرح سے 'کالے' کے مفہوم کو علامتی، تہذیبی، نفسیاتی، اور سماجی سطحوں پر برتتے ہیں۔ ان میں 'کالا' صرف رنگ نہیں بلکہ مزاحمت، خوف، جبر، غم،

استحصال، اور بغاوت کی ایک معنوی تہہ میں اترتا ہے۔ 'کالا' بطور استعارہ: ایک علامتی مطالعہ ہے۔ یہ افسانے خوف، سناٹے، اور خاموش جبر کی علامت ہیں۔ اور سماج کے ان بے حس عناصر کو ظاہر کرتے ہیں جو سچ بولنے والوں کو نگل لیتے ہیں۔ یہاں 'کالا' ظلم کے سائے، قید فکر، اور سراسیمگی کا نشان ہے۔ ان افسانوں میں 'کالا' محض ایک تاریخی جغرافیائی اصطلاح نہیں، بلکہ تنہائی، سزا، اور بے بسی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ افسانہ ماضی کی یادوں اور جلاوطنی کی تلخ حقیقت کو علامتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ایک ایسی دیوار جو رکاوٹ، خاموشی، اور فکری قید کی نمائندہ ہے۔ 'کالی دیوار' کا استعارہ سماج میں کھڑی کی گئی ان رکاوٹوں کا اشارہ ہے جو نئے خیال، سچائی، اور مزاحمت کو دبانا چاہتی ہیں۔

انور مرزا کی مرتب کردہ بصیرت:

''انور مرزا نے ان تمام افسانوں کو ایک فکری سلسلے کے طور پر پیش کیا ہے، جس میں 'کالے' کے استعارے کے ذریعے قاری کو سماجی اندھیرے کی پرتیں کھولنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ افسانے بظاہر الگ ہیں مگر ایک موضوعاتی وحدت رکھتے ہیں: کالا صرف ظلم نہیں، سچ کا عکس بھی ہے۔ روشنی کی تلاش اسی سیاہی سے جنم لیتی ہے۔''

ریاض توحیدی کے 'کالے' افسانے اردو افسانوی ادب میں ایک نئے استعارہ جاتی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں، جس میں سماجی جبر، سیاسی بے حسی، اور فکری تنہائی کو 'کالے' کے پردے میں دکھایا گیا ہے۔ انور مرزا کی مرتب کردہ پیش کش نے اس معنوی کینوس کو بھرپور انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

ضیائے حنا

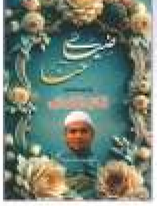

مرتب وناشر: ڈاکٹر عبدالودود قاسمی

صفحات: 464، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ایم نصر اللہ نصر، شالیمار اپارٹمنٹ، A-3، ستیم بوس روڈ بھٹکلہ، ہاوڑہ۔ 711109 (مغربی بنگال)

سہرا وہ تہنیتی اور مناکحتی نظم ہے جس میں حمدیہ و نعتیہ اشعار کے ساتھ سہرے کے برگ وگل کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ پھر نوشہ اور عروسہ کی صفات اور حسن بے مثال کا تذکرہ کیا جاتا ہے، والدین کی عظمت اور ان کے مرتبے کو بیان کیا جاتا ہے۔ احباب ومتعلقین کی تعریف کی جاتی ہے۔ ان کی خوشی وشادمانی کا ذکر ہوتا ہے۔ بہتر زندگی کی دعائیں دی جاتی ہیں۔ غم وآلام سے محفوظ رہنے کی رب سے التجا کی جاتی ہے۔ گویا یہ وہ متبرک گھڑی ہوتی ہے جس کی سرشاری اور شادمانی کے چرچے خوب ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ سہرے کے موجد اور اختراع گزار امیر خسرو ہیں لیکن دیگر شعرا نے بھی اچھے اور معیاری سہرے لکھے ہیں نیز آج بھی لکھے جا رہے ہیں یہ کتاب اسی روایت کو زندہ وجاوید رکھنے کی بڑی کوشش ہے۔

'ضیائے حنا' خصوصی طور پر ہندوستان اور بیرون ہند کے شعرا سے لکھوائے گئے، سہروں، تہنیتی نظموں، گلہائے عقیدت اور رخصتی ناموں کا ایک بہترین گلدستہ ہے نیز اپنی نوعیت کی منفرد کتاب بھی ہے۔ دراصل یہ کتاب ڈاکٹر عبدالودود قاسمی (صدر شعبۂ اردو کنور سنگھ کالج، لہریا سرائے، دربھنگہ (بہار) کے فرزند دلبند و پسر نیک اختر عزیزی حافظ محمد ثاقب ضیاء سلمہٗ کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر منظر عام پر آئی ہے۔ جب موصوف نے اپنے دوست احباب اور دیگر شعرا سے سہرا لکھنے کی فرمائش کی تو ڈھیر سارے سہرے اور تہنیتی تخلیقات جمع ہو گئیں۔ پھر ان کا ارادہ یہ ہوا کہ کیوں نہ سہروں کا ایک مجموعہ ہی شائع کر دیا جائے۔ اس غرض سے اس کا ایک اعلان کیا گیا کہ اس تعلق سے مزید سہرے لکھے جائیں۔ جس کی تعمیل میں بے شمار شعرا نے اپنے سہرے، رخصتی اور تہنیتی منظومات ودود قاسمی کی خدمت عالیہ کے سپرد کر دیے۔ اس طرح یہ کتاب عالم وجود میں آئی۔ کل ملا کر اس کے دس ابواب ہیں جس میں 176 نئے اور تازہ سہرے، گیارہ عدد سہرے بر زمین غالب، پانچ توشیحی نظمیں، دو غیر منقوط سہرے، 6 عدد مزاحیہ، دس خواتین کے سہرے، تین شعرا کے رباعیاتی سہرے، بیشمار قطعات و ماہیے، چودہ رخصتی اور کئی شعرا وادبا کے کلمات تبرکات و یادگار تصاویر شامل ہیں۔ کل ملا کر 252 تخلیقات بہ رنگِ سہرا اور تہنیتی نظم زینتِ قرطاس ہیں۔

سہرا کوئی نئی صنف نہیں ہے اور نہ یہ کتاب اپنی خصوصیات کی پہلی کتاب ہے۔ سہروں کے بیشتر مجموعے شائع ہوتے رہے ہیں۔ حال ہی میں مرحوم ڈاکٹر امام اعظم کی بھی ایسی ہی کتاب منظر عام پر آ چکی ہے جو کافی ضخیم ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب کی اہمیت اور انفرادیت اپنی جگہ محفوظ ہے۔ اس لیے کہ اس میں مزید نئے شعرا کی شمولیت ہوئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب میں شامل شعرا کا مرکز نگاہ عزیزی حافظ محمد ثاقب ضیا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کتاب کو فوقیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اکابرین شعروادب کیا فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

- ''سہرا نگاری کا فن ہماری تہذیبی روایت کا ایک مضبوط حصہ ہے۔ 'ضیائے حنا' میں رباعیات، قطعات، ماہیے، مزاحیہ سہروں اور توشیحی نظموں کے علاوہ قطعۂ تاریخ کے مطالعے کا موقع میسر ہوگا۔ (پروفیسر علیم اللہ حالی پٹنہ۔ فلیپ)
- ''ڈاکٹر ودود قاسمی کی مرتب کردہ 'ضیائے حنا' کے مشمولات ومحتویات دیکھ کر ایسا لگا کہ جیسے بہت قیمتی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو اور وہ دروازے بھی کھلتے جا رہے ہوں جن پر ہم دستکیں دینا بھول گئے ہیں۔ دس ابواب پر محیط 'ضیائے حنا' اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو تہنیتی شاعری کا نہ صرف ایک عمدہ انتخاب ہے بلکہ تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بھی ہے۔'' (حقانی القاسمی۔ بیک کور)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات کی جا سکتی ہے کہ قاسمی صاحب نے ایک غیر معمولی کام انجام دیا ہے۔ نہ صرف اس کے توسط سے اردو شعروادب کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے بلکہ لاکھ کے قریب اپنی خون پسینے کی کمائی بھی صرف کی ہے۔ اس حوصلے کی داد نہ دینا انصاف نہیں ہوگا۔ فرمائشی سہرے تو شعرا جیسے تیسے لکھ لیتے ہیں لیکن ایسے سہرے جن کی ادبی حیثیت بھی قائم ہو جائے کم لکھے جاتے ہیں۔ غالب اور ذوق میں اسی تعلق سے معرکہ آرائی بھی ہوئی تھی کہ سہرا کیسے لکھا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں — دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

(غالب)

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو — دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

(ذوق)

سہرے کے تعلق سے اس کتاب میں ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں

سہرے کی روایت اور اس کی تاریخ بھی درج ہے۔ سہرا نویسی کے اصول وضوابط اور اسلوب بھی عکس ریز ہیں۔ سہرا نگاری اور سہرے پر تحقیق کرنے والے اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس میں معروف و معتبر شعرا کے سہرے بھی شامل ہیں جن کی ادبی حیثیت مسلم ہے اور جو مشعل راہ کہے جا سکتے ہیں۔

فکشن

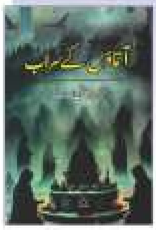

آتماؤں کے سراب

مصنف: راجیو پرکاش ساحر

صفحات: 239، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سہیل کاکوروی، سٹی ہوٹل، بی این روڈ، لال باغ، لکھنؤ، یوپی

راجیو پرکاش ساحر بساط ہوائے اردو زبان پر تازہ واردانِ میں ہیں اور اردو نثر نگاری کے ساتھ بحر افسانہ کے شناور ہوتے نظر آ رہے ہیں اور اب افسانوں کے موضوعات ان کے ذہن میں ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں جس کے باعث رسائل کے قاری بتدریج ان سے متعارف ہوتے چلے جا رہے ہیں ان کو اپنے افسانوں پر مثبت ردعمل ملتا رہتا ہے اور وہ ان کا محرک بن گیا اور حال میں ہی ان کا ناول آتماؤں کے سراب منظر عام پر آ گیا۔ حیرت و استعجاب کے ساتھ عنوان ہی سے قرأت کی راہ کھلی ہے۔

پتہ چلا کہ ناول جنگل اور پہاڑ کی فضا میں سانس لے رہا ہے اور بہت مختصر تمہید کے بعد نقوی صاحب ابھر آتے ہیں جو نہ صرف محکمہ جنگلات کے بڑے افسر ہیں بلکہ اس ماحول میں رہ کر انھیں جنگل سے قلبی وابستگی پیدا ہو گئی ہے قلبی وابستگی کا ارتقا عشق کی منزلوں تک پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنے مرکز نظر کی دید سے شاداں و فرحاں ہوتا ہے اور اس کی محافظت کی ہر طور سعی کرنے میں گریز نہیں کرتا ہے یہ بات راجیو نے ان کا کردار تشکیل کرنے میں خاص طور پر واضح کی۔ ہے کلیوں پر پڑے شبنم کے قطروں کو بغور دیکھنا اور یہاں نقوی صاحب کی کیفیت ہے جو راجیو نے تصور کر لی ہے۔

آہ اسی منظر کی تلاش تھی نقوی صاحب کو جو ذہن نے تو قید کر لیا تھا لیکن ذہن میں بم اکثر کچھ دھندلا جاتا ہے۔ نقوی صاحب نے اس کی عکس بندی کر لی ہے اور یہ ثبوت ہے مناظر قدرت سے ان کے والہانہ جذبہ دل کا نقوی صاحب کا بحیثیت ایک سرکاری افسر ہونے کے ان کے قانون کے محافظ ہونے کی حیثیت سے ان کی بے مثال ہمت کا بیان وہاں ہوتا ہے جب ایک سادھو ایک ہاتھی کو غیر قانونی طور پر قید کیے ہے اور دھرم کو درمیان میں لا کر اپنے عمل کو جائز ٹھہرا رہا ہے اس کے اس شدید ردعمل سے قانون کے محافظ بھی ڈرے ہوئے ہیں لیکن نقوی صاحب اپنے فرض کی ادائیگی میں نڈر ہیں۔

فرقہ وارانہ ٹکراؤ کی صورت ابھری لیکن ایک سلجھی ہوئی طبیعت کا نوجوان آ کر نقوی صاحب کی تقویت کا باعث ہوا اور وہ معصوم جانور کو قید سے رہائی دلانے میں کامیاب ہوئے نقوی صاحب اور سلمیٰ کا رشتہ ناول میں پوری طرح نہ سہی کسی حد تک رومانی فضا قایم کرتا ہے۔

فطرت نے ان صحراؤں کو حسن بڑی فیاضی سے عطا کیا ہے لیکن انسان کی مداخلت بیجا سے اس حسن کے ماتھے پر آئی شکنیں نقوی صاحب کے روپ میں ناول کے مصنف کو بے چین کر دیتی ہیں قدرت اپنی تخلیق میں کسی کا دخل نہیں چاہتی اور یہاں ایک نکتہ ذہن میں ابھرا جو بائبل میں بھی ہے اور قرآن پاک میں بھی وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ جنت میں وہ شجر شجر ممنوعہ کیوں قرار دیا گیا کہ آدم فضائے فردوس میں جو کچھ ہے اس سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں کیونکہ شاید وہی اس آلودگی کا جو دنیا کا مستقبل میں المیہ بنے گی اور جس کا علم عالم غیب کو تھا اور اس حکم سے سرتابی خلد سے آدم کے اخراج کا باعث بنی آدم نے تو توبہ کر لی لیکن اولاد آدم نے اس توبہ کا بھرم نہ رکھا اور نہ اس کی توسیع کی مگر نقوی صاحب جیسے صالح فکر اور جذبہ دل کے انسان بھی ہیں۔ اس کے بعد اسلم صاحب ہیں جن کا دل اپنی اس گومتی کے لیے تڑپ رہا ہے جس کا ماضی شاندار لیکن جس کا حال دل آزاری ہے اور یہ بھی اس لیے ہے انسانوں نے قدرت کا استحصال کیا ہے اسلم صاحب گومتی کی زبوں حالی سے پریشان ہیں وہ تنہائی کا کرب بھی برداشت کر رہے ہیں اس موقع پر راجیو نے گومتی کے تقدس اور اس سے وابستہ اعتقادات پر بھی بڑی دلکش زبان میں ناول کو آگے بڑھایا ہے۔

ڈاکٹر ابھے جوشی چودہ کنکالوں کا راز جاننے کے لیے سرگرداں ہیں۔ وہ بقول ایک انگریزی مقولہ کے ایک اندھیرے کمرے میں ایک کالی بلی کو ڈھونڈھ رہے ہیں جو وہاں ہے ہی نہیں ڈاکٹر ابھے جوشی جھنجھلا بھی رہے ہیں اور تھک بھی رہے ہیں لیکن اپنے مقصد کے حصول کے کوشش میں ہار نہیں مان رہے ہیں۔ وہ کنکالوں کا راز ڈھونڈھ رہے ہیں جو آتماؤں کے سراب میں ہے اور وہ سراب آنکھوں کا دھوکا ہے گنگا نے ایک خوش حال زندگی کے سپنے دیکھے، ان کے ٹوٹنے کا ذکر ناول کے قاری کو محسوس کرانے کے لیے جس فنکاری سے راجیو نے سدھے ہوئے لفظوں سے ہمارے احساس کو گرفت میں لیا ہے وہ لائق ستائش ہے اور ان کا یہی انداز کردار سازی، پلاٹ کے ارتقا واقعات کو رونما کرنے میں غرض ہر جگہ نظر آتا ہے۔

ان کا ایک کردار چندن ہے جس کے غموں کا مداوا نقوی صاحب باپ کی موت ماں کی ارتھی پر ولاپ اور نامساعد حالات میں اس کی بیچارگی سب سے اس کو نجات دلانے کے لیے نقوی صاحب کا وہی انداز نظر آتا ہے جو بے زبان جانور کو انسانی سفاک قید سے نجات دلانے میں نظر آیا تھا۔

رفعت چندن کے لیے ایسی ہمجولی ہے جس سے مل کر وہ ہر تلخی بھول جاتا، اس کی کلفتیں مٹ جاتی ہیں اور ناول میں محبت کی روشنی ابھرتی ہے۔ صدائے دل میں شورش نہیں سنگیت کی کول لے ہے، رفعت نے اپنے اولاد کا نام چندا بتایا جس میں کسی نام سے وابستگی کی تصدیق تھی اور چندن کی زندگی میں باد بہاری کی ٹھنڈک کا احساس شگفتگی سے ہمکنار کرتا ہے۔ رفعت کی حالیہ زندگی اس کے ٹوٹ جانے کی منظر کشی وقت کی بے رحمی نے رفعت کا چہرہ زرد اور آنکھوں میں مایوسی بھر دی ہے، تعلق کا وہ موڑ آ گیا ہے جب نئی صبح رفعت کے وجود پر پھیلی تاریکی کو شاید مٹا پرائڈ آف اودھ اپارٹمنٹ کا ذکر بار بار آیا ہے جس کے مکین بیشتر ناول کے کردار ہیں۔

ناول میں بہت سے کردار ابھرتے ہیں کچھ ٹھہرے رہتے ہیں کچھ منظر سے غائب ہو جاتے ہر واقعہ ہر کردار انسانی سرشت وقت کی گردش کا بیانیہ تشکیل کرتا ہے۔ راجیو پرکاش کے مشاہدے ناول کے ارتقا کے در کھولتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف غیر مانوس موضوعات کا مطالعہ ناول کو وقیع بناتا ہے۔

نظام شمسی کے حوالے سے سیاروں کے متعلق ان کی معلومات اور مطالعہ کی

وسعت کے لے صفحہ 215 دیکھا جائے۔ ان کا نظام تخلیق متحرک ہے، منظر جلدی جلدی بدلتے ہیں اور کردار بھی لیکن کہانی کا ربط مجروح نہیں ہوتا ہے، شعور کی رو اپنا کام کرتی رہتی ہے جس کو فنکارانہ چابکدستی حسن تحریر کی سند کے حصول کا رنگ بکھیرتی ہے۔ اول تا آخر شاعرانہ انداز بیان ہے اور جملوں کی ساخت اور اور ان سے پیدا روانی کا تاثر جداگانہ ہے، فلسفیانہ فکر سے زیادہ تصوف یا ادھیاتم کا ان کی فکر پر اثر ہے جو معاشرے میں پھیلی مہملیت، تشدد فرقہ وارانہ رویے، انسانوں کے بیچ نفاق، ان سارے عناصر سے بےچینی اور ان پر احتجاج ادھیاتم سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا حل بھی وہیں کہیں ہے۔ یہ یقین باعث تسکین ہے کہ وہ ملک کی سالمیت اور انسانوں کے درمیان خوش حالی اور خیر سگالی کے فروغ کے تمنائی ہیں، تصوف کا رنگ یہاں نظر آتا ہے۔

راجیو نے چاروں طرف پھیلے مسائل کا بیان کیا ہے اور مسائل کا کوئی حل بتانے کی کوشش نہیں کی۔

ادب اطفال

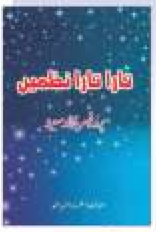

تارا تارا نظمیں

شاعر: خالد سعید، مرتب وناشر: ملنسار اطہر احمد

صفحات: 56، قیمت: 80 روپے، سنہ اشاعت: 2024

مبصر: ڈاکٹر بی بی رضا خاتون، ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پروفیسر خالد سعید ایک نقاد، شاعر، افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب استاد بھی رہے ہیں۔ انھوں نے محکمۂ تعلیم حکومت کرناٹک کے لیے بچوں کی نصابی کتابیں تیار کی ہیں۔ وہ مختلف کمیٹیوں کے ممبر اور صدر بھی رہے ہیں۔ ان کی تیار کردہ نصابی کتابوں سے بچوں کی نفسیات کی سمجھ اور ادب اطفال کے تقاضوں سے ان کی واقفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے بچوں کو محاورے اور کہاوتیں سکھانے کے لیے ایک کتاب 'کھیل کہاوت' تصنیف کی ہے جس میں نہایت دلچسپ انداز میں تصویروں کے ذریعے محاورے اور کہاوتوں کا استعمال سکھایا گیا ہے۔ ان کا یہ اختراعی طریقۂ تدریس اور تجربہ نہایت موثر اور کامیاب رہا۔ پروفیسر خالد سعید نے غیر اردوداں طبقے کو اردو زبان سکھانے کے لیے 'Learn Urdu' جیسی کتاب تصنیف کی جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ 'تارا تارا نظمیں' بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا مجموعہ ہے۔

خالد سعید کی ان نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے سیکھنے کے عمل کو پُر لطف (Joyfull) بنایا ہے تاکہ بچے ہنسی خوشی کھیل کھیل میں سب کچھ سیکھ جائیں۔ جیسے ان کی نظم 'آؤ سیکھیں الف بے پے' کے ذریعے بالکل ابتدائی مرحلے میں بچوں کو حروف تہجی بڑے مزیدار طریقے سے سکھا سکتے ہیں۔

ان کی نظموں میں سادہ وسلیس اور دہرائی جانے والی زبان بچوں کے ذخیرۂ الفاظ اور پڑھنے کی مہارت کو بڑھانے میں مدد کرتی ہے۔ بچوں کی عمر کے ساتھ موضوعات اور زبان آہستہ آہستہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے جو انھیں اپنے ادبی افق کو وسعت دینے میں تعاون کرتی ہے۔

خالد سعید نے ان نوعمر بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں کہانی اور کہانی کہنے کے انداز پر خصوصی توجہ دی ہے۔ یہ کہانیاں کرداروں کی آزمائشوں اور کامیابیوں کے ذریعے نونہال قارئین میں ہمدردی، مہربانی، ایمانداری، محنت، استقامت، فرمانبرداری، دوستی جیسے جذبات واقدار سکھانے میں رہنمائی کرتی ہیں۔

'بچوں کا گیت' میں انھوں نے کھیل کھیل میں تفریح کے ذریعے صاف صفائی کے اہتمام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ نظم میں قدرتی مناظر، باغ میں درخت، نہر میں بہتا پانی، پانی میں تیرتی مچھلیاں، اُچھلتے مینڈک سے بننے والی امیجری بچوں کی دلچسپی کو بڑھاتی ہے۔

ہم وزن الفاظ کے ذریعے کوئی چیز بچوں کو سکھائی جائے تو اس کے آہنگ کی وجہ سے جلدی یاد ہو جاتی ہے اور ایسے ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ بچے ہر وقت گنگناتے رہتے ہیں جیسے 'گنتی کا گیت' اور 'منظوم پہاڑا' اس نوع کی نظمیں ہیں۔

نظم 'بی بی کا بستہ' لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت اور ان کی تعلیم حاصل کرنے کی جستجو اور لگن کا احساس دلاتی ہے۔ ساتھ ساتھ شاعر نے موجودہ دور کے تعلیمی نظام میں کتابوں، کاپیوں کی تعداد میں اضافے سے بچوں کو درپیش مسائل کی طرف بھی بلیغ اشارہ کیا ہے۔

بی بی ہماری ننھی بہت ہے   بی بی کا بستہ وزنی بہت ہے

نظم 'ٹیلی ویژن' کے ذریعے بچوں میں سائنس وٹکنالوجی سے لگاؤ اور نئی ایجادات کو سمجھنے کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ چیزیں کیسے کام کرتی ہیں، جاننے کا تجسس بچوں کی قوت متخیلہ کو متحرک بناتا ہے اور اختراعی اور تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔

نظم 'علم کا اجالا' تعلیم کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔ شاعر بچوں کو سمجھاتا ہے کہ جیسے چاند رات کے اندھیرے کو دور کرتا ہے اسی طرح علم کا اجالا جہالت کے اندھیرے کو دور کرتا ہے۔ اس اجالے میں انسان اچھے اور برے، صحیح اور غلط کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے اور علم کی روشنی میں صحیح راہ اختیار کرتا ہے۔ صحیح راہیں اسے منزل مقصود پر لے جاتی ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے ایک صحن میں پڑھ رہے بچوں کی نہایت موثر تصویر کشی کی ہے۔ بچوں کے ادب میں تصویروں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے پھر وہ مصور کی بنائی تصویریں ہوں کہ شاعر وادیب کی لفظوں کے ذریعے بنائی گئی لفظی تصویریں۔

آنگن میں ایک گھر کے / کچھ بچے پڑھ رہے ہیں / بچے وہ پیارے پیارے / پڑھنے میں گم تھے سارے / چاروں طرف تھا ان کے / اک روشنی کا ہالا / ہالا وہ کچھ نہیں تھا / تھا علم کا اُجالا۔

بچوں کی نظموں پر مشتمل پروفیسر خالد سعید کی کتاب 'تارا تارا نظمیں' جناب ملنسار اطہر احمد نے مرتب کی ہے۔ اس میں ان کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے جو ریاست کرناٹک میں ادبِ اطفال کی روایت سے روشناس کراتا ہے۔ اس مجموعے میں کل 20 نظمیں شامل ہیں۔ جو بچوں کے ادبی ذوق کو تسکین پہنچانے کے ساتھ ساتھ انھیں صحیح املا لکھنے کی مشق کے ذریعے لسانی باریکیوں کی طرف توجہ دینے کی ترغیب دلاتی ہیں اور انھیں نیچر سے محبت کرنا، علم کی اہمیت کو سمجھنا، وقت کی قدر کرنا، ضرورت مندوں کی مدد کا جذبہ جیسی اخلاقی قدروں کا درس دیتی ہیں۔ پروفیسر خالد سعید کی یہ نظمیں ادبِ اطفال میں اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں لسانیات اور سماجی لسانیات پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں لسانیات اور سماجی لسانیات (Linguistics and Socio Linguistics) پینل کی میٹنگ ہوئی، اس میٹنگ میں ملک کے ممتاز ماہرین لسانیات اور سماجی علوم کے اسکالرز شریک ہوئے جس کی صدارت معروف ماہر لسانیات پروفیسر اے آر فتیحی (سابق پروفیسر شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل نے اردو لغت نویسی، اصول فرہنگ نویسی اور لسانی اصول وغیرہ پر پہلے بھی کام کیا ہے اور آگے بھی ان موضوعات پر کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ بدلتے لسانی منظر نامے اور چیلنجز کا اردو قارئین مقابلہ کرسکیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی ساخت اور سماجی تناظر میں اس کے استعمال کو دستاویزی شکل دینے کے لیے ورکشاپ کی اشد ضرورت ہے جسے مستقبل قریب میں عمل میں لایا جائے گا اور پوری امید ہے کہ ہماری یہ کوشش اپنی تہذیب اور زبان کے اخلاقیات کو باقی رکھنے میں معاون ثابت ہوگی۔ پروفیسر اے آر فتیحی نے کہا کہ ادب کا انحصار زبان پر ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی بات مکمل نہیں ہوتی۔ انھوں نے مزید کہا کہ لسانیات زبان کے مطالعے کا وہ سائنسی علم ہے جو زبان کی ساخت، صوتیات، معنی، گرامر اور اس کی تاریخی وسماجی ارتقا کا جائزہ لیتا ہے۔ موجودہ وقت میں زبان پر ہماری گرفت جتنی زیادہ ہوگی ہمارا ادب اتنا ہی بامعنی اور بافیض ہوگا۔ پروفیسر سید امتیاز حسنین (ایڈجنکٹ پروفیسر، شعبہ انگریزی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے لسانیات اور سماجی لسانیات کی خصوصیات اور اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے

اس موضوع پر قومی اردو کونسل سے شائع شدہ کتابوں کے حوالے سے کہا کہ یہاں سے جو بھی کتابیں لسانیات پر شائع ہورہی ہیں وہ بے حد اہم اور معلوماتی ہیں جن سے طلبا اور اساتذہ دونوں مستفید ہوسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر اعجاز محمد شیخ (صدر شعبہ لسانیات، کشمیر یونیورسٹی)، پروفیسر جہانگیر وارثی (شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، پروفیسر رویندر گریش اور ڈاکٹر سید تنویر حسین (شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے بھی اردو زبان میں لسانی تحقیق کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی اور موضوع سے متعلق مفید مشورے دیے۔ میٹنگ کے دوران ممبران نے اس پینل کے تحت جاری اور مکمل شدہ مختلف پروجیکٹس کا جائزہ لیا اور ان کے تعلق سے اہم فیصلے لیے گئے۔ اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر، اکیڈمک)، ڈاکٹر صائمہ ثمرین (پروجیکٹ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاداب شمیم (پروجیکٹ اسسٹنٹ) وغیرہ بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جولائی 2025

مالی تعاون اسکیم برائے تھوک خریداری کتب اور گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں گرانٹ ان ایڈ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم اور اردو زبان کے ناقدین و محققین شریک ہوئے جس کی صدارت اردو کے مشہور فکشن نگار سید محمد اشرف نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس اسکیم کے تحت

ہندوستان کی تمام ریاستوں کی نمائندگی کا خیال رکھا جائے گا اور سمینار، مسودے اور پروجیکٹ کی منظوری وغیرہ میں ایسے موضوعات کو اہمیت دی جائے گی جن میں جدت اور نیا پن ہوگا، انھوں نے کہا کہ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ مالی امداد کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہوسکیں۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے سید محمد اشرف نے کہا کہ ایسی کتاب یا ایسے عنوانات کا انتخاب بہت ضروری ہے جو مستقبل میں بھی کارآمد ہو، اس سے اردو کی عظمت اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ لٹریچر کے مقابلے میں لینگویج کی کتابوں کی زیادہ اہمیت ہے اس لیے کہ زبان بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور لٹریچر ثانوی۔ انھوں نے مزید کہا کہ گرانٹ ان ایڈ اسکیم محض مالی تعاون کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے ہم اردو زبان کے تحفظ، ترقی اور فروغ میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد (سابق وائس چانسلر، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی) نے قومی کونسل کی فعالیت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات خوش آئند ہے کہ کونسل ہمیشہ سے علمی و ادبی اداروں اور معیاری لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے، آج بھی جس طرح کے اہم فیصلے لیے گئے ہیں ان کے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ ان کے علاوہ پروفیسر میم نون سعید (سابق پروفیسر شعبہ اردو، بنگلور یونیورسٹی)، پروفیسر عبدالماجد قاضی (شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ)، پرفیسر اے ایم سید فضل اللہ (شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی)، ڈاکٹر نصرت مہدی (ڈائرکٹر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی)، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (ایسوسی ایٹ پروفیسر، پٹنہ یونیورسٹی) ڈاکٹر عبدالحی (صدر شعبہ اردو، گیا کالج، گیا جی)، ڈاکٹر محمد طیب علی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی نیو کالج، چنئی) اور ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد (ممبئی یونیورسٹی) نے بھی گرانٹ ان ایڈ کے حوالے سے اہم گفتگو کی اور اس اسکیم کو اردو زبان و ثقافت کے فروغ کا ایک مؤثر ذریعہ بتایا۔

اس سے قبل مالی تعاون اسکیم برائے تھوک خریداری کتب، رسائل و جرائد کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت معروف ناقد پروفیسر مظفر علی شہہ میری (سابق وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول، آندھرا پردیش) نے کی۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے قومی اردو کونسل کئی جہتوں پر کام کر رہی ہے اور مالی تعاون اسکیم برائے تھوک خریداری کتب، جرائد و رسائل ان میں سے ایک اہم اور فائدہ مند اقدام ہے۔ اس لیے کہ اس اسکیم کے تحت جو کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ انھیں ملک بھر کی لائبریریوں میں بھیجا جاتا ہے، انھوں نے کہا کہ اس اسکیم کا مقصد اردو کتب و رسائل کی اشاعت و ترسیل کو فروغ دینا اور اردو قارئین تک معیاری اور اچھی کتابیں پہنچانا ہے تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر مظفر علی شہہ میری نے کہا کہ اس اسکیم کے تحت معیاری اور نئے موضوعات پر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ تحقیق اور معیاری ادب کی طرف زیادہ توجہ دیں اس لیے کہ اردو کے قارئین کی تعداد میں اضافہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انھیں اچھی اور عمدہ تحریریں فراہم کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایسی کتابوں کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے جو حوالے کے کام آسکیں۔ جناب عبدالرحمٰن (چیرمین عالمی اردو ٹرسٹ) نے کہا کہ کسی مصنف کی کتاب صرف اس لیے نہ خریدی جائے کہ وہ بڑے مصنف ہیں ان کا نام بڑا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کتاب کی کیا ادبی قدر و قیمت ہے، ایسی کتابیں ہی اردو کے فروغ اور قاری کے علم میں اضافے کا باعث بنیں گیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی (سابق اسسٹنٹ پروفیسر بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، کشمیر)، ڈاکٹر محمد ریاض احمد (شعبہ اردو، یونیورسٹی آف جموں)، پروفیسر سورج دیو سنگھ (صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی)، پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)، پروفیسر حسنین اختر (صدر شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر رعنا خورشید (شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، ڈاکٹر ارشاد نیازی (شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر زین شمسی (بی آر ایم کالج، مونگیر) اور گورننگ کونسل کے ممبر ڈاکٹر مشتاق احمد لون (ایسوسی ایٹ پروفیسر، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر) اور عرفان پیرزادہ نے بھی اس اسکیم کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور کونسل کی سرگرمیوں اور اس کے کام کرنے کے طریقے کو سراہا۔ شکریے کی رسم انتخاب احمد (ریسرچ آفیسر، جی آئی اے، قومی اردو کونسل) نے ادا کیا۔ اس موقعے پر کونسل سے ساجدہ بیگم (لائبریرین)، سید مجیب احمد (ٹیکنیکل اسسٹنٹ)، ڈاکٹر بہلول (ٹیکنیکل اسسٹنٹ)، شہناز اختر (سینئر اسٹینو)، ڈاکٹر شاداب شمیم (پروجیکٹ اسسٹنٹ)، ڈاکٹر فیضان الحق (پروجیکٹ اسسٹنٹ) اور فرح دیبا وغیرہ بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 جولائی 2025

قومی اردو کونسل پورے ملک میں فروغِ اردو کے لیے قابلِ قدر کام کر رہی ہے: غلام علی کھٹانہ

قومی اردو کونسل میں گورننگ کونسل کے ممبر و رکن پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) کی آمد پر استقبالیہ تقریب کا انعقاد

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں آج کونسل کی گورننگ کونسل کے ممبر و رکن پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) عزت مآب غلام علی کھٹانہ کی آمد کے موقعے پر ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے

ان کا استقبال کیا اور جناب اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) نے پریزنٹیشن کے ذریعے کونسل کی سرگرمیوں کا تعارف کروایا۔ انھوں نے بتایا کہ کونسل اپنے قیام کے اول دن سے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے ساتھ اردو طلبا و طالبات کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے کے لیے مختلف اسکیمیں چلا رہی ہیں، جن سے ملک بھر کی بیشتر ریاستوں کے لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ جناب غلام علی کھٹانہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مجھے آپ حضرات سے مل کر دلی مسرت ہوئی اور کونسل کی سرگرمیوں سے بھی تفصیلی واقفیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کسی خاص سماجی طبقے کی زبان نہیں ہے، بلکہ یہ ہمارے دیش کی زبان ہے اور اسی حیثیت سے اس کی ترقی و ترویج کے لیے ہمیں کوششیں کرنی چاہئیں۔ مسٹر غلام علی نے مزید کہا کہ آج جدید ٹکنالوجی کی نت نئی ترقیات کی وجہ سے علمی و اشاعتی شعبے میں بھی بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، چنانچہ نئی نسل کے مزاج و رجحان کے پیشِ نظر آج کتابیں پبلش ہونے کے ساتھ ڈیجیٹل فارمیٹ میں بھی منظر عام پر آ رہی ہیں، اس لیے ہمیں کتابوں کو ڈیجیٹلائز بھی کرنا چاہیے، اسی طرح آج کے زمانے میں ترجمے کی بھی غیر معمولی اہمیت ہے اس لیے اردو زبان میں مختلف ہندوستانی و بیرونی زبانوں سے ترجمے پر بھی ضرور توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل فروغ اردو کے لیے قابلِ تعریف سرگرمیاں انجام دے رہی ہے اور مستقبل میں مزید بہتری کی توقع ہے۔ انھوں نے کونسل کے استحکام اور فروغ اردو سے متعلق کسی بھی پیش رفت کے سلسلے میں اپنے تعاون کی بھی یقین دہانی کرائی۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام اسٹاف موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 جولائی 2025

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دهلی

کبیر کا کلام اور بھکتی پیغام

نئی دهلی: ہندوستانی زبان اور ادب وثقافت سے متعلق ریختہ لرننگ پلیٹ فارم نے ایک نیا آن لائن کورس شروع کیا ہے۔ اس کورس کے تحت پندرہویں

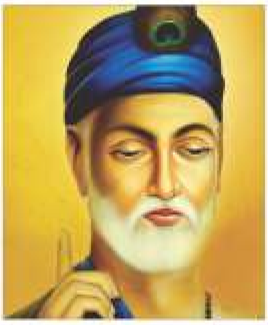

صدی کے انقلابی شاعر سنت کبیر کے کلام، فکر اور روحانی پیغام کو نئی نسل سے متعارف کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ کبیر نے اپنی شاعری کے ذریعے ذات پات، مذہب، اور ظاہری رسم ورواج کی سختی سے مخالفت کی اور باطن کی بیداری کو اصل عبادت قرار دیا۔ ان کی آواز آج بھی دنیا بھر کے سنجیدہ قارئین اور روحانیت کے متلاشی افراد کو متاثر کرتی ہے۔

کورس سے متعلق ریختہ لرننگ کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ کبیر صرف ایک تاریخی شخصیت نہیں بلکہ ایک زندہ اور معاصر آواز ہیں۔ ہمارا مقصد اس کورس کے ذریعے کبیر کو ان کے سیاق وسباق میں سمجھنا اور یہ جاننا ہے کہ ان کی تعلیمات آج کے انتشار، تنہائی، اور روحانی خلا میں کس طرح رہنمائی فراہم کر سکتی ہیں۔ اس کورس کی زبان ہندی ہے اور اس کا دورانیہ پانچ گھنٹے پر مشتمل ہے، جسے 8 مربوط اسباق میں تقسیم کیا گیا ہے۔

یہ کورس خاص طور پر ان افراد کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جو کبیر کو صرف ایک شاعر کے طور پر نہیں، بلکہ ایک فکری رہنما، روحانی استاد اور عہد ساز مفکر کے طور پر جاننا چاہتے ہیں۔ طالب علم، معلم، محقق، یا محض سچائی کے متلاشی کے لیے یہ کورس فکری اور روحانی سفر کا ایک نیا دروازہ کھولے گا۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات ریختہ کی ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2025

قدیم ادبی ورثہ کتابی شکل میں

نئی دهلی: ساہتیہ کلا اکادمی نے ادبی ورثے کو محفوظ رکھنے اور نوجوان نسل کو اپنی ثقافتی جڑوں سے جوڑنے کے مقصد سے ایک نئی ادبی مہم کا آغاز کیا ہے۔ اس پہل کے تحت ماضی کے ممتاز ادیبوں کی چنندہ تخلیقات کو کتابی سلسلے کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ آج کی ڈیجیٹل نسل کو ادبی گہرائیوں سے روشناس کرایا جاسکے۔ یہ سلسلہ سینئر ادیبوں کی نگرانی میں ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ خاص طور پر بچوں کے ادب کو اہمیت دیتے ہوئے ممتاز ادیبوں کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیاں اور نظمیں اس میں شامل کی جارہی ہیں۔ معروف ادیب وبچوں کے ادب نگار پرکاش منو نے تین اہم ادیبوں آنند پرکاش جین، نرنکار دیوسینا اور دوار یکا پرساد کی منتخب تخلیقات کو بچوں کے ادبی سلسلے کی صورت میں شائع کیا ہے۔ ان کتابوں میں شامل کہانیاں اور نظمیں نہ صرف تفریح فراہم کرتی ہیں بلکہ اخلاقی اقدار اور سماجی شعور کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ پرکاش منو کے مطابق کئی ایسے ادیبوں کی پرانی تخلیقات موجود ہیں جو اب دستیاب نہیں ہیں۔ ان پر بھی کام جاری ہے۔ جلد ہی سات دیگر موضوعات پر مبنی ادبی مجموعے بھی شائع کیے جائیں گے جن میں تاریخی، سائنسی، ماحولیاتی، ثقافتی اور تحریک آمیز موضوعات شامل ہوں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جولائی 2025

عبدالمنان اردو ماہنامہ 'آجکل' کے مدیر نامزد

نئی دهلی: پبلی کیشن ڈویژن وزارت برائے اطلاعات ونشریات حکومت

ہند نے عبدالمنان کو اردو ماہنامہ 'آجکل' کا مدیر نامزد کیا ہے۔ ان کی نامزدگی پر اردو داں طبقہ نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ رسالہ اپنے تابناک ماضی کی جلد بازیافت کرے گا۔ واضح رہے کہ اردو کے اس سرکاری رسالے کی ادارت سے درجنوں ممتاز ادیب و شعرا وابستہ رہے ہیں جن میں جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، معین احسن جذبی، شان الحق حقی، راج نارائن راز محبوب الرحمٰن فاروقی، ابرار رحمانی، عابد کرہانی، خورشید اکرم، حسن ضیاء اور فرحت پروین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ عبدالمنان قبل ازیں ماہنامہ 'یوجنا' کے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے مدیر رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف سرکاری رسائل میں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ وہ وزارت برائے اطلاعات ونشریات کے مہم افسر اور سینک سماچار (وزارت دفاع) کے سب ایڈیٹر کے عہدے پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ علاوہ انھوں نے فیلڈ ایگزی پبلسٹی افسر کے طور پر دہلی اور جموں میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈی ڈی نیوز فیچر اینڈ نیوز الائنس (فانا)، روزنامہ عوام، روزنامہ سب کا اخبار، ماہنامہ افکار ملی اور جز وقتی طور پر آل انڈیا ریڈیو سے کئی حیثیتوں سے منسلک رہے۔ وہ یو این آئی اردو سروس کے سب ایڈیٹر اور ہندی ماہنامہ 'یووادرشٹی' کے بانی مدیر بھی رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جولائی 2025

ماہانہ نثری نشست کا اہتمام

نئی دهلی: حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ماہانہ نثری نشست کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت معروف ادیب ونقاد ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ نشست میں اردو ہندی ادب کے مختلف موضوعات پر مقالات پیش کیے گئے اور نامور ادبی شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر کنول نے اپنے صدارتی خطاب میں نثر ونظم کی یکساں اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں جہاں شاعری کو نمایاں مقام حاصل ہے، وہیں نثر کی بھی ایک مضبوط روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند جیسے عظیم نثر نگار کے افسانے آج بھی اردو

وہندی قارئین کے دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کی شہرۂ آفاق کہانی عیدگاہ اور کفن نے سماجی حقیقتوں کو جس خوبی سے بیان کیا، وہ نثر کی طاقت کا ثبوت ہے۔ انھوں نے کہا کہ رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی نثر میں بھی شعری جمالیات جھلکتی ہے جو نثر کی گہرائی و وسعت کا مظہر ہے۔ اس موقعے پر دلکش فاطمہ نے 'ترقی پسند نظریہ اور اردو شاعری' کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے ادب میں نظریاتی تحریکوں کے اثرات کا تجزیہ کیا۔ شگفتہ سلیم نے اپنے والد، ممتاز محقق شیخ سلیم احمد کا تعارف پیش کیا اور ان کی کتاب امیر خسرو کے اقتباسات کے ذریعے حضرت امیر خسرو کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ نوجوان اسکالر محمد رضوان (بریلی) نے 'درگا سہائے سرور کی شاعری اور فطرت نگاری' پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ نشست میں معروف ہندی ادیبہ وکہانی کار ریتو استھانا روحی نے ایک مختصر مگر اثر انگیز کہانی سنائی، جب کہ پروین ویاس نے ہندی نثر کی اصناف پر مدلل گفتگو کی۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے اردو کے دو معتبر خادمین کو یاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ مہندر سنگھ بیدی اور غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمید نے اردو کے فروغ میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ بیدی سحر نے لال قلعہ مشاعرے کی بنیاد رکھی جو آج بھی اردو کا ایک درخشاں حوالہ ہے، جب کہ حکیم عبدالحمید نے نہ صرف غالب اکیڈمی قائم کی بلکہ تمام ہندوستانی و بین الاقوامی زبانوں کے باہمی ربط پر بھی بھرپور کام کیا۔ نشست میں نارنگ ساقی نے خصوصی شرکت کی، جب کہ بزرگ شاعر محمد رفیق شیوپوری نے کنور بیدی سحر کے ساتھ مشاعروں کی یادیں تازہ کیں۔ دیگر شرکا میں شعیب رضا فاطمی، شری کانت کوہلی، احترام صدیقی، کمال الدین اور متعدد معزز ادبی شخصیات شامل تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جولائی 2025

ایک شام عالمی امن کے نام

نئی دھلی: امن انسانی زندگی کی ایسی بنیادی قدر ہے جس کے بغیر انسانیت اور کسی مہذب معاشرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور انسانی سماج کو صحت مند دیکھنے کے خواہش مند ہیں ان کا فرض اولین ہے کہ امن کے قیام میں ہر طرح معاون ثابت ہوں۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین نے کیا وہ یہاں غالب اکیڈمی میں 'ایک شام عالمی امن کے نام' کے عنوان سے منعقد مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مشاعرہ قیام امن کی ایک بہترین کوشش ہے۔ اس مشاعرے کا اہتمام ڈریمس انڈیا ریسرچ فاؤنڈیشن اور 'عبارت پبلی کیشن' نے اردو اکادمی کے تعاون سے کیا تھا جس کا افتتاح معروف سیاسی رہنما اور عوامی خدمت گار ہدایت اللہ جینٹل نے کیا۔ ہدایت اللہ جینٹل نے افتتاحی تقریر میں امن عالم کے قیام کے لیے انسانی حقوق کی پاسداری کو اولین شرط قرار دیا۔ ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر، کمرشیل ٹیکس رئیس اعظم خان اور رئیس مظفر نگری تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ نامور صحافی اسد رضا اور انجمن ترقی اردو ہند کے سیکشن آفیسر محمد ساجد مہمانِ ذی وقار اور قومی خواتین کمیشن میں ریسرچ اسٹنٹ آفیسر آبگینہ عارف اور سینئر صحافی و اینکر آسیہ خان مہمانِ ذی وقار کے طور پر موجود تھیں۔ مشاعرے کی نظامت معروف شاعر و صحافی معین شاداب نے اپنے مخصوص انداز میں کی۔ انھوں نے ابتدائی گفتگو میں موجودہ عالمی حالات میں قیام امن کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جنگوں میں سب سے پہلا خون سچ کا ہوتا ہے، قلم کاروں کو سچ کو بچانے کی ضرورت ہے۔ ڈریمس انڈیا، ریسرچ فاؤنڈیشن کے چیئرمین ابساط رانا نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے جب کہ سلام خاں نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 جولائی 2025

اتر پردیش

جشن سکندر حیات کیلاش پوری

سهارنپور: سہارنپور کے استاد شاعر سکندر حیات کیلاش پوری کے اعزاز میں ڈاکٹر امبیڈکر مولانا آزاد

ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور آل انڈیا اردو تعلیمی بورڈ کے مشترکہ تعاون سے رسول پور میں واقع ایک ہال میں جشن سکندر حیات کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت یوپی اردو اکادمی کے ممبر اور اربن کوآپریٹو بینک کے چیئرمین ایم آزاد انصاری نے کی۔ پروگرام کا افتتاح ٹرسٹ کی چیئرپرسن ملکہ اختر نے فیتہ کاٹ کر کیا۔ پروگرام کی شمع گرام پنچایت کے سابق چیئرمین ماجد علی نے روشن کی۔ پروگرام میں بطور مہمانانِ خصوصی دانش کمال، زلفان احمد، مول چند اور عبدالواجد نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے خرم سلطان نے سکندر حیات کی 60 سالہ ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ سادہ لباس والے جدید ذہن کے شاعر کو اگر دیکھنا ہو تو سکندر حیات سے ملا جاسکتا ہے۔ سکندر حیات نے اچھوتے مضامین کو نئے محاوروں اور استعارات سے آراستہ کر کے سہارنپور اردو ادب کو نئی پہچان دی ہے۔ پروگرام کنوینر ایڈووکیٹ انتخاب آزاد نے ڈاکٹر امبیڈکر مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ کے کارہائے نمایاں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ نائب کنوینر دانش عثمان صدیقی نے اردو زبان کے حوالے سے نشست اور مشاعروں کی اہمیت اور افادیت پر گفتگو کی۔ اس موقعے پر سکندر حیات کو خرم سلطان کا لکھا سپاس نامہ دے کر اور شال اوڑھا کر اعزاز سے نوازا۔ گل محمد گل نے سکندر حیات کو دستار پیش کر کے باقاعدہ استاد منتخب کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 جولائی 2025

مرثیہ کی سماجی اور ادبی قدریں

میرٹھ: مرثیہ کی صنف نے کربلا کے واقعے کو ہمارے ذہن وضمیر پر ثبت کردیا ہے اور لازم بنا دیا ہے کہ ہم اس پر عمل کریں۔ واقعہ کربلا کی جو عظمت ہے اس کو مرثیہ کے ذریعے ضائع ہونے سے بچا لیا گیا ہے۔ انیس و دبیر کس زمانے سے مرثیہ کہتے ہیں یہ ہمیں نہیں سوچنا چاہیے بلکہ انیس و دبیر نے مرثیہ کے ذریعے ادبی قدروں کو پیش کیا ہے۔ ہماری تہذیب اور تہذیبی اقدار مرثیے میں ملتی ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد و اسکالر پروفیسر اختر الواسع کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد 'مرثیہ کی سماجی اور ادبی قدریں' موضوع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرثیہ کا سفر ابھی جاری ہے۔ مرثیہ اردو زبان و ادب کا اعتبار

ہی نہیں بلکہ سماج کی تہذیب اور اس کی اقدار کو مامال کرنے والا بھی ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کے بطور پروفیسر اختر الواسع (سابق شیخ الجامعہ مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور، راجستھان) اور پروفیسر زماں آزردہ (سابق صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی) نے آن لائن شرکت فرمائی۔ خصوصی مقرر کے بطور عالمی شہرت یافتہ محقق و ناقد ڈاکٹر تقی عابدی شریک ہوئے جب کہ تحت اللفظ مرثیہ کی قرأت معروف شاعر فخری میرٹھی نے کی اور پروگرام میں اظہار خیال پروفیسر عابد حسین حیدری، سنبھل نے کیا۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر عرفان عارف (جموں) نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے آیوسا کے سکریٹری ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ مرثیہ کا مطالعہ جب ہم عصر حاضر میں کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مرثیہ سماج و معاشرہ کا عکاس ہے، اردو مرثیہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اردو شاعری کی۔

اس موقعے پر پروگرام کا تعارف پیش کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ بہت سے لوگ ابھی تک مرثیہ کو صرف امام حسین تک محدود سمجھتے تھے مگر شخصی مرثیے بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ مرثیوں کی سماجی اور ادبی حیثیت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب کسی پر ظلم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مرثیہ ہی وہ صنف ادب ہے جس میں سماجی مسائل خاصے نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر دور سے مرثیہ جڑا رہا۔ منظر نگاری اور مکالمہ نگاری جس طرح مرثیوں میں ہوتی ہے نظم نگاری میں نہیں ہے۔ پروفیسر عابد حسین حیدری نے کہا کہ شبلی نے جس مرثیے کو ادبی اعتبار سے آگے لانے کی کوشش کی تھی اس میں سماجی قدریں اور عصری مسائل شامل تھے۔ جب بھی ظلم اور جبر کا معرکہ پیش آتا مرثیے کی سماجی اقدار ہماری رہنمائی کرتی تھیں۔ پروفیسر زماں آزردہ نے کہا کہ آج ایسا دور آگیا ہے کہ مرثیہ نصاب سے غائب ہوتا جارہا ہے۔ اس کے ذمے دار اساتذہ بھی ہیں۔ سماجی اور ادبی حوالے سے مرثیے میں جو نکات ملتے ہیں وہ انسانی سماج کا محاکمہ کرتے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں غیر مسلموں نے بھی مرثیے لکھے ہیں اور آج بھی بہت سے غیر مسلم مرثیہ خوانی اور الم میں شریک ہوتے ہیں۔ اردو کی یہ بڑی صنف ہے کیونکہ یہ روح اور مذہب کا حصہ ہے۔ پروگرام سے ڈاکٹر ریشماں پروین، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، نزہت اختر، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ وطالبات جڑے رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 جولائی 2025

مصنف سے ملیے

بنارس: ساہتیہ اکادمی کے 'مصنف سے ملیے' پروگرام میں تقریر کرتے ہوئے مشہور محقق، نقاد، شاعر اور کالم نگار شمیم طارق نے کہا کہ ایک مکان، ایک گھر بناتے ہوئے لوگوں کی زندگی گزر جاتی ہے، مگر میں نے ایک دنیا آباد کی ہے، پھر بھی لگتا ہے کہ جیتنے کو ایک پوری دنیا باقی ہے، شاید اس لیے کہ میں روح کا کولمبس ہوں اور نت نئی دنیا کی تلاش میری فطرت کا حصہ ہے۔ یہ پروگرام بنارس ہندو یونیوسٹی کے شعبۂ اردو کے اشتراک سے اسی یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا تھا۔ شمیم طارق نے اپنے والدین اور خاندان کے بزرگوں اور اپنے اساتذہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد کہا کہ میری زندگی میں حادثات اور آزمائش بہت ہیں مگر ہر آزمائش ایک نئی آسائش کا بہانہ بنتی رہی ہے لہٰذا شکایت سے نہیں شکر سے میرا خاص رشتہ ہے۔ میں ساحر کے لفظوں میں کہتا ہوں کہ جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا۔

میں اس یونیورسٹی کے شعبۂ کامرس میں کبھی طالب علم رہا ہوں مگر اردو ادب کا ذوق مجھے بچپن سے تھا اور اسی ذوق کی بنیاد پر میں نے اب تک 24 کتابیں تصنیف کی ہیں اور مزید دو کتابیں زیر طبع ہیں۔ اسی ذوق کی بدولت میں محسوس کرتا ہوں کہ اردو ادب میں 'رگ گل سے بلبل کے پر باندھنے' کی روایت ختم ہوچکی ہے اور آج اردو میں نئے موضوعات پر لکھا جارہا ہے۔ جن نئے موضوعات پر ہمارے شعرا اور ادبا لکھ رہے ہیں وہ ویدک ادب، تقابلی مطالعہ، مطالعۂ لسانیات، ثقافتی مطالعہ، نکڑ ناٹک کی سماجی معنویت، اردو ادب کی روایت اور تانیثیت، اردو اور ہندی کی ساجھی وراثت، اردو زبان و ادب میں ہندوستانی ساطیر اور فکر و فلسفہ وغیرہ ہیں۔ غزل گوئی اور افسانہ نویسی میں بھی نیا پن پیدا ہوا ہے جو مذکورہ موضوعات کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ میں نے خصوصیت سے لسانی مطالعہ، تقابلی مطالعہ، تصوف کا مطالعہ اور ہندوستان کی شعری و لسانی روایتوں کی آمیزش سے پیدا ہونے والی عوامی شعریات کی نئی حقیقتوں کی دریافت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو بدیسی کہنے والے بھی اردو کا ہی استعمال کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ اس کی کم و بیش چالیس آوازوں میں صرف چھ باہری ہیں باقی اردو کی اپنی ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو اردو میں بھارگو، بھاردواج، بھابھی لکھنے کی گنجائش نہ نکلتی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر مشرف علی کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ شمیم طارق کا استقبال صدر شعبۂ اردو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کیا جب کہ ان کا مکمل تعارف ساہتیہ اکادمی کے ایڈیٹر (ہندی) انوپم تیواری نے کیا۔ اس موقعے پر شمیم طارق کے تعارف پر مبنی کتابچہ بھی تقسیم کیا گیا جو ساہتیہ اکادمی نے تیار کیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جولائی 2025

عصری تناظر اور پریم چند

میرٹھ: منشی پریم چند ہمارے لیے آئیڈیل ہیں۔ پریم چند نے اپنا بنیادی مرکز دیہات کو رکھا جس کا اس وقت کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا، جب انھوں نے 1936 میں ترقی پسندی کے اجلاس کے دوران اپنے خطب میں کہا تھا کہ اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا یعنی سماج و معاشرہ کی ہر چیز میں حسن کے

معیار کو دیکھنا ہوگا۔ پریم چند نے سماج کو بہت کچھ دیا اسی لیے ہم انھیں اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد 'عصری تناظر اور پریم چند' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر نے کی، صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور سابق

صدرشعبۂ ہندی ممتاز پی جی کالج لکھنؤ پروفیسر عبدالرحیم نے شرکت کی۔ مہمان اعزازی کے بطور پروفیسر دیپا تیاگی صدرشعبۂ ہندی آئی این پی جی گرلز کالج میرٹھ اور ڈاکٹر وصی اعظم انصاری ایسوی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی نے شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر جوہی بیگم سابق استاد الہ آباد ڈگری کالج اور معروف ادیبہ میرٹھ پونم رانا شریک ہوئیں۔ پروگرام میں لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی جڑی رہیں۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے اور شکریہ کی رسم محمد ندیم نے ادا کی۔ موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ایوسا کے سکریٹری ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ شاید ہی کوئی یونیورسٹی اور کالج ہو جس کے نصاب میں منشی پریم چند شامل نہ ہوں۔ ہندی، اردو کے ادیب پریم چند کا اردو فکشن پر بڑا احسان ہے۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ منشی پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں میں پورا ہندوستان سمایا ہوا ہے۔ پریم چند ہمارے یہاں ایک تحریک اور ایک دبستان بن چکے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر دیپا تیاگی نے کہا کہ منشی پریم چند کے زمانے میں جو حالات تھے وہ آج بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر وصی اعظم انصاری نے کہا کہ پریم چند کا پہلا اور آخری افسانہ دلت مسائل پر ہے۔ دلت مسائل کے حوالے سے جو ہم سماج میں دیکھ رہے ہیں، ان کے تعلق سے منشی پریم چند کے بہت سے ناول اور افسانے ہمیں غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالرحیم نے کہا کہ پریم چند نے اپنی بات جس بے باکی سے اپنی کہانیوں میں کہی اس کو آج کے تناظر میں کہنا بہت مشکل ہے۔ پروگرام میں ڈاکٹر جوہی بیگم نے 'فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور پریم چند' اور پونم رانا نے 'عصری تناظر اور پریم چند' عنوانات سے اپنے پرمغز مقالات پیش کیے۔ پروگرام سے ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر فرح ناز، کشش، محمد شمشاد اور دیگر طلبہ وطالبات جڑے رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 اگست 2025

شعبۂ اردو میں پاپولر میرٹھی پر پروگرام

میرٹھ: مزاح سے مردہ دل بھی زندگی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں اور انسان کچھ دیر کے لیے ہی سہی اپنے دکھ درد کو بھول جاتا ہے۔ طنز ومزاح کا شاعر اپنی شاعری میں

مختلف موضوعات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں دلکشی ورعنائی در آتی ہے۔ وہ طنز ومزاح کا سہارا لے کر عام زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور سیاسی و سماجی حالات پر تبصرہ کرتا ہے اور اپنی تنقیدی بصیرت سے حقائق کو بے نقاب کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو شعبۂ اردو میں منعقد پاپولر میرٹھی کی آمد پر پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی انھوں نے اپنے منفرد انداز سے اپنے ساتھ ساتھ میرٹھ اور ملک کا بھی نام روشن کیا ہے۔ خوش ذوقی اور خوش نمائی کی بنا پر پاپولر میرٹھی نے مزاحیہ شاعری میں ایک معتبر مقام حاصل کرلیا ہے۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ڈاکٹر سید اعجاز علی پاپولر میرٹھی کا استقبال کرتے ہوئے کیا۔ نظامت کے فرائض شعبے کی استاد ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دیے۔ پروگرام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر آصف علی نے کہا کہ پاپولر میرٹھی ایک معروف مزاحیہ شاعر ہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مختلف خصوصیات کے مالک ہیں۔ آپ کی شاعری میں مزاح کے رنگ تو ہیں ہی ساتھ ہی رومانوی رنگ کے ساتھ ساتھ معاشرہ اور خصوصاً دور حاضر کی سیاست پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔ پاپولر میرٹھی ہلکے پھلکے انداز میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ سامعین انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں اور دیر تک اس کی گہرائی میں کھوئے رہتے ہیں۔ آپ کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ اکثر آپ نہ صرف دوردرشن سمیت مختلف چینلوں کے کوی سمیلنوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور ناظرین کو خوب گدگداتے بھی ہیں اور سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر بھی آپ کو خوب سنا اور دیکھا جاتا ہے۔ اس موقعے پر پاپولر میرٹھی نے 'امیدوار میں بھی ہوں، میر و غالب' 'یارو مجھے سلام کرو میں وزیر ہوں' اور 'چلو دلدار چلو' جیسی شہرہ آفاق نظموں کے علاوہ قطعات سے سنا کر محفل کو گلزار کردیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 جولائی 2025

دانش کمال کے اعزاز میں حلقۂ یاراں کی شعری نشست

سہارنپور: انصاری منزل چوکی سرائے پر ادبی تنظیم حلقۂ یاراں سہارنپور کے زیر اہتمام شاعر دانش کمال کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس

کی صدارت سینئر صحافی احمد رضا نے کی۔ افتتاح سماجی خدمت گار نواب انصاری نے کیا۔ سکندر حیات اور فیاض ندیم نے مشترکہ طور پر شمع روشن کی۔ پروگرام کے کنوینر ایڈووکیٹ محمد علی نے مہمانانِ کرام کا گل پوشی سے استقبال کیا۔ پروگرام کے ناظم اور تنظیم کے سکریٹری خرم سلطان نے دانش کمال کی شعری خدمات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ دانش کمال سہارنپور اردو ادب کے اس دور کی شعری روایات کو بڑے سلیقے سے آگے بڑھا رہے ہیں جو شعر و ادب کا سنہرا دور کہا جاتا ہے، جس دور میں منشی غفور، حنیف سیمابی اور ڈاکٹر تہذیب جیسے سخنوران شعر و سخن کی شمعیں روشن کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اسی دور کے استاد شاعر حمید قریشی کے خاندان کے چشم و چراغ اور حمید قریشی کے جانشین دانش کمال ہیں جو اپنے والد کی شعری روایات کی پاسداری کر رہے ہیں۔ دریں اثنا دانش کمال کو شال، مومنٹو اور سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 جولائی 2025

دل تاج محلی سے ایک ملاقات

میرٹھ: دل تاج محلی کی زبان کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ، خاکہ اور گیت سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ادب کو دل سے دیکھ رہے

ہیں۔ عام سامعین اور قارئین کے دلوں میں ان کی شاعری اثر کررہی ہے۔ مکالمہ در مکالمہ اپنے خیالات پیش کررہے ہیں۔ آپ نے ماضی اور حال کو آمیز کرنے کا منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد پروفیسر صغیر افراہیم کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیراہتمام منعقد ’دل تاج محلی سے ایک ملاقات‘ موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کررہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور آگرہ کے معروف شاعر دل تاج محلی نے آن لائن شرکت فرمائی۔ پروگرام سے لکھنؤ سے آیوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین بھی جڑی رہیں۔ مقالہ نگار کے بطور چشمہ فاروقی (سابق مدیر خاتون مشرق، دہلی) اور سعدیہ سلیم نے شرکت کی۔ دل تاج محلی کا تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی، استقبالیہ کلمات محمد ندیم اور نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دیے۔ اس موقعے پر معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اردو ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان میں ایک نام دل تاج محلی کا ہے۔ جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ تاج محل کو جوڑ لیا ہے۔ دل تاج محلی کی شاعری نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی مانند ہندوستانی رسم ورواج پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری دلوں کو جوڑنے والی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شاداب علیم نے بھی تاج محلی کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 25 جولائی 2025

منشی پریم چند پر سمینار

مرادآباد: اردو کے افسانوی ادب پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر دور میں سماج اور معاشرے کے کمزور اور دبے کچلے لوگوں سے ادیبوں کی وابستگی اور ہمدردی رہی ہے لیکن جس انداز میں منشی پریم چند نے پچھڑے اور حاشیے پر کھڑے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر دھرمیندر کمار سنگھ نے شعبہ اردو ایم ایچ کالج مرادآباد کے زیراہتمام منعقدہ سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ منشی پریم چند سچے محب وطن تھے۔ ان کا دردمند دل ہندوستانی کسانوں، مزدوروں، عورتوں اور دبے کچلے عوام کی زبوں حالی پر کراہ اٹھتا تھا۔ یہی درد ان کے ناولوں اور افسانوں میں جابجا نظر آتا ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر عبدالرب صدر شعبۂ اردو نے مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے حاضرین کا استقبال کیا اور شعبۂ اردو کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق بتاتے ہوئے سمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر کاویہ سوربھ جیمنی منیجر ایم ایچ کالج نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند نے اپنی تحریروں سے ہندوستانی ادب کو مالامال کرنے کے ساتھ ہی اسے اس قابل بنایا کہ ہندوستانی ادب عالمی سطح کے فکشن کے مقابل رکھا جاسکے۔ پروفیسر رویش کمار وائس پرنسپل ایم ای کالج نے سمینار میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند کی تمام کہانیاں فنی اعتبار سے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے گہرے مطالعے، اہم تجربات اور گہرے سماجی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ پروفیسر سدھیر کمار اروڑا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ جس طرح سماج کے دبے کچلے عوام کے مسائل کو پیش کیا اور استحصالی قوتوں کو بے نقاب کیا ان کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ پروفیسر کمار گپتا صدر شعبۂ ہندی نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ منشی پریم چند نے اپنی کہانیوں میں دیہی زندگی کی کامیاب عکاسی کی ہے لیکن شہری زندگی کی ترجمانی میں بھی اپنی ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس موقعے پر بعض ریسرچ اسکالرز نے پیپر پڑھا، ان میں محسنہ نگار، انوپ سنگھ، فرحین اقبال، فہیم احمد، جاوید علی، اور مینو پروین نے بالترتیب منشی پریم چند کی صحافتی خدمات، منشی پریم چند کی ناول نگاری، منشی پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، منشی پریم چند اور ترقی پسند تحریک، منشی پریم چند ہندوستانی سماج کے نقاش، منشی پریم چند کا اسلوب کے عنوانات سے مضامین پیش کیے۔ سمینار کی صدارت ایم ایچ پی جی کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے کی۔ اس سمینار میں کالج کے اساتذہ میں پروفیسر پرینکا گپتا، پروفیسر محمد ایوب، ڈاکٹر منیش بھٹ، ڈاکٹر جتیندر کمار، ڈاکٹر مکیش موہن، ڈاکٹر اجیت کمار، ڈی پی پانڈے، ڈاکٹر اکھلیش کمار کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبا و طالبات موجود تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسما عزیز نے بحسن وخوبی انجام دیے اور ان کے اظہار تشکر پر سمینار اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 3 اگست 2025

بہار

فروغ اردو سمینار

آرہ: اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے زیراہتمام ضلع اردو زبان سیل، بھوجپور، آرہ کے مشہور ومعروف ہال ناگری پرچارنی میں منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت انچارج افسر ظفیر احمد نے انجام فرمائی۔ اس تقریب کی روح رواں محترمہ آسمہ خاتون سابق نوڈل افسر ضلع اردو زبان سیل، بھوجپور وحکومت بہار کے سرکاری افسر کے ہاتھوں مشترکہ طور پر شمع روشن کر پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اس موقعے پر شہر و بیرون شہر کے محبان اردو نے کثیر تعداد میں شرکت فرمائی۔ فروغ اردو سمینار، عمل گاہ و مشاعرہ میں بھوجپور ضلع کے اے ڈی ایم (IAS) آئی اے ایس جناب محسن رضا، ڈپٹی کمشنر عابد سبحانی، ضلع پنچایتی راج افسر و دیگر اعلیٰ ضلع افسران کی شرکت ہوئی اور سبھی نے اردو کی اہمیت وافادیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اردو کے طلبا و طالبات کے درمیان تقریری مسابقہ کرا کر ان کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ اس مشاعرے میں نامور شعرا نے شرکت فرمائی۔ اس میں معین گریڈیہوی اور عطاء الرحمٰن عابد سبحانی، ضلع پنچایتی راج افسر و دیگر اعلیٰ ضلع افسران کی شرکت ہوئی اور سبھی نے اردو کی اہمیت وافادیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں انچارج افسر

ظفیر احمد نے کہا کہ ضلع اردو زبان سیل بھوجپور انتہائی فعال طریقے سے اپنی ذمے داری ادا کر رہی ہے۔ اس کے لیے یقیناً ضلع مجسٹریٹ بھوجپور اور اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار بھی داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ اردو کے تئیں ہمدردانہ و مخلصانہ طور پر انتہائی فعال و متحرک ہیں اور ہر سال بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں نیز اردو سمینار کے ذریعے اردو دانشوران کے افکار و خیالات کو بھی پروان چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی فکری و تقریری صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہو اور نئی نسل کے اندر جذبہ و ذوق بھی نشو و نما پائے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے جس کا ہر کوئی شیدائی ہے۔ اتنا ہی نہیں اردو کی تنزلی کے اصل اسباب کا انکشاف ہو اور ان کے ازالے کی راہ کس طرح ہموار کی جائے اس پر بھی وضاحت کے ساتھ روشنی پڑے۔ اس موقعے پر بھوجپور ضلع میں بحال سبھی اردو ملازمین نے اپنے فریضہ کو بخوبی انجام دیا۔ اخیر میں محترمہ اسماء خاتون کے اظہار تشکر سے پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 اگست 2025

فروغ اردو سمینار و مشاعرہ

موتیہاری: محکمہ کابینہ اردو سکریٹریٹ بہار اردو زبان سیل مشرقی چمپارن کے زیر اہتمام مہاتما گاندھی آڈیٹوریم موتیہاری میں فروغ اردو سمینار و مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔

اس موقعے سے خطاب کرتے ہوئے ضلع کمشنر میونسپل کارپوریشن موتیہاری سوربھ سومن یادو آئی ایس نے کہا کہ اردو نہایت خوبصورت اور میٹھی زبان ہے اور بھارت کی زبان ہے۔ اس کا تحفظ ہم سب کی ذمے داری ہے۔ پی جی آر او مشرقی چمپارن شیلیش بھارتی نے کہا کہ اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے اس کی شیرینی سے قلب و جگر کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ملک کی تاریخی زبان اور تاریخی وراثت کی امین ہے۔ رام جنم یادو ڈی پی آر او نے کہا کہ اردو روح میں اترنے والی بھاشا ہے۔ بھارتیہ سنیما کی ترویج و ترقی میں اردو زبان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرفراز نواز ضلع الیکشن آفیسر نے کہا کہ آج کی یہ تقریب اردو زبان کا صدقہ ہے۔ اردو کو تہہ دل سے اپنائیں اور اردو کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیں۔ قائد اردو شمیم احمد کولکاتہ نے کہا کہ اردو ہندوستان کی خالص زبان ہے۔ اردو زبان اسی سرزمین پر پیدا ہوئی اور یہ زبان نارائن و گاندھی جی اور منشی پریم چند کی زبان ہے۔ ناظم تقریب غلام ربانی مصباحی رکن اردو سیل نے کہا کہ اردو زبان ہند آریائی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ اس میں بھی روزگار کے مواقع بہت ہیں۔ اس لیے اس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیں۔ پروفیسر مشہور عالم اسسٹنٹ پروفیسر ایم ایس کالج موتیہاری نے کہا کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے جدید ٹکنالوجی کا استعمال کیا جائے اور اپنے کلاس روم کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً امیج و ویڈیوز کا استعمال ناگزیر ہے۔ مشتاق احمد برہانی نے کہا کہ ہمارے بچوں کو مکاتب سے ہی اردو زبان کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کی تعلیم پر ہم خصوصی توجہ دیں۔ اردو کی تعلیم و تدریس میں مکاتب کا اہم کردار ہے۔ ڈاکٹر ولی اللہ قادری پروفیسر چھپرہ انٹر کالج نے کہا کہ اردو زبان دل سے نکلتی ہے اور دل میں پیوست ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر شاہد رضا جمال صدر شعبۂ اردو مونگیر یونیورسٹی نے کہا کہ اردو اتحاد، اخوت و مساوات کی علمبردار ہے۔ اردو زبان کی تعلیم کو عام کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر فخرالدین علی احمد، ڈاکٹر جواد حسین، اردو زبان سیل کے انچارج افسر حیدر امام انصاری نے اظہار خیال کیا۔ قائد اردو شمیم احمد کی تصنیف 'ضلع اردو نامہ' کا اجرا بھی ہوا۔ اس موقعے سے منعقدہ مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر تفضیل احمد تفضیل نے فرمائی اور نظامت کے فرائض عزیز انجم نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 جولائی 2025

رینو کے شہر میں حقانی القاسمی

ارریہ: اردو کے نقاد و ادیب حقانی القاسمی کی ارریہ آمد پر ایک پروقار استقبالیہ تقریب و ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ یہ تقریب انجمن سوشیولٹریری سوسائٹی ارریہ کے زیر اہتمام روزنامہ 'سچ کی آواز' کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جمشید عادل علیگ کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی، جس میں

ارریہ کے ادبی و صحافتی حلقے کی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت معروف اردو افسانہ نگار پروفیسر رفیع حیدر انجم نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض معروف ادیب مولانا شاہد عادل قاسمی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ قابل ذکر ہے کہ ارریہ ضلع کے بگدھرا گاؤں میں پیدا ہونے والے حقانی القاسمی آج عالمی سطح پر اردو ادب کا ایک معتبر و توانا نام بن چکے ہیں۔ انجمن کی جانب سے انھیں گلدستہ اور شال پیش کر کے اعزاز و احترام پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر مقررین نے حقانی القاسمی کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریروں میں پھنیشور ناتھ رینو اور منشی پریم چند کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ دن دور نہیں جب ارریہ کی پہچان حقانی القاسمی کے نام سے بھی ہوگی۔ حقانی القاسمی نہایت سادگی پسند، نرم گفتار، کم گو اور سادہ زندگی گزارنے والے انسان ہیں، مگر ان کی تحریریں عالمی سطح پر ارریہ کا نام روشن کر رہی ہیں۔ حقانی نے اپنے خطاب میں کہا کہ پھنیشور ناتھ رینو صحیح معنوں میں ادب کی دنیا کا بڑا نام ہیں اور ہم سب لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہیں اور سیمانچل کی شناخت کا ایک مستحکم حوالہ بھی۔ حقانی القاسمی نے یہ بھی کہا کہ صاحبان جاہ و حشمت نہیں بلکہ فنکار کسی بھی شہر کی پہچان کا حوالہ ہوتے ہیں۔ لکھ پتی یا کروڑ پتی کی پہچان شہر کی سیما تک محدود رہتی ہے اور سرحد ختم ہوتے ہی ان کی پہچان ختم ہوجاتی ہے۔ اس موقعے پر روزنامہ 'سچ کی آواز' کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جمشید عادل علیگ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

حقانی القاسمی اردو کے ان نقاد اور ان کی تحریریں زندگی کی سچائیوں کو خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ رینو کے شہر میں اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے اور جلد ہی اس کا ہندی ترجمہ بھی قارئین کے لیے دستیاب ہوگا، جس سے ادب کا یہ سرمایہ زیادہ وسیع دائرے تک پہنچے گا۔ پروگرام میں جمشید عادل علیگ، رضی احمد تنہا، طارق بن ثاقب، ریحان علی راکیش، پرویز عالم، نیرالزماں، پروفیسر احسن عالم، فرمان علی فرمان، دیپک داس، فیروز عالم، قمر معصوم، شاہجہاں شاد، ارشد انورالف، اور عامر رضا سمیت متعدد ادبی شخصیات نے شرکت کی اور حقانی القاسمی کی علمی و ادبی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 24 جولائی 2025

ہریانہ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی یاد میں

نئی دھلی/ فرید آباد: کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے 33 ویں یوم وفات کے موقعے پر ای ایس آئی سی گورنمنٹ ہسپتال، فرید آباد کے آڈیٹوریم میں یوتھ آف یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک پروقار اور رنگا رنگ ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ نامور شخصیات نے شرکت کی اور کنور مہندر سنگھ بیدی کی ادبی، سماجی اور تہذیبی خدمات کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کے دوران بیدی سحر کے نواسے اور کنور مہندر سنگھ بیدی ادبی ٹرسٹ کے چیئرمین اشوجیت سنگھ نے ان کی آواز میں محفوظ کچھ منتخب غزلوں کی ریکارڈنگ پیش کی، جو حاضرین کے لیے ایک یادگار لمحہ ثابت ہوئی۔ اس موقعے پر گلوبل یونیورسٹی ناگالینڈ کے چانسلر اور اشوجیت سنگھ نے معروف شاعر اشوک ساہنی ساحل اور ٹی ایم لالانی ہی ایم ڈی انڈیکشن انسٹرومینٹس فرید آباد کو 'کنور مہندر سنگھ بیدی ادبی ایوارڈ' سے سرفراز کیا۔ یوتھ آف یونیورسٹی کے چیئرمین جیوتی سنگھ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بیدی صاحب ایک اعلیٰ ظرف انسان تھے، جن کا روحانی تعلق گرونانک دیو جی سے جڑتا ہے۔ وہ ہریانہ کے مختلف اضلاع میں سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ انھوں نے دہلی میں ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کو فروغ دیا، لال قلعے کے مشاعرے، کوی سمیلن اور کوی دربار جیسے پروگرام ان کے نقوش کی یاد دلاتے ہیں۔ معروف ادیب نارنگ ساقی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جیوتی سنگھ کے اشتراک سے ڈی اے وی کالج میں ایک کامیاب پروگرام منعقد کیا گیا تھا، اور اب ای ایس آئی سی ہسپتال کے آڈیٹوریم میں بھی ایک شاندار تقریب نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ تقریب میں ڈاکٹر عقیل احمد نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی زندگی، ان کی شاعری اور سماجی خدمات پر مفصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ بیدی صاحب کا در ہمیشہ خلق خدا کے لیے کھلا رہا، وہ ایک ایسے صاحب دل شخصیت تھے جنھوں نے دہلی کی ادبی فضا میں نئی روح پھونکی، جو آج بھی برقرار ہے۔ ادبی نشست میں معروف شاعر متین امروہوی نے بیدی سحر کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا، جب کہ تقریب کے آغاز میں نوجوان گلوکاروں نے بیدی صاحب کا کلام موسیقی کے ساتھ پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ تقریب میں ایوارڈ یافتگان اشوک ساہنی ساحل اور ٹی ایم لالانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی شخصیت اور خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کے اختتام پر جیوتی سنگھ نے تمام مہمانوں، شرکا، شعرا و ادبا، اور منتظمین کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر فرید آباد اور اطراف کے اردو ہندی ادیب، شاعر، صحافی اور علمی شخصیات بڑی تعداد میں موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جولائی 2025

اعزاز و اکرام

افضل منگلوری کو 'نشان اردو نیپال'

دیوبند: بین الاقوامی شاعر اور اتراکھنڈ اردو اکیڈمی کے سابق نائب چیئرمین پروفیسر افضل منگلوری کو

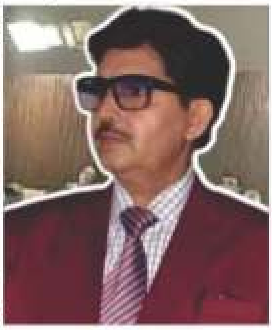

نیپال کی دارالحکومت کٹھمنڈو میں نیپال ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے 'نشانِ اردو نیپال' اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ پروفیسر منگلوری کے ساتھ ہی بھارت کے دو دیگر ادیبوں سپنا بنسل 'احساس' (چنڈی گڑھ) اور دہلی کے قلم سادھنا رسالے کے سرپرست اور ادب دوست مشرف علی خان کو 'نشانِ ہمالہ' اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ پچھلے اتوار کو ٹھنڈو میں عالمی اردو سیمینار اور مشاعرے میں یہ اعزازات نیپال کے نائب صدر کے نمائندے سردار روی سنگھ، نامور نیپالی فلم ڈائرکٹر پرکاش سیامی، ساہتیہ اکیڈمی نیپال کے چیئرمین ثاقب ہارونی، نیپالی پارلیمان کے رکن سراج فاروقی، رکن پارلیمان کلپنا میاں، نیپالی فلم گیت نگار کرن تھاپا، گلوکار بندرانا وغیرہ نے مشترکہ طور پر پیش کیے۔ اس پروگرام میں بھارت سمیت دبئی، ماریشس، لندن، امریکہ، پاکستان، سعودی عرب وغیرہ ممالک کے ادیبوں نے شرکت کی۔ افضل منگلوری کو اس سے قبل نیپال کے سابق وزیر اعظم پر چند کے ہاتھوں بھی دس سال قبل بھارت نیپال دوستی ایوارڈ مل چکا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 اگست 2025

رسم اجرا

نمی رقصم

نئی دھلی: پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند کے زیر اہتمام شائع ہونے والے معروف اردو ماہنامہ 'آجکل' کے دفتر (سی جی او بلڈنگ) میں ڈاکٹر ابرار رحمانی کا تازہ مجموعہ 'نمی رقصم'

کی رسم اجرا تقریب منعقد ہوئی۔ تقریب کی سرپرستی نرگس سلطانہ نے کی تھی۔ تقریب میں حسن ضیاء اور خورشید اکرم نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ ماہنامہ آجکل کے نو منتخب مدیر عبدالمنان، چیف ایڈیٹر محمد حامد حسین، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی اور ڈاکٹر خان رضوان بھی شریک ہوئے۔ تقریب میں تین کتابوں کی با قاعدہ رونمائی کی گئی، جن میں ڈاکٹر ابرار رحمانی کی کتاب 'نمی رقصم'، خورشید اکرم کی 'صفحے سے باہر' اور حسن ضیاء کی 'اردو صحافت اور ادب' شامل ہیں۔

شرکائے محفل نے اردو زبان کی ترویج، اردو رسائل کی بقا اور ماہنامہ آجکل کے خریداروں میں اضافہ کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے کہا کہ اردو قارئین کی تعداد میں اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ خورشید اکرم نے کہا کہ مدیر کی

ذمہ داری ہے کہ وہ نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کریں اور رسالے کے مشمولات میں تازگی لائیں۔ حسن ضیاء نے کہا کہ آجکل کی رسائی کافی وسیع ہے، اب ضرورت ہے کہ ذاتی سطح پر کوشش کرکے اس کے خریدار بڑھائے جائیں۔ موجودہ مدیر عبدالمنان نے کہا کہ میں آپ سب کے تعاون سے 'آجکل' کو نئی بلندیوں تک لے جانا چاہتا ہوں، یقیناً یہ میرے لیے خوشی کا موقع ہے کہ ہم آجکل کے ذریعہ سے اردو کی خدمات انجام دے سکیں اور اردو کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ ڈاکٹر خان رضوان نے کہا کہ یہ ملک کا واحد رسالہ ہے، جس کا معیار آج بھی برقرار ہے اور یہ نئے و پرانے قلم کاروں کو یکساں موقع فراہم کرتا ہے۔ نرگس سلطانہ نے اختتامی کلمات میں کہا کہ ہم ذاتی محنت سے 'آجکل' کے معیار کو نہ صرف برقرار رکھے ہوئے ہیں بلکہ اسے ایک ایسا سنگم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں نئے اور پرانے چراغ ساتھ ساتھ چل سکیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 اگست 2025

پکارتے ہیں راستے

لکھنؤ: سفرنامہ سماج کو دیکھنے کا ایک آئینہ ہے۔ ایک نوجوان قلمکار نے جو کچھ دیکھا ہے اسے بہت احتیاط

اور توجہ سے اسے قلمبند بھی کر دیا ہے۔ تقریب اجرا کے صدر اور طبی محقق حکیم وسیم احمد اعظمی نے ان خیالات کا اظہار آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی، لکھنؤ میں شمع فروزاں فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تازہ کار قلم کار سید محمود الرحمٰن حسینی (ایم ایم حسینی) کے سفرناموں کے مجموعے 'پکارتے ہیں راستے' کی رسم اجرا کی تقریب کے موقع پر کیا۔ اس موقع پر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شہپر رسول بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ جناب اویس سنبھلی مہمان اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ صاحب کتاب حمزہ حسینی نے اپنی کتاب کے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ تقریب اجرا کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دی۔ ابتدا میں قمرالزماں ندوی نے مہمانوں اور حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ پروگرام کے کنوینر جانی لکھنوی نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔ صدارتی خطاب میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے حکیم وسیم احمد اعظمی نے کہا کہ آج جو باتیں اس سفرنامے میں لکھی گئی ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں سے بہت سی باتیں تاریخ کا حصہ بن جائیں گی۔ مہمان خصوصی کے طور پر تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اردو میں سفرنامے کی ایک روشن روایت رہی ہے۔ خوشی ہے کہ ایک ابھرتے ہوئے قلمکار نے بھی ملک کے مختلف حصوں کے سفر کو لکھ کر ایک سفرنامہ مرتب کر ڈالا۔ میں ان کی اس پہلی کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مہمان اعزازی جناب اویس سنبھلی نے کتاب کے مختلف سفرناموں کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ بار بار کی دیکھی ہوئی چیزوں کو بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کشش پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سفر میں انسان کن کن مشکلات سے گزرتا ہے اور کن مواقع سے حظ اٹھاتا ہے اس کی تفصیلات اس سفر میں بدرجہ اتم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ڈاکٹر حمیرا عالیہ نے اپنے تبصراتی مضمون میں مصنف کی اس کاوش کو سراہا اور کہا کہ سفرنامے کا بیانیہ قابل ستائش ہے۔ انھوں نے سفرنامے کے بعض اقتباسات بطور دلیل پیش کیے۔ ڈاکٹر شاہد جمال نے سفرنامے کے جمالیاتی پہلو کو بطور خاص سراہا۔ اور کہا کہ لطف و کیف کے صرف مناظر ہی اس سفرنامے میں نہیں ہیں بلکہ زبان و بیان بھی پرلطف ہے۔ اسامہ طیب ندوی نے سفرنامے کے بعض جزوی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ قارئین کے لیے یہ کتاب خوش گوار احساس کی حامل کہی جاسکتی ہے۔ تقریب اجرا میں بڑی تعداد میں لکھنؤ کے صاحبان علم وفضل اساتذہ/ طلبا اور ریسرچ اسکالر موجود رہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 اگست 2025

ناتھ سمپر دایہ اور یوگا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے قومی نائب صدر اور قانون ساز کونسل کے رکن پروفیسر طارق منصور نے اپنی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک تقریب میں ڈاکٹر دیا سنگھ پنجابی کی تحریر کردہ کتاب 'ناتھ سمپر دایہ اور یوگا' کا اجرا کیا۔ یہ کتاب اتر پردیش پنجابی اکیڈمی، لکھنؤ (شعبۂ زبان، اتر پردیش حکومت) نے شائع کی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر طارق منصور نے کہا یہ کتاب ناتھ سمپر دایہ اور یوگا کے ثقافتی، روحانی ورثے کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ کتاب کا اردو اور دیوناگری رسم الخط میں ترجمہ کر کے زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچایا جائے۔ تقریب میں اے ایم یو کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر ٹی این ستیش نے کہا کہ سماج کو موجودہ دور میں ایسی کتابوں کی خاص ضرورت ہے، تاکہ نئی نسل ہندوستانی روایت اور یوگا کی گہرائی سے واقف ہوسکے۔ کتاب کے مصنف اے ایم یو کے شعبۂ جدید ہندوستانی زبانوں (پنجابی سیکشن) کے سابق طالب علم ڈاکٹر دیا سنگھ پنجابی ہیں۔ انھوں نے اتر پردیش پنجابی اکیڈمی سے اظہار تشکر کیا اور کہا کہ وہ اس طرح کے تحقیقی کام کو کتاب کی شکل میں پیش کرتے رہیں گے۔ صدر شعبہ پروفیسر کرانتی پال نے کہا کہ یہ فخر کی بات ہے کہ ڈاکٹر دیا سنگھ جیسے ہونہار طالب علم نے ناتھ فرقہ جیسے پیچیدہ موضوع پر سنجیدہ مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس موقعے پر پنجابی شعبہ کے محقق من پریت سنگھ ٹوانہ، رنکو اور سونیا بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جولائی 2025

وفیات

عبدالمجید خان مجید

بتیا: چمپارن کے معروف شاعر عبدالمجید خان مجید کا 3 جولائی بروز جمعرات کو طویل علالت کے بعد موتیہاری کے ایک ہسپتال میں انتقال ہوگیا تھا ان کی عمر تقریباً 76 برس تھی۔ دیر شام ان کا جسد خاکی بتیا شہر کے لیبرٹی

سنیما روڈ میں واقع ان کی رہائش گاہ پر لایا گیا اور بعد نماز جمعہ نیاٹولہ کے بڑی قبرستان میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین بھی اسی قبرستان میں عمل میں آئی۔ نماز جنازہ میں شعرا، ادبا سمیت علمی، سماجی و سیاسی شخصیات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ان کی پیدائش 12 دسمبر

1949 کو بتیا میں ہوئی اور 1947 میں اردو ہائی اسکول بتیا سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، منشی سنگھ کالج موتیہاری سے 1971 میں گریجویشن پاس کیا۔ 1975 سے اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم ہوئے اور مغربی چمپارن و گوپال گنج ضلع کی مختلف برانچوں میں منیجر کے عہدے پر رہتے ہوئے انھوں نے اپنی ذمے داریوں کو بخوبی نبھایا اور 2009 میں سبکدوش ہوئے۔ بتیا شہر کے شعرا و ادبا کے حلقے میں رہتے ہوئے انھوں نے اپنی زندگی کی چالیس بہاریں گزارنے کے بعد شعر گوئی کی طرف توجہ کی اور مشہور شاعر ایم ایم وفا سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'اک آگ سی سینے میں' (2004) میں شائع ہوا اور دوسرا اور آخری مجموعہ 'دست ہنر' (2018) میں شائع ہوا جس نے ان کی شاعری کو مزید مقبولیت عطا کی۔ وہ مشاعروں میں ترنم سے اپنا کلام پیش کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً ادبی نشستیں منعقد کرتے رہتے تھے۔ مرحوم آمنہ اردو ہائی اسکول اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ اس کے بعد سجاد پبلک اردو لائبریری کے بھی وہ صدر ہوئے اور انھی کے دور میں لائبریری کی نئی عمارت تیار ہوئی سماجی، علمی اور ثقافتی تنظیموں سے ان کا گہرا تعلق تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جولائی 2025

خراج عقیدت

'گئو دان' کے خالق منشی پریم چند

بھاگل پور: انجمن باغ و بہار، برہ پورہ، بھاگل پور کے زیر اہتمام جوش ایاغ کی صدارت میں نوشین جہاں کی رہائش گاہ پر پریم چند کے یوم پیدائش پر ایک ادبی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے پریم چند کے حیات و کارنامے کی روشنی میں کہا کہ اردو فکشن کے امام پریم چند بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، ناولٹ نگار، ڈراما نگار، انشائیہ نگار، تنقید نگار مترجم، مدیر تبصرہ نگار، ایک معلم اور ترقی پسند تحریک کے اجلاس کے پہلے صدر تھے۔ انھوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے اردو ادب کو جو دیا ہے، وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں دیہی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے، ان سے پہلے اردو فکشن شہری زندگی کا آئینہ بن گیا تھا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں محنت کش مزدوروں، کسانوں کے مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے ان کی دیہی زندگی، اخلاق و کردار، ساہوکاروں کی خود غرضی، عام انسانوں کی کمزوریاں، روزگار کی تلاش، نوجوانوں کا نئی نئی برائیوں میں مبتلا ہو جانا وغیرہ کو نئی اور پرانی تہذیبوں کے ٹکراؤ کو مختلف کرداروں و واقعات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا اصلی نام دھنپت رائے تھا اور قلمی نام پریم چند جو دیا نرائن نگم نے دیا تھا اور چچا نے نواب رائے پکارا۔ 31 جولائی 1880 کو مڑھوا کے لمہی گاؤں، بنارس میں پیدا ہوئے اور وفات اکتوبر 1936 کو۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک ماموں کا رومان ناولٹ لکھ کر کیا۔ انھوں نے اپنی افسانوی زندگی کا آغاز 'دنیا کا سب سے انمول رتن' لکھ کر کیا۔ اس موقع پر جوش ایاغ نے کہا کہ پریم چند کے افسانوں میں دیہاتی زندگی اور ماحول کی مکمل عکاسی ملتی ہے۔ ڈاکٹر حبیب مرشد خاں نے کہا کہ پریم چند کو انگریزی حکومت رائے بہادر کا خطاب دینا چاہتی تھی لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ محمد شاداب عالم نے کہا کہ پریم چند کی کہانیوں میں ہر طبقے کے مظلوموں کی داستان نظر آتی ہے۔ محمد سہیم الدین نے کہا کہ پریم چند کا پہلا ناول 'اسرار معابد' اور آخری ناول 'منگل سوتر' دونوں نامکمل رہے۔ نوشین جہاں نے کہا کہ پریم چند سے بڑا افسانہ نگار نہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اس موقعے پر محمد محبوب عالم نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 اگست 2025

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کار کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زر تعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail: magazines@ncpul.in

چنار بُک فیسٹیول کی تصویری جھلکیاں

उर्दू दुनिया, मासिक, सितम्बर–2025,वर्ष:27, अंक:09
URDU DUNIYA Monthly, September-2025, Vol.27, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/08/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6